قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2012، قیمت -/15

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

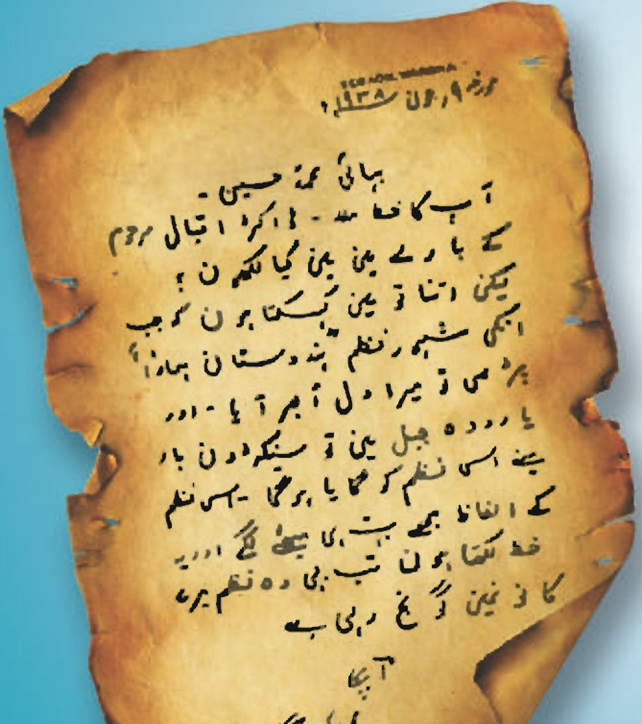
SEGAON, WARDHA
وردھا ۱۹ جون ۱۹۳۸ء

بھائی محمد حسین
آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم
کے بارے میں میں کیا لکھوں؟
لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب
ان کی مشہور نظم ہندوستاں ہمارا
پڑھی تو میرا دل بھر آیا۔ اور
یرودہ جیل میں تو سینکڑوں بار
میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم
کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ
خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے
کانوں میں گونج رہی ہے

آپکا
مو. ک. گاندھی

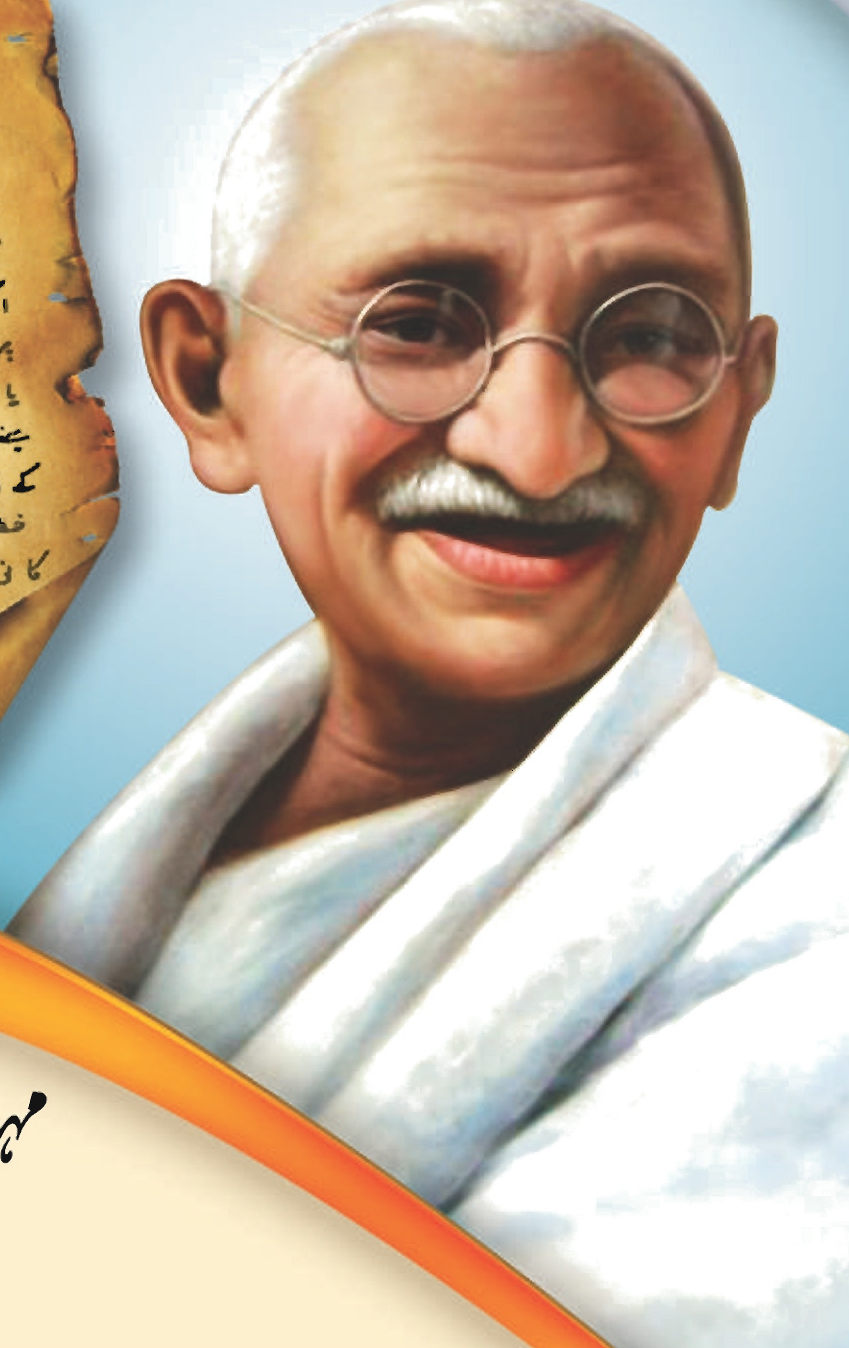

مہاتما گاندھی اور اردو

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNiYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 14، شمارہ: 10، اکتوبر 2012

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

قیمت -/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اداریہ
ہماری بات 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو
مجتبیٰ حسین — محمد ظفر الدین 6

زبان و تعلیم
قومی تعلیمی پالیسی اور افکار ٹیگور — محمد نعمان خان 10
مولانا ابوالکلام آزاد — دیوان حنان خان 12
فاصلاتی نظامِ تعلیم — عرفان عالم 14

کور اسٹوری
مہاتما گاندھی کے سوراجی تصورات — منی بھوشن کمار 17
اردو زبان اور ہندوستان کا دستور — محمد عبدالقدیر 21
گاندھی جی اور ہندوستانی — منتظر قائمی 24
پریم چند کی تخلیقات پر گاندھی جی کا اثر — عبدالرشید خاں 27

شخصیات
سرسید اور سیکولرازم — افتخار عالم خاں 30

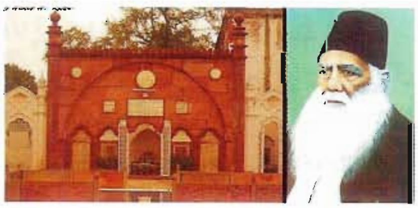

خراجِ عقیدت
اے کے ہنگل — عبدالحی 33

ادبی مباحث
فیض احمد فیض کی معنویت — منظر حسین 35
کیفی کی شاعری — نشاط فاطمہ 37
علامہ اقبال اور رومانیت — ابرار احمد اجراوی 39
کنہیا لال کپور — امرتا پانڈے 42

ہم نے جنھیں بھلا دیا
اتکل منی گوپ بندھو داس — محمد مطیع اللہ ناز ش 44

مشاہیر ادب/نظم
شاد عارفی — مظفر حنفی 46
انتخاب کلام — شاد عارفی 48

مشاہیر ادب/نثر
اختر اور ینوی — افصح ظفر 51
ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے — اختر اور ینوی 52

ہماری مطبوعات
الفاظ کیونکر پیدا ہوئے؟ — محمد حسین آزاد 55

دوسری زبانوں سے
باولا (مراٹھی کہانی) — جی اے کلکرنی
ترجمہ: سلام بن رزاق 59

میڈیا
آن لائن اردو صحافت — سلمان فیصل 61

فلم
ہندوستانی سنیما اور اردو — عزیز احمد 63

کیریئر گائڈ
یو جی سی نیٹ کی تیاری کیسے کریں — محمد بہلول 66

سائنس و ٹیکنالوجی
اردو سافٹ ویئر کا تیس سالہ سفر — مظہر حسنین 71

صحت
ذیابیطس — ایک مہلک مرض — ایس ایس رضا 74

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 76

ٹیلی ایڈیشن
اردو دنیا ٹی وی — ادارہ 82
عالمی اردو نامہ — ادارہ 83

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 84

ہماری بات

آئنسٹائن نے گاندھی جی کے بارے میں کہا تھا: آنے والی نسلوں کو بڑی مشکل سے یقین آئے گا کہ گوشت پوست سے بنا ایک ایسا بھی انسان کبھی اس زمین پر چلا پھرا تھا۔ آج اتنے برس بعد گاندھی جی کی شخصیت واقعی ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ سادگی ایسی کہ زندگی کا بیش تر حصہ ایسے لباس میں گزار دیا، جس سے تن کو پوری طرح ڈھانپنا مشکل ہے۔ بولتے تھے اتنے دھیمے لہجے میں کہ بہترین خطیبوں میں کبھی ان کا شمار نہیں کیا گیا۔ صورت شکل، قد کاٹھی ایسی کہ دیکھنے میں عام آدمی سے بھی زیادہ عام لگتے تھے۔ تقریر کی مانند تحریر بھی کسی طرح کے گھماؤ پھراؤ، لفاظی یا ڈرامہ پن سے پاک۔ یعنی کوئی ایسا ظاہری وصف ان کی شخصیت میں نہیں تھا، جسے آج کے دور میں ہر بڑے سیاست داں، دانش ور، سماجی رہنما، یا روحانی پیشوا کی ذات میں ڈھونڈا جاتا ہے، اور جس کے بغیر کوئی شخص ایک بڑی شخصیت اِس دور میں بن ہی نہیں سکتا۔

لیکن ان تمام ظاہری اوصاف کی عدم موجودگی میں نہایت غیر اہم اور مجہول سے نظر آنے والے اس شخص کو آج عظمتیں سلام کرتی ہیں۔ حق پرستی اور عدم تشدد کی روش نے انھیں ان کی زندگی میں ہی مشرق کی سب سے عظیم شخصیت بنا دیا تھا۔ آج ان کی ذات اور ان کی فکر تمام دنیا کے اجتماعی شعور کا حصہ بن چکی ہے۔ آج کی دنیا ان کے فلسفے اور ان کی فکر کو طرح طرح کے مسئلوں، الجھنوں اور بے چینیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی اور امید کی آخری کرن کے طور پر دیکھنے لگی ہے، اور تجربے بتا رہے ہیں کہ وہ حق پرستی انسانی مسرتوں کا اصل سرچشمہ اور وہ عدم تشدد انسانیت کی نفی کرنے والی ہر تباہ کن طاقت کے مقابلے میں سب سے موثر اور پرقوت شریفانہ ہتھیار ہے، جس کی تبلیغ گاندھی جی نے زندگی بھر کی اور جس کی خاطر آخر کار وہ ایک منحوس نظریے کے وحشی پیروکار کی گولی کا نشانہ بھی بنے۔

ہماری اردو زبان کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ گاندھی جی کو یہ زبان دیگر ہندوستانی زبانوں سے کچھ زیادہ ہی عزیز تھی۔ اتنی کہ انھوں نے ذاتی کوشش سے نہ صرف اردو پڑھنا لکھنا سیکھا بلکہ اس کی مشق بھی کرتے رہے۔ اردو سے اِس محبت کا ثبوت ان کے وہ سیکڑوں اردو میں لکھے ہوئے خط ہیں جو آج بھی مختلف گاندھی میوزیموں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان میں زیادہ تر خط وہ ہیں جو انہوں نے اپنے رفیقوں سے اردو میں لکھوائے تھے اور اپنے قلم سے ان پر اردو میں صرف دستخط کیے تھے، لیکن ایسے خط بھی خاصی تعداد میں ہیں جو پورے کے پورے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ گاندھی جی، صرف اردو کو آزاد ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ ایک ایسی اردو کو جو فارسی و عربی سے زیادہ بندھی ہوئی نہ ہو اور ایک ایسی ہندی کو جو سنسکرت کی بجائے عام بول چال سے ہم آہنگی رکھتی ہو، آپس میں ملا کر اسے 'ہندوستانی' یا کوئی اور نام دینے اور اسے اردو اور ہندی دونوں کے رسم خط میں قومی زبان کے طور پر رائج کرنے کے حق میں تھے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس نظریے کو عمل میں لانا اس وقت کی پرنٹنگ ٹیکنالوجی کے مدِ نظر خاصا دشوار کام تھا، یہاں تک کہ بعض کوتاہ اندیش دانش ور اسے یوٹوپیائی فکر بھی قرار دینے لگے تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ گاندھی جی اردو کے رسم خط کو اپنی مجوزہ زبان کے ساتھ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

گاندھی جی کوئی زبردست قسم کے ماہر لسانیات نہیں تھے۔ اُن کی نظر اُن سیاسی، سماجی، فکری اور جذباتی پہلوؤں پر زیادہ تھی جو دو قومی نظریے کا بائی پروڈکٹ بن کر سامنے آرہے تھے۔ اس کے باوجود اردو اور ہندی کو قریب لانے کی جو بات انھوں نے ستّر اسّی برس پہلے سوچی تھی، وہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ آج ایک حقیقت بنتی جارہی ہے۔ سرکاری طور پر نہ سہی لیکن عام بول چال، اور ملک گیر عوامی ترسیل کی سطحوں پر دونوں زبانوں کے اختلاط سے ایک نیا قومی لہجہ اور ڈکشن تشکیل پارہا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا، بازار کی طاقت اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے ایک طرف دونوں زبانوں کے ظاہری فرق کو کم کیا ہے تو دوسری طرف اُن کے، خاص طور پر اردو کے اپنے طور پر فروغ پانے کی نئی راہیں بھی استوار کی ہیں۔

'ہندوستانی' زبان کے نام سے گاندھی جی نے جو نظریہ پیش کیا تھا، اسے آج کے ہندوستان میں 'بین لسانی بقائے باہم' کے محرک کے طور پر اپنایا جاسکتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ، اردو کو ملک کے مختلف حصوں کی علاقائی زبانوں اور بولیوں کے ساتھ ہم رشتہ کیا جائے۔ دکنی، اودھی، پنجابی، ہریانوی، راجستھانی جیسی علاقائی اور مقامی بولیوں سے اردو کا رشتہ قائم کیا جائے اور ان بولیوں کی تخلیقات کو اردو کے رسائل و جرائد میں جگہ دے کر اس نقصانِ عظیم کو پُر کرنے کی کوشش کی جائے جو کبیر، سورداس، میرابائی، رحیم، رس کھان اور جائسی جیسے ادیبوں کو اردو سے باہر رکھ کر ہمارا اردو سماج پہلے ہی اس زبان کو پہنچا چکا ہے۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ علاقائی زبانوں اور مقامی بولیوں میں تخلیقی ادب کی حوصلہ افزائی کی جائے، ان کے تخلیق کاروں کو اردو کی محفلوں اور سیمینار وغیرہ میں بلایا جائے کہ اردو سماج کا یہ رویّہ خود اردو کی وسعت و فروغ کا ایک موثر طریقہ بن سکتا ہے اور یہی گاندھی جی کو ہم اردو والوں کا سب سے اچھا خراج عقیدت ہوگا جو تمام ہندوستانی زبانوں کی بقائے باہم اور اشتراک میں یقین رکھتے تھے!

خطوط

آپ کی بات

علی احمد فاطمی
یونیورسٹی آف الہ آباد، الہ آباد (یوپی)

’اردو دنیا‘ اگست 2012 کا شمارہ نظروں کے سامنے ہے۔ ظاہری خوبصورتی، گٹ اَپ اور چمک دمک متاثر کرتی ہے لیکن اندر کا مواد اور مشمولات بھی لائق مطالعہ ہیں۔ رنگا رنگ ہیں کہ ہر قاری اپنی پسند کے مطابق پڑھ سکتا ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے ورنہ اردو کے زیادہ تر رسالے یا تو بے حد غیر معیاری ہیں یا بعض اس قدر معیاری کہ عام قاری کی رسائی ممکن نہیں۔ اس اعتبار سے اردو دنیا ہمارے عام اردو قارئین کے لیے کشش کا مقام رکھتا ہے۔ آپ نے موجودہ عہد کے نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کے انٹرویوز شائع کرنے کا جو فیصلہ لیا ہے وہ بے حد اہم ہے۔ اس شمارے میں وسیم بریلوی کا انٹرویو پڑھا۔ عنوان نے ہی متوجہ کیا۔ ’اردو تنقید نے ادب کے عوامی رشتے پر توجہ نہیں دی۔‘ ایک نظر میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وسیم بریلوی زیادہ تر مشاعرے پڑھتے ہیں اور مشاعرہ ایک عوامی پلیٹ فارم ہے اس لیے وہ اس کی دفاع یا اپنی دفاع میں باتیں کر رہے ہیں ہوسکتا ہے یہ سچ ہو لیکن ایک اور سچائی جو عرصہ سے کام کر رہی ہے وہ اس سچائی سے اپنا رشتہ جوڑ لیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو شعر و ادب پر عرصہ سے فیوڈل نظام کا قبضہ رہا ہے۔ امرا، روسا کا قبضہ رہا ہے۔ ممتاز ترقی پسند ناقد احتشام حسین نے نظیر اکبرآبادی جیسے عوامی شاعر پر لکھتے ہوئے کہا تھا کہ ’’اردو شاعری کی اس معیار پرستی سے جہاں کچھ فائدے ہوئے ہیں اچھے خاصے نقصان بھی ہوئے ہیں۔‘‘ اور یہ سچ ہے اور یہ نقصان آج بھی جاری ہے جس کی طرف وسیم بریلوی نے عمدہ اشارے کیے ہیں۔ ایک جگہ صاف طور پر کہا ہے ’’ادبی تنقید عوامی مقبولیت کو کبھی قبول نہیں کرتی۔‘‘ ’’خود نقاد کو وہ عوامی مقبولیت کبھی حاصل نہیں ہوتی جو مشاعرے کے ایک چھوٹے سے شاعر کو مل جاتی ہے۔‘‘ ان باتوں سے اختلاف ہوسکتا ہے اور بحث بھی ہوسکتی ہے لیکن وسیم صاحب کا جو درد ہے اور جو میرا بھی درد ہے اور احتشام صاحب کا بھی تھا کہ ہم نے اور ہماری معیار پرست تنقید نے اردو ادب کے اُن حصوں کو شعوری طور پر نظر انداز کیا جو ہمارا قیمتی سرمایہ تھے۔ ہم نے عوامی ادب، احتجاجی ادب، رزمیہ ادب پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور ایک بڑے قیمتی سرمایے کو احاطۂ ادب یا سرمایۂ ادب سے نکال دیا کہ جس کی بنیاد پر پریم چند کے بیٹے امرت رائے اس فلسفہ پر پوری کتاب لکھ

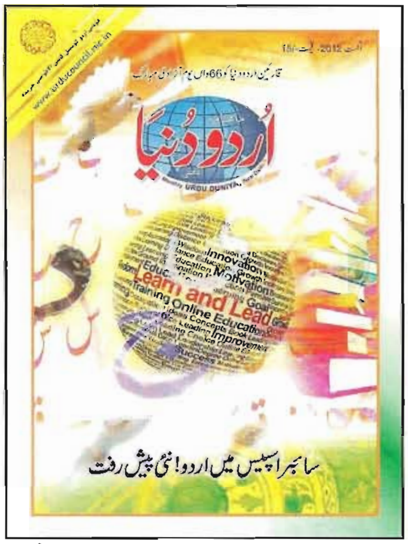

دی کہ جس زبان و ادب کا عوامی ادب (Folk lit) نہیں ہوتا وہ زبان اوریجنل نہیں ہوتی۔ چنانچہ اردو اوریجنل زبان نہیں ہے حالانکہ امرت رائے سے اختلاف کیا گیا اور ان کے بیٹے نے ہی ان کے خیال کے خلاف کتاب لکھ دی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بقول وسیم بریلوی ’’میر، کبیر اور نظیر کی شاعری نے کسی نقاد کی بدولت ادب عالیہ میں جگہ نہیں بنائی ہے یہ عوامی مقبولیت ہے جس نے انھیں عظمت کے تاج پہنائے ہیں۔‘‘ وسیم صاحب تنقید سے اتنا خفا نہیں ہیں جتنے کہ نقاد سے اور ان کی خفگی درست ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ وسیم بریلوی کے خیالات کو بغور ملاحظہ کریں وہ کونسل کے وائس چیئرمین بھی ہیں۔ وہ اور آپ مل کر ایک کمیٹی بنایئے اور عوامی ادب و احتجاجی جیسے بے حد اہم موضوعات کو بحث میں لایئے۔ منصوبہ بنایئے اور اس پر کام کروایئے۔ دیکھیے ایک زمانے میں علی سردار جعفری، اظہر علی فاروقی وغیرہ نے کام کیا تھا اور وہ کام بہت پسند بھی کیا گیا تھا۔ اس کام کو آگے بڑھانا چاہیے۔ ہم اگر اپنے زمینی، ثقافتی اور عوامی ادب کو نظر انداز کر کے چلیں گے تو کہیں کے نہ رہ پائیں گے۔ کسی نے سچ کہا ہے ’جو یہاں کا ہے اگر وہیں کا نہیں ہے تو پھر کہیں کا نہیں ہے۔‘‘ ایک ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے میں اس کام کے لیے ہر طرح تعاون دینے کے لیے تیار ہوں۔

پروفیسر احمد سجاد
سابق ڈین، فیکلٹی آف ہومنٹیز، رانچی یونیورسٹی، رانچی، جھارکھنڈ

اس وقت ’اردو دنیا‘ شمارہ اگست 2012 پیش نظر ہے۔ جو قدرے تاخیر سے ملا مگر جیسے ہی ملا سچ پوچھیے تو ایک ہی سانس میں پورے شمارے کو پڑھنا پڑا۔ یہ رسالہ فی الواقع اسم بامسمیٰ ہو چکا ہے۔ محض دو ماہ کی قلیل مدت میں آپ کونسل کی ویب سائٹ کو معیاری اور ڈیجیٹل لائبریری کے علاوہ آن لائن اردو لرننگ کورس، نیز ڈیجیٹل کمپیوٹر لرننگ پروگرام جس طرح بروئے عمل لائے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ مائکرو سافٹ کے تعاون سے اسے مزید معیاری بنانے اور یونی کوڈ کے نافذ ہونے سے ان سب میں مزید جلا پیدا ہوگی۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے آپ نے اردو والوں کو جڑنے کی جو ’گذارش‘ کی ہے وہ نہایت ضروری ہے۔ اس ضمن میں ’آن لان میڈیا کا تصور اور اردو‘ آپ کا نہایت قیمتی مقالہ ہے۔ اسی طرح راغب اختر صاحب نے ’اردو ڈیجیٹل لائبریری ...‘ پر جو مضمون قلمبند کیا ہے وہ بھی قابل تحسین ہے اس طرح کے مضامین کا سلسلہ جاری رکھے بغیر اردو کے در پر ’سائبر انقلاب کی دستک‘ کے اَن سنی ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مقالہ نگاروں کے پتہ کے ساتھ موبائل نمبر اور ان کے ای میل کے پتے لکھنے کی بھی فرمائش کی جائے۔ راغب صاحب کی طرح آپ سے بھی عرض ہے کہ کسی اردو لائبریری کو اردو زبان میں ڈیجیٹلائز کرنے کا اگر کوئی سافٹ ویئر تیار ہو چکا ہو تو مرکز ادب و سائنس کے ٹسٹیز اسے حاصل کرنے کے بے حد خواہش مند ہیں۔ ’اردو ذریعہ تعلیم اور روزگار‘ ہاجرہ بانو کا ایک قیمتی مضمون ہے جس میں انھوں نے اگلے چار برسوں میں 12 لاکھ اساتذہ کی بحالی کا مژدہ سنایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں اردو اساتذہ کی تعداد کیا ہوگی؟ وسیم بریلوی کا انٹرویو، روایتی قسم کے انٹرویو سے بہت مختلف ہے۔ انھوں نے شاعری، مشاعرہ، زبان و ادب اور تنقید و تحقیق

کے ذیل میں اپنے مثبت اندازِ نظر کی وجہ سے خدا لگتی اور عملی باتیں پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ نواب واجد علی شاہ کی ادبی وثقافتی خدمات کے ساتھ انگریزوں سے سلطنت واپس ملنے کی توقع بڑی عبرت انگیز ہے۔ صرف ایک صفحہ میں ن م راشد جیسے مجتہدانہ طرزِ فکر و نظر کے شاعر کا معروضی مطالعہ ناکافی ہے۔ کور اسٹوری کے تینوں قیمتی مضامین کے بعد عبیدالرحمٰن صاحب کا سائنسی مقالہ 'اب کھل رہے ہیں تخلیق کائنات کے راز'، 'ہگس بوسن'، اور 'اینی میشن کی جادوئی دنیا' (بانو سرتاج) جیسے سائنسی وتکنیکی مضامین کی اردو میں بے حد کمی پائی جاتی ہے، اس طرح لکھنے والوں کی بطور خاص قدر افزائی کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف صاحب نے آہ! وہاب اشرفی ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے' میں محبی ڈاکٹر وہاب اشرفی صاحب مرحوم پر بڑے جامع انداز میں بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعض نامساعد حالات کے باوجود ڈاکٹر وہاب اشرفی مرحوم نے اردو تحقیق وتنقید کو جتنا کچھ دے دیا ہے اس کی نظیر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ سعید رحمانی صاحب نے 'اڑیسہ میں اردو' کے ذریعے وہاں کی حقیقی صورتِ حال کو پیش کیا ہے البتہ محسنین اردو کا نام لینے میں انھوں نے بڑی کفایت شعاری سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر کرامت علی کرامت اور ڈاکٹر حفیظ نولپوری وغیرہم کا تذکرہ بھی ضرور کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال اردو کے لیے آپ کی دیدہ وری اور دیدہ ریزی سے پوری توقع ہے کہ یہ رسالہ واقعتاً وقت کے ساتھ آپ کی ادارت میں مزید بلندیاں حاصل کرے گا۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

حسن طباعت و کتابت سے مزین 'اردو دنیا' کا اگست 2012 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ حسب معمول یہ شمارہ بھی حسب ذیل گراں قدر اور محققانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ آن لائن کا تصور، اردو کی ڈیجیٹل آن لائن، (خراجِ عقیدت) وہاب اشرفی، (شخصیت) معین احسن جذبی کی یاد میں، گل بکاؤلی کی حقیقت، مولانا آزاد کی صحافت، فکر تونسوی، (شہرہین کے تحت) گوالیار، نواب واجد علی شاہ۔

علیم صبا نویدی
26-34، امیر النسا بیگم اسٹریٹ، چینئی 600002

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ ملا شکریہ! آپ کی کرامت یہ ہے کہ آپ نے 'اردو دنیا' میں اردو کے شعر وادب کے جزیروں کو روشن کردیا ہے۔ کتاب 'اڑیسہ میں اردو' مصنف ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری (کٹک) ترقی اردو بیورو نے غالباً 1998 میں چھاپی تھی۔ زیر نظر شمارے میں اسی عنوان کے تحت حضرت سعید رحمانی صاحب کا مضمون جگہ پایا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ کے بعد شدید تشنگی کا احساس ہوا۔ اردو شعر وادب کے تعلق سے ذہن میں جب بھی روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں تو فوراً کرامت علی کرامت اور خالد رحیم، شکیل دسنوی کے نام اڑیسہ کی آبرو بن کر اجاگر ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں سعید رحمانی صاحب نے کرامت اور خالد کا نام تک لینا پسند نہیں کیا۔ بہر کیف 'اضافی تنقید' سے کرامت صاحب اقلیم ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ مضمون گوالیار... ایک تعارف' سے وہاں کی تاریخی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کی تصویریں دیکھنے کو ملیں۔ وہاں کی مقبول عمارتوں کے چہرے بھی آپ نے ہمارے سامنے رکھ دیے۔ وہاں کے اردو بولنے والوں اور اردو کے بہی خواہوں اور خیر خواہوں کے ساتھ ساتھ اردو کی موجودہ صورت حال سے بھی آگاہی ہوئی۔ اردو کے تعلق سے قومی کونسل کی لامتناہی محنتوں کا بھی اندازہ ہوا۔

ڈاکٹر جاویدہ حبیب
310 بھاراتھی ڈاسن روڈ، ایس آئی ای ٹیناMPٹ، چینئی

زیر نظر شمارے میں وسیم بریلوی پر آپ کا ایک انٹرویو بہت جاندار اور وقیع ہے۔ عظیم اقبال نے 'ہمارا قومی پرچم' کا مختصر سا تاریخی جائزہ لیا ہے جو یقیناً معلوماتی ہے لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ ہمارے 'بھارت کا قومی ترانہ' بعید از فہم ہے۔ ایسا کیوں؟ جب کہ ہندی اور اردو زبان ہندوستان کے سر پر سایہ افگن ہے۔ یہ دونوں زبانوں کے بغیر ہندوستان کا کوئی بھی انسان سانس نہیں لے سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا ہر فرد ہندوستانی ہے۔ نہ کوئی ہندو نہ مسلم نہ سکھ نہ عیسائی۔ ہم سب روزِ آخر تک ایک اٹوٹ اور اَن مٹ بندھن میں بندھے ہندوستانی ہی رہیں گے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے ڈاکٹر وہاب اشرفی کی ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ موصوف نے بہار کے علمی اور ادبی آسمان کو نئی روشنی سے منور کیا ہے۔ ان کی رحلت سے علمی اور تہذیبی سمتیں خزاں زدہ ہوگئی ہیں۔ شاد عظیم آبادی، سہیل عظیم آبادی اور کلیم الدین احمد نے اردو ادب میں جو تاریخی نقوش چھوڑے تھے ان نقوش کو مزید تقویت مرحوم وہاب اشرفی نے بخشی ہے۔ وہاب اشرفی کے بعد ڈاکٹر شکیل الرحمٰن سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں لیکن یہ بات تو یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہاب اشرفی کی فکری وسعتیں اور جہتیں نورانی ہیں... معین الدین جذبی والا مضمون بھی پسند آیا۔ مضمون 'اڑیسہ میں اردو' میں تشنگی کا احساس ہوا۔ حبیب احمد نے بھی مولانا آزاد کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ الہلال کی اشاعتی مدت دوسرے اخباروں کی بہ نسبت قلیل رہی لیکن ناقابلِ فراموش ضرور ہے۔ بہ حیثیت مجموعی 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

محمد زاہد
بی 5، گارڈن ریچ، کلکتہ 24

اگست 2012 کا شمارہ نظر سے گزرا۔ آپ کی ادارت میں پہلے سے بہتر ہوگیا ہے۔ مشمولات معیاری ہیں۔ ہمایوں اشرف، سعید رحمانی، انور ادیب، بانو سرتاج، سی ایم خان، عبیدالرحمٰن وغیرہ کے مضامین پسند آئے۔ کور اسٹوری بہت خوب ہے۔ اس رسالے کو اکیسویں صدی کا نقیب اردو بنایئے۔ روایتی ادبی مباحثوں اور مضامین وشاعری سے گریز کریں۔ ماتم اور گریہ وزاری کے بجائے ہمت، حوصلہ اور بلند نظر کی ضرورت ہے۔ سائنس وکامرس کی درسی کتابیں، مقابلہ جاتی امتحانوں کے لیے کتابوں کی تیاری، ادبی کتابوں کی اشاعت کے لیے کل ہند پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے ادارے کے ذریعے اس میں تعاون کرسکتے ہیں۔ مختلف صوبوں میں موجود اردو اداروں کے ساتھ ایک پلیٹ فارم بناسکتے ہیں۔ اچھے مضامین اور پرمغز تحریریں شائع کریں۔

عبدالغنی شیخ
یاسمین، فورٹ روڈ لیہہ، لداخ

'اردو دنیا' کا ہر شمارہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے۔ میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا ہوں۔ فیروز احمد بخت کا ادارہ 'شمع' کے بارے میں مضمون پڑھ کر ادارے سے متعلق میری کئی یادیں تازہ ہوئیں۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ جناب یونس دہلوی حیات ہیں۔ جب سے شمع بند ہوا تب سے ان سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ مجھے ہمیشہ یہ تجسس رہا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ میں جب بھی دہلی آتا تو آصف علی روڈ پر واقع ان کے دفتر جاتا اور یونس صاحب، ان کے برادران ادریس دہلوی، الیاس دہلوی اور بانو کی مدیرہ اور یونس صاحب کی صاحبزادی سعدیہ دہلوی سے ملاقات ہوتی تھی۔ دفتر کے بڑے ہال میں سارے ارکان موجود ہوتے تھے۔ سعدیہ ہال کے ایک کونے میں ایک کیبن میں رہتی تھیں۔ یونس صاحب بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ادارہ 'شمع' میں بڑی خوبیاں تھیں جواب عنقا ہیں۔ کہانی موصول ہوتے ہی وہ

اس کی رسید سے آگاہ کرتا تھا اور ساتھ ہی لکھتا تھا کہ اس کی اشاعت اور عدم اشاعت سے متعلق اطلاع دے گا۔ 'شمع' کی مقبولیت کا کچھ کچھ اندازہ اس کی بلاعنوان چھپنے والی کہانیوں سے ہوتا تھا۔ ہزاروں قارئین مدیر کی فرمائش کو لبیک کہتے ہوئے اس کے عنوانات بھیجتے تھے۔ ان میں اکثر سینکڑوں عنوانات کہانی کار کے عنوان سے ملتے تھے۔ میری کئی کہانیاں بلاعنوان چھپی ہیں۔ ادارہ 'شمع' اور کئی رسائل جیسے 'بانو'، 'شبستان'، 'مجرم'، 'کھلونا' اور ایک ہفت روزہ 'آئینہ' بھی نکالتا تھا۔ فیروز بخت نے 'آئینہ' کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جو صوری اور معنوی لحاظ سے بڑا عمدہ جریدا تھا۔ یہ غالباً سب سے پہلے بند ہوا۔ 'شمع' جیسے ادارے کا معروض وجود میں آنا اب ایک موہوم خواب لگتا ہے۔ جس کے سرپرستوں نے اردو کا نام روشن کیا ہے۔

الحاج حیدر حسین

شیخ وظیفہ یاب مدرس حنا منزل سداشیو گڑھ

رسالہ بروقت مل رہا ہے۔ ماہ ستمبر 2012 کا انتظار ہے۔ رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے جس کے لیے ادارہ کے تمام اراکین، متعلقین، مضامین نگاروں کی خدمت میں مبارک باد قبول فرمائیں۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا 480001 (مدھیہ پردیش)

اگست 2012 کا شمارہ ملا۔ وسیم بریلوی صاحب سے نصرت ظہیر کی گفتگو دلچسپ لگی۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں ایک مکمل تہذیب ہے۔ صوفی سنتوں کی گود میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' نے ٹیلی ویژن کے ذریعے ملک بھر میں اردو بیداری کی مہم شروع کی ہے، جس کی وجہ سے عوام اردو کی کئی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں سے روشناس ہو رہے ہیں۔ وہاب اشرفی نے زندگی کے آخری لمحے تک علم اور ادب سے رشتہ برقرار رکھا۔ انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر کتابیں لکھیں جن پر اس کے پہلے اردو میں کسی نے نہیں لکھا۔ بیسویں صدی کے نثری مزاح نگاروں میں 'فکر تونسوی' ایک مقبول کالم نگار تھے۔ روزنامہ 'ملاپ' میں 'پیاز کے چھلکے' کالم قارئین کی پہلی پسند ہوا کرتا تھا۔ روزمرہ کی سماجی اور سیاسی زندگی میں آتی ہوئی تبدیلیوں کو آئینہ دکھانے والے اس کالم کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے۔ ادارہ 'شمع' کے زمانے کو اردو کا ایک سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔ وقت سے پہلے اس چراغ کے بجھ جانے کا افسوس سبھی کو ہے۔ اس کے بند ہو جانے سے اردو ادب کو جو نقصان ہوا ہے اس کی بھرپائی ممکن نہیں۔

محمد عبدالعزیز سہیل

4-2-75 لئیق بازار، نظام آباد، (آندھرا پردیش)

'اردو دنیا' اگست 2012 کا شمارہ توقع کے مطابق یکم اگست کو ہی وصول ہوا۔ بے حد مسرت ہوئی کہ یہ واحد رسالہ ہے جو وقت مقررہ پر قارئین کو مل جاتا ہے۔ کئی ایسے رسالے ہیں جو 10,15 تاریخ کے بعد ہی ملتے ہیں۔ سرورق الحمدللہ جدید ٹکنالوجی اور اردو کے موقف کو ظاہر کرتا ہے۔ مدیر 'اردو دنیا' کا اداریہ 'ہماری بات' میں اس نکتہ نظر کا اظہار کیا گیا ہے کہ انٹرنیٹ پر اردو زبان و ادب کا بہت سارا مواد موجود ہے لیکن اردو والے ان کا استعمال نہیں کرتے اور اردو زبان وادب سے وابستہ افراد زیادہ تر کمپیوٹر کے استعمال سے واقف نہیں۔ بہت درست ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے انٹرنیٹ کا بھرپور استعمال کریں۔ محترم وسیم بریلوی سے نصرت ظہیر صاحب کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ ساتھ ہی راغب اختر صاحب کے مضمون اردو ڈجیٹل لائبریری اور آن لائن کورس کے متعلق بھی معلومات حاصل ہوئیں۔ لالہ رخ کی داستان سے بھی واقفیت ہوئی اور مولانا آزاد کی صحافت پر حبیب احمد کا مضمون بھی پسند آیا۔ اس شمارے کے مشمولات کا انتخاب بہت خوب ہے۔ اس رسالے کے ذریعے اعلیٰ تعلیمی ذرائع اور سول سروسیز سے متعلق بھی شعور اجاگر کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ساتھ ہی ایک گوشہ نوآموز قلمکار کے لیے بھی مختص کیا جائے تو بہت مفید ہوگا۔ ویسے اردو دنیا کا ہر تازہ شمارہ اپنی ترتیب و تدوین اور مشمولات کے اعتبار سے بہت خوب اور قابل تعریف ہے۔ آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کو سلام!

محمد یوسف گنائی، نیرنگ

352 بوگنڈ کوگھام، کشمیر

اب جب کہ اردو کے کئی جریدے اور رسالے دم توڑ رہے ہیں ماہنامہ 'اردو دنیا' کو دیکھ کر اُمید کی ایک چھوٹی سی کرن نظر آتی ہے اور لگتا ہے کہ اردو ختم ہونے والی زبان نہیں ہے بلکہ بھارت میں جو اس کی جنم بھومی ہے مشکلات کے باوجود یہ نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ تابندہ بھی۔ اس سلسلے میں 'اردو دنیا' میں جس طرح کے مضامین چھپتے ہیں وہ کافی حد تک اردو کو جدید تقاضوں سے عہد برآ ہونے کے لیے تیار کرتے ہیں اور اس زبان کو مردہ روایات سے آزاد کرانے میں بھی اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت جون کا شمارہ ہے اس میں تعلیم سے متعلق تین مضامین 'ہندوستان عالمی طاقت بننے کی راہ پر'، 'بچوں کی تعلیم جدید نفسیات'، 'سائنس اور سماج کے تحت 'ڈجیٹل ڈیوائڈ' اور 'اپنی ویب سائٹ کیسے بنائیں' وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو ہماری نئی نسل اور طلبا کے لیے کارآمد بھی ہیں اور ان میں جدید حسیت پیدا کرنے کے لیے مددگار بھی۔ اردو میں سینکڑوں ایسے رسالے ہیں جن میں جاسوسی کہانیاں، توہمات، مذہبی تنگ نظری اور پسماندہ خیالات پر مبنی مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ اس صورت حال

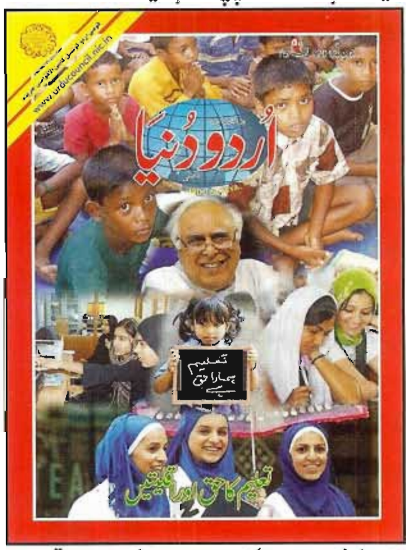

کے پیش نظر 'اردو دنیا' کی ذمے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ بات بھی باعث اطمینان ہے کہ اس رسالے میں معیاری ادب اور تنقید بھی شائع ہوتی ہے۔ اردو میں اب بھی ادبی رسائل کی تعداد کافی ہے لیکن معیاری رسائل مالی بدحالی سے جوجھ رہے ہیں جب کہ باقی ماندہ پڑھنے کے لائق نہیں۔

رام کرشن ترویدی (کنوینر)

(اردو ہندی بھائی چارہ)

16/7 گاندھی مارگ، نیاپاڑہ، بالوڈابازار، بھٹ پورہ، چھتیس گڑھ

اس ملک میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا رسم الخط مختلف ہونے سے زبانیں الگ نہیں ہو جاتیں۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے بھی کہا تھا کہ ہر ہندوستانی کو دونوں زبانیں اور اس کا رسم الخط سیکھنا چاہیے۔ میں ایک ریٹائرڈ صحافی ہوں اور دونوں زبانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد ہے کہ میں ہندی والوں کو اردو اور اردو والوں کو ہندی سکھاؤں، میں نے خود ابھی حال میں اردو رسم الخط سیکھا ہے اور اردو ہندی کے فروغ کے لیے اردو ہندی بھائی چارہ تنظیم کا قیام کیا اور ادب نوازوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی پرانی کتابیں ہمیں بھیجیں تاکہ اردو کے فروغ کی کوششوں کو مزید تقویت مل سکے اور یہ کتابیں نئے اردو سیکھنے والوں تک پہنچ سکیں۔ ■

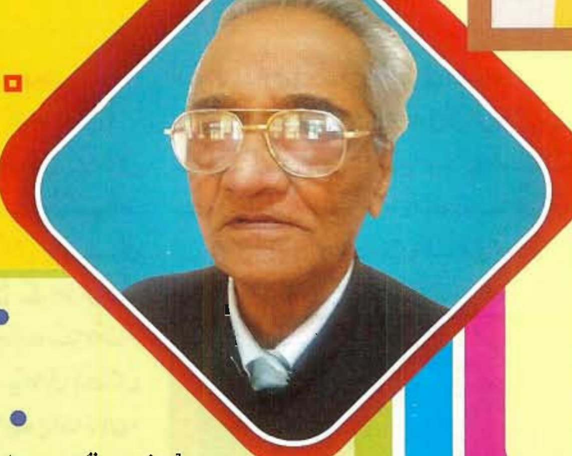

محمد ظفرالدین

مجتبیٰ حسین

طنزومزاح نگاری کی گولڈن جوبلی

- طنزومزاح نگار بنیادی طور پر بہت غمگین شخصیت کا بھی مالک ہوتا ہے اس کے اندر دُنیا بھر کے درد پنہاں ہوتے ہیں۔
- درد کو اپنے اندر جذب کر کے دُنیا کو ہنسانا بڑے دل گردے کی بات ہے۔

[ہندوستان میں اردو طنزو مزاح کی نصف صدی کا دوسرا نام مجتبیٰ حسین ہے۔ وہ پچاس برس سے حیدراباد کے موقر روزنامہ 'سیاست' کے لیے کالم نگاری کر رہے ہیں جو اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔زندگی کی76 بہاریں دیکھنے کے بعد بھی مجتبیٰ حسین زندہ دلی اور شگفتہ کلامی کی بہترین مثال ہیں۔ جب ملیے تروتازہ۔ فون کیجیے تو پر جوش لہجہ۔ وضع داری کے پیکر۔ اخلاص و انکساری کی مجسم تصویر۔ کشادہ پیشانی۔ چہرے کی سلوٹیں اور بالوں کی چاندی عمر کی گواہی دے رہی ہیں مگر انداز گفتگو' جوش و خروش' چلنا پھرنا' مصروفیت اور سرگرمیاں اُن کی عمر کو جھٹلا دیتی ہیں۔ ہروقت چاق و چوبند۔ ہشاش بشاش۔جب بات کیجیے توآپ کو ''ابھی وہاں سے آیا ہوں۔'' یا ''ابھی وہاں پہنچنا ہے'' ضرور سننا پڑے گا۔ البتہ ایک عصا اُن کا مستقل ساتھی بن گیا ہے جو ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتا ہے۔مگر اُس کا تعلق ضعف پیری سے نہیں بلکہ گھٹنے کے ناکام آپریشن سے ہے ۔ طنزو مزاح کی درجنوں کتابوں کے مصنف اور گزشتہ پچاس برسوں سے لگاتار لکھنے والے مجتبیٰ حسین آج اُردودُنیا کے لاکھوں دلوں پر راج کررہے ہیں۔حیدرآباد کے ریڈ ہلز علاقے میں مقیم ہیں جسے پرانے لوگ ''لال ٹیکری'' کہتے ہیں۔ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے مطمئن والد۔ دونوں بیٹے انجنیئراور دونوں بیٹیاں تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ ۔مجتبیٰ حسین کے شب و روز ادب و تہذیب کی خدمت میں گزررہے ہیں۔ طنزو مزاح اُن کی زندگی ہے ۔ اُن کی تحریر' تقریر' گفتگوسب کے سب طنزومزاح سے شرابور ہیں۔ آئیے معروف نقاد اور مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے اسکول آف لینگوئجز کے ڈین، پروفیسرمحمد ظفرالدین کے توسط سے ، مجتبیٰ حسین سے باتیں کرتے ہیں۔کچھ اُن کے بارے میں۔کچھ طنزو مزاح کے بارے میں۔ ادارہ]

محمدظفرالدین: مجتبیٰ صاحب!سب سے پہلے اپنے وطن، تعلیم اور ملازمت کے تعلق سے آپ ہمارے قارئین کو واقف کرائیے۔

مجتبیٰ حسین: ہمارے آباو اجداد کا تعلق مہاراشٹر کے مشہور مقام عثمان آباد سے تھا مگر میرے والد مولوی احمد حسین ملازمت کے سلسلے میں کرناٹک کے گلبرگہ شہر میں آباد ہو گئے ۔ وہیں 15 جولائی 1936 کو تحصیل چنچولی میں میری پیدائش ہوئی۔ گلبرگہ اور عثمان آباد میں ابتدائی تعلیم ہوئی جبکہ تانڈور کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے 1951 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ عثمان آباد' تانڈور اور گلبرگہ قریبی شہر ہیں۔ ریاستوں کے فرق ہوجانے کے باوجود آج بھی ان شہروں کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔1953 میں گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد میں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن(1955) اور ڈپلوما ان پبلک ایڈمنسٹریشن (1958) کیا۔ ملازمت کا باقاعدہ آغاز محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش سے (1962) کیا۔ نومبر 1972 میں شعبہ ریسرچ' گجرال کمیٹی دہلی سے وابستہ ہوا اور ستمبر 1974 تک وہاں خدمات انجام دیتا رہا۔ گجرال صاحب اور گجرال کمیٹی سے وابستگی نے میری زندگی میں بڑی اہم تبدیلیاں پیدا کیں۔ وہیں سے میں نے این سی ای آر ٹی جوائن کیا اور ایک طویل عرصے تک کام کرتا رہا۔میں این سی ای آر ٹی میں اُردو کا پہلا مستقل ملازم تھا۔دلّی بہت ظالم شہر کہا جاتا ہے لیکن میرے حق میں بہت مہربان شہر ثابت ہوا۔اس لیے کہ میری زندگی اور فن پر وہاں کا بڑا اثر رہا۔ وہاں کی متنوع تہذیب سے مجھے بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کا موقع ملا ۔ دراصل میری جو کچھ بھی ''کارستانیاں'' ہیں' وہیں کی مرہون منت ہیں۔

ظفرالدین: آپ نے لکھنا کب سے شروع کیا؟ اور آپ کو قلمکار بنانے میں کن محرکات نے کام کیا؟

مجتبیٰ حسین: بھئی ظفرالدین صاحب! میں نے پہلی مزاحیہ تحریر 12 اگست 1962 کو لکھی جو 15 اگست کے روزنامہ سیاست میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے فرضی

نام 'کوہ پیما' کے نام سے ایک کالم 'شیشہ و تیشہ' لکھنا شروع کیا تھا جسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے پیچھے محرکات یا عوامل نہ تھے بلکہ میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر صاحب کا حکم تھا۔ میں یونہی سیاست کے دفتر پہنچا تو بڑے بھائی کا حکم ہوا کہ تمھیں ایک کالم لکھنا ہے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور گھبراہٹ بھی۔ لیکن جب اُنھوں نے اصرار کیا اور ہمت بندھائی تو میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ اپنا اصل نام ڈالنے کے بجائے فرضی نام 'کوہ پیما' استعمال کیا۔ جلد ہی لوگوں کی طرف سے اچھا ردعمل ملنے لگا۔ لوگوں میں یہ بھی جستجو ہوئی کہ آخر کوہ پیما کون ہے؟ شیشہ و تیشہ شروع کرنے کے چھ ماہ بعد ہی عبدالماجد دریابادی کسی کام سے حیدرآباد تشریف لائے۔ واپس جانے کے بعد اُنھوں نے حیدرآباد کے اخبارات پر ایک تاثراتی مضمون لکھا جس میں سیاست کے ذکر کے ساتھ میرے کالم کی بڑی تعریف کی۔ میرے لیے یہ بڑی حوصلہ افزائی کی بات ہوئی اور پھر تو میں لکھتا ہی چلا گیا۔ اپنے اصل نام مجتبیٰ حسین کے نام سے میں نے پہلا مضمون 'ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں' لکھا جو 1964 میں ماہنامہ صبا' حیدرآباد میں شائع ہوا۔

ظفرالدین: آپ کے مشاہدے کے مطابق آج اُردو میں طنز و مزاح کی صورتحال کیسی ہے؟

مجتبیٰ حسین: ایک زمانے میں اُردو طنز و مزاح سب سے بلند منصب پر فائز تھا مگر اب بہت سی دوسری زبانوں مثلاً مراٹھی' بنگالی' کنڑا' اُڑیہ وغیرہ میں بھی اعلیٰ پایے کا مزاح لکھا جا رہا ہے۔ اُردو میں طنز و مزاح کے زوال کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلے تو اُردو ذریعہ تعلیم اور خود اُردو زبان و ادب کی تعلیم کی طرف کم ہوتا ہوا رجحان ہے۔ جب کسی زبان کی مقبولیت ہی کم ہونے لگے' لوگوں کی اُس میں دلچسپی کم ہونے لگے' اُس کا دائرہ سکڑنے لگے تو اُس زبان کا ادب تو متاثر ہوگا ہی۔ طنز و مزاح بھی ادب کا ایک اہم حصہ ہے اور اس پر بدلتے ہوئے رجحان کے کچھ نہ کچھ منفی اثرات مرتب ہوئے۔ دوسری طرف حکومت کی سرپرستی بھی کم ہونے لگی۔ پہلے حکومت کی دلچسپی کی وجہ سے کتنی محفلیں سجتی تھیں اور کتنے ہی فنکاروں کو مراعات حاصل ہوا کرتی تھیں لیکن اِدھر حالات بدلتے جا رہے ہیں۔ یوں تو آزادی کی پوری جنگ اُردو ہی میں لڑی گئی لیکن آزادی ملنے کے فوری بعد رویہ بدل گیا۔ اِس زبان کے ساتھ بے اعتنائی کا برتاؤ شروع ہو گیا۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اُردو تعلیم کا چلن کم سے کم ہوتا چلا گیا۔ زبان کی حیثیت سے ہو یا ذریعہ تعلیم کے طور پر' دونوں ہی سطح پر اُردو کمزور پڑتی چلی گئی۔ اُس کا فطری اثر یہ ہوا کہ اُردو پڑھنے والوں کی کمی کے ساتھ اُردو کے ماحول میں بھی وہ گرمی باقی نہ رہی جو پہلے تھی۔

ظفرالدین: طنز و مزاح نگاری کے حوالے سے مزید کچھ...!

مجتبیٰ حسین: دُنیا کی کسی بھی زبان میں طنز و مزاح لکھنے والے معدودے چند ہوتے ہیں۔ اُنھیں اُنگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ طنز و مزاح نگاری بہت مشکل کام ہے۔ اگر کچھ کمی رہ گئی تو خود مصنف

طنزومزاح بھی ادب کا ایک اہم حصہ ھے اور اس پر بدلتے ھوئے رجحان کے کچھ نہ کچھ منفی اثرات مرتب ھوئے۔ دوسری طرف حکومت کی سرپرستی بھی کم ھونے لگی۔ پھلے حکومت کی دلچسپی کی وجہ سے کتنی محفلیں سجتی تھیں اور کتنے ھی فنکاروں کومراعات حاصل ھوا کرتی تھیں لیکن اِدھر حالات بدلتے جارھے ھیں۔یوں تو آزادی کی پوری جنگ اُردو ھی میں لڑی گئی لیکن آزادی ملنے کے فوری بعد رویہ بدل گیا۔ اِس زبان کے ساتھ بے اعتنائی کا برتاؤ شروع ھو گیا۔دوسری بڑی وجہ یہ ھے کہ اُردو تعلیم کا چلن کم سے کم ھوتا چلا گیا۔ زبان کی حیثیت سے ھو یا ذریعہ تعلیم کے طور پر' دونوں ھی سطح پر اُردوکمزور پڑتی چلی گئی۔ اُس کا فطری اثر یہ ھوا کہ اُردو پڑھنے والوں کی کمی کے ساتھ اُردو کے ماحول میں بھی وہ گرمی باقی نہ رھی جو پھلے تھی۔

نشانہ بن جائے گا۔ طنز و مزاح نگاری میں جملوں میں خوبصورتی ہونی چاہیے تاکہ قاری مضمون سے بندھا رہا ہے۔ لطف کا تسلسل قائم رہے۔ طنز و مزاح نگار کو شکل و صورت اور اپنی ظاہری شخصیت کے اعتبار سے بھی خوش و خرم اور خوش دل ہونا چاہیے۔ وہ شخص طنز و مزاح لکھ ہی نہیں سکتا جس کے اندر خود حسِ مزاح نہ ہو۔ طنز و مزاح نگار کے یہاں حسِ مزاح کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میرا ایک مشہور جملہ ہے کہ "ظرافت نگاری کے لیے آدمی کا محض ظریف ہونا کافی نہیں بلکہ اُس کا باظرف ہونا بھی ضروری ہے۔" دراصل باظرف خود اپنا مذاق اُڑانے کی جرأت رکھتا ہے۔ پُر مزاح اور تمسخر آمیز کردار کا لبادہ اوڑھ کر قارئین کے سامنے آتا ہے۔ اپنی کمیاں اور کوتاہیاں بیان کر کر کے

مجتبیٰ حسین: ایک نظر

نام: مجتبیٰ حسین

پیدائش: 15 جولائی 1936 بمقام گلبرگہ کرناٹک

تعلیم: گریجویشن (جامعہ عثمانیہ 1955)

شادی: 11 نومبر 1956 چچازاد بہن ناصرہ رئیس سے

اولاد: ہادی حسین، راشدہ رئیس، مصباح حسین، نجیبہ رئیس

ملازمت: آغاز روزنامہ سیاست حیدرآباد (بحیثیت سب ایڈیٹر 1956)

باقاعدہ ملازمت: محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش 1972-1962

پہلی مطبوعہ تحریر: کالم شیشہ و تیشہ، سیاست میں فرضی نام کوہ پیما کے نام سے (12 اگست 1962 کو تحریر، 15 اگست کے شمارے میں شائع)

تصانیف: تکلف برطرف (1968)، قطع کلام (1969)، قصہ مختصر (1972)، بہرحال (1974)، آدمی نامہ (خاکے 1981)، بالآخر (1982)، جاپان چلو جاپان چلو (سفرنامہ 1983)، الغرض (1987)، سو ہے وہ بھی آدمی (خاکے 1987)، چہرہ در چہرہ (خاکے 1993) سفر لخت لخت (سفرنامہ 1995)، آخر کار (1997)، ہوئے ہم دوست جس کے (خاکے 1999)، میرا کالم (کالموں کا انتخاب 1999) ان کے علاوہ کئی لوگوں نے ان کے انتخاب شائع کیے اور ان پر بھی کئی کتابیں اور تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔

ہندی کتابیں: قصہ آرام کرسی کا، جاپان چلو جاپان چلو، سوئز بینک میں کھاتہ ہمارا، سندباد کا سفرنامہ، چہرہ در چہرہ

سفر: جاپان، انگلستان، پیرس، امریکہ، کینیڈا، سوویت یونین، سعودی عرب، پاکستان، مسقط، دوبئی

انعامات و اعزازات: پدم شری، ڈی لٹ، نشان امتیاز، غالب ایوارڈ، کل ہند مخدوم ایوارڈ، کل ہند مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ، کل ہند جو ہر قریشی ایوارڈ،

رابطہ: 11-5-152, B-107, Royal Orchid, Red Hills, Hyderabad - 500004 (AP)

لطف و مزاح کا سامان فراہم کرتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ رونے کے لیے اتنے شعور کی ضرورت نہیں ہوتی جتنی ہنسنے کے لیے ہوتی ہے۔ اور ہنسانا اس سے بھی بڑا فن ہے۔ طنز و مزاح نگار بنیادی طور پر بہت غمگین شخصیت کا بھی مالک ہوتا ہے۔ اس کے اندر دُنیا بھر کے درد پنہاں ہوتے ہیں۔ درد کو اپنے اندر جذب کر کے دُنیا کو ہنسانا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ کامیاب طنز و مزاح نگار کو اس پر قدرت حاصل ہوتی ہے اور یہی اُس کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔

ظفر الدین: آپ کن طنز و مزاح نگاروں سے متاثر رہے اور یہ کہ آج آپ اِس میدان میں کن حضرات کو اہم قلمکار سمجھتے ہیں؟

مجتبیٰ حسین: دیکھیے! آزادی کے بعد اُردو طنز و مزاح نگاری اپنے عروج پر تھی۔ رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کرشن چندر، کنھیا لال کپور وغیرہ اہم حضرات تھے جو لکھ رہے تھے۔ بلکہ میں سعادت حسن منٹو کے طنز کا بھی قائل ہوں۔ فرحت اللہ بیگ بھی ایک اہم ستون رہے ہیں جنھوں نے ادبی چاشنی اور گھلاوٹ کے ساتھ طنز و مزاح کو بام عروج تک پہنچایا۔ آج بھی کافی لوگ لکھ رہے ہیں۔ ایک سے ایک لوگ ہیں جن کے یہاں طنز و مزاح موجود ہے۔ لیکن طنز و مزاح نگاری کی جو شگفتگی، برجستگی اور بے ساختگی ہونی چاہیے جو پہلے کے کالم نگاروں کی نمایاں خصوصیات تھیں غالباً ملک کے حالات کی وجہ سے آج کے لکھنے والوں کے یہاں اُس تندی اور اثر انگیزی کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ اُس کی سب سے بڑی وجہ ملکی اور عالمی حالات ہیں۔ اب وہ ماحول ہی نہیں رہا۔ ہر طرف تناؤ اور تفکرات کا غلبہ ہے۔ پھر بھی جو لوگ پرانی قدروں کی پاسداری کر رہے ہیں اُن میں نصرت ظہیر، اسد رضا، منظور عثمانی، عظیم اختر، فیاض احمد فیضی، پرویز یداللہ مہدی، عباس متقی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ بھئی ایک بات اور واضح کر دوں کہ نام لینے میں بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ کوئی نام رہ جائے تو ذاتی شکایت ہو جاتی ہے۔ اور بھی لوگ ہیں مگر اُن کے نام فوری طور پر ذہن میں نہیں آ رہے ہیں۔

پرانے اور نئے طنز و مزاح نگاروں کے تعلق سے میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا کہ پہلے جو لوگ لکھ رہے تھے اُنہوں نے اِس فن کو اپنی زندگی کا مقصد اور مطمح نظر بنا لیا تھا۔ اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ وہ شدتِ جذبات اور شدت وابستگی اب دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یعنی 'فل ٹائم ٹائپ' فنکار کی بہت کمی ہے۔ فنکاری اب 'پارٹ ٹائم مشغلہ' بن گئی ہے۔ حالانکہ ملک اور معاشرے کی صورتحال ایسی ہو گئی ہے جہاں طنز و مزاح کی بڑی گنجائش ہے۔ ہمارے چاروں طرف موضوعات بکھرے پڑے ہیں۔ ہمیں لکھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ لیکن حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ہر موضوع پر لکھا نہیں جا سکتا۔ حالات کے ساتھ وقت کی بھی کمی ہے۔ بعض اوقات وجدان کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

ظفر الدین: ادیبوں اور فنکاروں کو اکثر زمانے سے شکایت رہتی ہے۔ آپ گزشتہ پچاس سال سے لکھ رہے ہیں۔ ایسے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

باقی و برقرار رہنے اور اس کی بے پناہ ترقی کی دعا کرتا ہوں۔ مجھے یہ بھی خوشی ہے کہ شدت پسند ادیب ہوں' کسی گروپ یا جماعت کے لوگ ہوں' مجھے سبھی چاہتے ہیں۔ مجھے سبھوں کا پیار ملا ہے۔ راجندرسنگھ بیدی' کرشن چندر' کنھیا لال کپوروغیرہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ فکر تونسوی' کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور خواجہ حسن ثانی نظامی وغیرہ بھی مجھے قریب رکھتے تھے۔ اندرکمار گجرال اور خشونت سنگھ بھی ہمارے کرم فرماؤں میں شامل ہیں۔ گجرال صاحب کی وجہ سے تو میں دہلی گیا تھا۔ عصر حاضر کے بھی سبھی سنیئراور جونیئرادیب میرے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ میں نام نہیں لوں گا۔ اس لیے کہ نام لینے میں کوئی ہرج نہیں مگر نام کے چھوٹ جانے میں پھر وہی آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین: مجھے زمانے سے یا کسی شخص سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بلکہ میں تو سب کا شکر گزار ہوں۔ مجھے اُردو زبان کی وجہ سے اور اپنی طنز و مزاح نگاری کی وجہ سے بہت عزت حاصل ہوئی ہے۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اُردو ہی کی وجہ سے ہوں۔ میں اُردو کے باقی و برقرار رہنے اور اس کی بے پناہ ترقی کی دعا کرتا ہوں۔ مجھے یہ بھی خوشی ہے کہ شدت پسند ادیب ہوں، کسی گروپ یا جماعت کے لوگ ہوں، مجھے سبھی چاہتے ہیں۔ مجھے سبھوں کا پیار ملا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، کنھیا لال کپور وغیرہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ فکر تونسوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور خواجہ حسن ثانی نظامی وغیرہ بھی مجھے قریب رکھتے تھے۔ اندر کمار گجرال اور خشونت سنگھ بھی ہمارے کرم فرماؤں میں شامل ہیں۔ گجرال صاحب کی وجہ سے تو میں دہلی گیا تھا۔ عصر حاضر کے بھی سبھی سنیئر اور جونیئر ادیب میرے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ میں نام نہیں لوں گا۔ اس لیے کہ نام لینے میں کوئی ہرج نہیں مگر نام کے چھوٹ جانے میں پھر وہی آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

ظفر الدین: پورا ہندوستان آپ کا ہے لیکن آپ حیدر آباد کے ہیں۔ اِس بارے میں آپ کا کچھ تاثر؟

مجتبیٰ حسین: آپ نے صحیح کہا کہ پورا ہندوستان میرا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ میں بھی پورے ہندوستان کا ہوں۔ میں دہلی کا تو ذکر کر ہی چکا ہوں کہ اُس نے مجھے بہت کچھ دیا اور وہاں کی خالص دہلوی تہذیب کے ساتھ ملی جلی تہذیب سے بھی زندگی کا کافی تجربہ حاصل ہوا۔ یوپی اور بہار کے لوگ بھی مجھے بہت چاہتے ہیں۔ دونوں ریاستوں میں میرے چاہنے والوں کی کثیر تعداد ہے۔ ان علاقوں میں میرے اوپر مضامین اور مقالے کافی لکھے گئے۔ لوگوں نے تحقیقی کام بھی کیے اور کروائے ہیں ... جہاں تک حیدر آباد کا سوال ہے تو ظاہر ہے کہ عملی طور پر یہ میرا وطن ہے۔ مجھے اس شہر کے ذرے ذرے سے جذباتی لگاؤ ہے۔ مجھے اس شہر سے اٹوٹ محبت ہے۔ میں حیدر آبادی مزاح کا بھی قائل ہوں۔ یہاں کے لوگ بے ساختہ ہنستے ہیں اور ہر دم خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حیدر آباد کو طنز و مزاح کی راجدھانی کا درجہ حاصل ہے۔ دہلی اور حیدر آباد کے تعلق سے میں عرض کروں گا کہ دہلی مجھے بہت چاہتی ہے اور میں حیدر آباد کو چاہتا ہوں۔ یہاں انجمن زندہ دلان موجود ہے جس کے کارنامے اور خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس انجمن کے تحت طنز و مزاح نگاروں کی 1985 میں جو عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، پوری دُنیا میں اس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ زندہ دلان حیدر آباد کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ اُس کا ترجمان ماہنامہ رسالہ شگوفہ ہے جو گزشتہ 44 برسوں سے ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ خالص طنز و مزاح کا رسالہ ہے۔ اس کے ذریعے طنز و مزاح کی روایت کو فروغ دینے اور برقرار رکھنے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔

ظفر الدین: آپ کو بے پناہ انعامات و اکرام سے نوازا گیا ہے۔ حکومت ہند نے پدم شری تک سے سرفراز کیا۔ اس حوالے سے آپ کا کیا خیال ہے؟

مجتبیٰ حسین: اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے ڈھیر سارے انعامات ملے ہیں۔ میں اُن سبھی افراد اور

اداروں کا مشکور ہوں جنھوں نے میری عزت افزائی کی۔ لیکن ایک بات کی طرف توجہ دلاتا چلوں کہ میں نے 1962 سے لکھنا شروع کیا اور 18 سال تک مجھے کوئی ایوارڈ نہیں ملا تھا۔ 1980 میں اُڑیا زبان کے ادیبوں کی تنظیم سرس ساہتیہ سمیتی کٹک کی طرف سے مجھے پہلا ایوارڈ 'ہاسیہ رتن' دیا گیا۔ اسے اتفاق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اُردو کے ادیب کو پہلی بار جو اعزاز ملا وہ اُردو کی طرف سے نہیں بلکہ ایک دوسری زبان اُڑیہ کی طرف سے دیا گیا۔ اس کے بعد تو سلسلہ چل پڑا۔ مختلف وقتوں میں مختلف اداروں سے کئی اعزازات حاصل ہوئے جن میں بطور خاص غالب ایوارڈ نئی دہلی، کل ہند مخدوم ایوارڈ حیدرآباد، کل ہند ایوارڈ برائے مجموعی خدمات کرناٹک، کل ہند جوہر قریشی ایوارڈ مدھیہ پردیش، میر تقی میر ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔

ظفر الدین: دانش گاہوں نے بھی آپ کو تسلیم کیا ہے...!

مجتبیٰ حسین: جی ہاں! 2010 میں گلبرگہ یونیورسٹی نے مجھے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی سری نگر، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، بروڈہ یونیورسٹی گجرات، روہیلکھنڈ یونیورسٹی، مراٹھواڑہ یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، رانچی یونیورسٹی اور گلبرگہ یونیورسٹی میں میرے اوپر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد نے مجھے ایک سال کے لیے 2011-12 میں وزیٹنگ پروفیسر بنایا تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ گلبرگہ یونیورسٹی نے مجھے ڈاکٹر بنایا جبکہ حیدرآباد یونیورسٹی نے مجھے پروفیسر کے منصب پر فائز کیا۔ میں اپنے لیے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات سمجھتا ہوں۔

ظفر الدین: آپ نے کالم کے ساتھ بے شمار خاکے اور سفرنامے لکھے ہیں۔ آپ اپنی تمام تحریروں میں سب سے زیادہ اہمیت کسے دیتے ہیں؟ میری مراد ہے ماسٹر پیس .....!

مجتبیٰ حسین: جس طرح کسی بھی تخلیق کار کو اپنی تمام تخلیقات عزیز ہوتی ہیں، مجھے بھی اپنی ساری تحریریں پسند ہیں۔ ہر کالم، خاکے یا سفرنامے کے پیچھے ذہنی رو کام کرتی رہی ہے اور جب بھی میں اپنی کوئی پرانی تحریر پڑھتا ہوں مجھے وہ کیفیت یاد آ جاتی ہے جس کیفیت میں وہ تحریر معرض وجود میں آئی تھی۔ آپ ماسٹر پیس کی بات کر رہے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ مجھے لکھنا ہی نہیں آتا۔ پھر بھی اس ''کوڑا کرکٹ'' میں ''سفرنامہ جاپان'' کافی پسند ہے اس لیے کہ وہ بغیر کسی محنت کے لکھا گیا اور لوگوں نے اُسے بے حد سراہا۔ قارئین کی طرف سے غیر معمولی

پذیرائی سے مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے گجرات کے 1969 کے فساد کے بعد اُس سے متاثر ہو کر ایک انشائیہ 'سند باد کا جہازی سفرنامہ' لکھا تھا۔ اُس میں سند باد جہازی خاص طور پر فساد دیکھنے کے لیے رُکتا ہے اور بڑا متاثر ہوتا ہے کہ یہ لڑائی 'انسانیت' کی ملاوٹ کے بغیر لڑی جاتی ہے۔ اس میں کہیں سے بھی انسانیت کی ملاوٹ نہیں ہونے دی جاتی۔ مجھے یہ انشائیہ بھی بہت پسند ہے۔ دراصل لکھنے والا تو اپنی ہر تحریر ذوق وشوق سے لکھتا ہے لیکن جب اُسے قارئین کا ردعمل ملتا ہے تب احساس ہوتا ہے کہ اُس نے تو بہت اچھا لکھ دیا یا اُس میں کسر رہ گئی۔ میں بھی قارئین اور احباب کے تبصرے، تاثر اور ردعمل سے ہی اپنی کسی تحریر کے معیار کا تعین کرتا ہوں۔

ظفر الدین: آخر میں، میری خواہش ہے کہ آپ طنز و مزاح لکھنے والوں کے لیے کوئی ایسا پیغام دیں جو اُن کے لیے مشعل راہ ثابت ہو!

مجتبیٰ حسین: معاملہ طنز و مزاح کا ہو یا پھر ادب کے کسی اور میدان کا، قلمکار کو اپنے موضوع میں ڈوب جانا چاہیے۔ آپ جب تک موضوع کا از خود حصہ نہیں بن جاتے آپ کی تحریر میں وہ جان پیدا نہیں ہوتی جو قارئین کو آپ کی تحریر سے جوڑ دے۔ میں نے ابھی آپ سے کہا کہ طنز و مزاح بہت مشکل فن ہے۔ یہ صرف ہنسانے کا نہیں اپنے آپ پر ہنسنے کا فن ہے۔ اس کے لیے اخلاقی جرأت اور اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لکھنے والوں کو پڑھنے کی عادت بھی ڈالنی چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ پڑھنے سے موضوع اور مواد دونوں کی دستیابی آسان ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنے کلاسک سرمایے سے رشتہ استوار رکھنا چاہیے۔ طنز و مزاح کا معاملہ زبان سے جڑا ہوا ہے اور میرا ماننا ہے کہ کلاسک کے مطالعے کے بغیر زبان پر قدرت ممکن نہیں ہے۔ لکھنے والوں میں تحمل اور برداشت کی قوت بھی ضروری ہے۔ اگر آپ پر کوئی تنقید کرتا ہے تو اُسے سمجھنے، تسلیم کرنے اور برداشت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بعض اوقات بیجا نکتہ چینی ہوتی ہے مگر ایسے موقع پر اعلیٰ ظرفی اور وضع داری کا ساتھ نہیں چھوٹنا چاہیے۔ یہی میرا پیغام ہے۔

■

Prof. Mohd. Zafaruddin, Dean, School of Languages, Linguistics & Indology, Maulana Azad National Urdu University, Gachibowli, Hyderabad - 500 032 (AP),
zafaruddin65@gmail.com

محمد نعمان خان

قومی تعلیمی پالیسی اور افکارِ ٹیگور

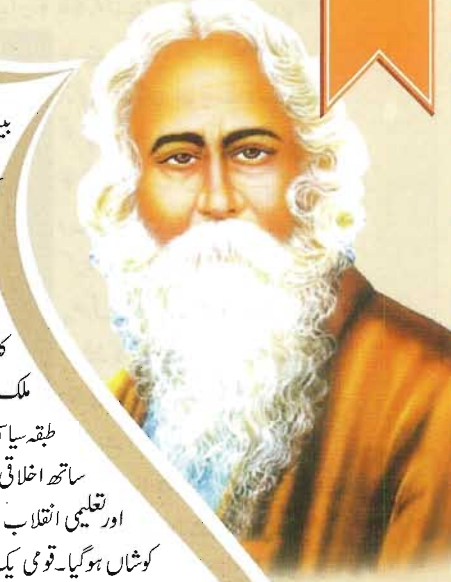

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانیوں نے جوں ہی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا ملک کا دانشور طبقہ سیاسی تبدیلی کے ساتھ اخلاقی، فکری، ذہنی اور تعلیمی انقلاب کے لیے بھی کوشاں ہوگیا۔ قومی یک جہتی، حب الوطنی اور فرض شناسی کے جذبے کو عام کرنے میں جن دانشوروں اور فنکاروں نے اپنی تخلیقات اور مشن کے ذریعے تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے ان میں رابندر ناتھ ٹیگور کا نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ ٹیگور کی بنیادی شناخت اگرچہ قومی شاعر کی ہے لیکن وہ سیاسی مفکر، تہذیبی مبلغ اور ماہر تعلیم بھی تھے۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور متنوع خدمات کے سبب لوگ انھیں 'گرودیو' کے لقب سے پکارتے اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کا خاندان تعقل پسندی اور روشن خیالی کا حامل تھا۔ اس ضمن میں ٹیگور نے لکھا ہے:

''جب میں پیدا ہوا اس سے پہلے ہی ہمارے خاندان نے اپنی معاشرتی کشتی کے لنگر کی زنجیروں کو توڑ ڈالا تھا اور تیر کر عام طور پر رائج وحشیانہ اور عموماً برتے جانے والے بکثرت ہندو راج کے دریا سے باہر نکل چکا تھا اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے صرف دھندلے نقوش باقی رہ گئے تھے۔'' (بحوالہ 'تاریخ تحریک ہند' جلد سوم ص249، از تاراچند)

مذکورہ بالا اقتباس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نامساعد حالات اور بحرانی دور کے باوجود ٹیگور کی تعلیم، تربیت اور پرورش آزادانہ ماحول میں ہوئی اور تاعمر وہ اسی ذہنی آزادی کی تبلیغ و تشہیر کرتے رہے۔ ذہنی آزادی کی اس نعمت نے ان کے تخیل کو بلند، فکر کو وسیع اور ذہن کو پختہ تر بنا دیا تھا۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی صلاحیتیں فطری اور وہبی تھیں۔ جستجوئے حق میں وہ تاعمر سرگرداں رہے۔ ان کے وجدان نے ان میں وحدت کا شعور اور ایسی بصیرت پیدا کر دی جس کا عکس ان کی تخلیقات نیز فکر و عمل میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ٹیگور نے اپنے فکر و فلسفے کی تعمیر و تشکیل میں صالح تہذیبی روایات اور اعلیٰ کلاسیکی ادب کے ساتھ جدید علوم و فنون سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا تھا۔ انھوں نے کائنات کا مطالعہ چشم بصیرت سے کیا اور اپنے شعور و تجربات سے ایسی دنیا کھوج نکالی جس میں فکر و عمل، یقین و اعتماد اور امید و مسرت کی لہریں موجزن نظر آتی ہیں۔ انسانی بیداری کا جذبہ اور اطمینان قلب ان کے فلسفے کی اساس ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے:

''جو احساس مجھے ہمیشہ رہا وہ تھا اپنی شخصیت کا گہرا اطمینان، جو ہر طرف سے چشموں سے بہتے ہوئے آکر میری فطرت کے دھارے کے ساتھ رواں ہوا—''

('Rabindra Nath: The Poet and the Philospher' p 64, by S.K. Das Gupta)

ٹیگور کا یہ گیت ان کے نظریہ فکر و عمل کا ترجمان ہے:

''اگر تیری پکار پر کوئی تیرے پیچھے نہ چلے، تب بھی تو
اکیلا ہی آگے چل، اکیلا ہی آگے چل، اکیلا ہی آگے چل!
اگر کوئی تجھ سے بات نہ کرے، تب بھی تو
اے بے کس، اکیلا ہی آگے چل!
اگر کوئی تجھ سے منہ موڑ لے، تب بھی تو
کھلے دل سے اپنی روح کے پیغام کو
فرض یاد دلانے والی
بلند آواز سے پکارا!''

رابندر ناتھ ٹیگور کی نظر میں یہ کائنات محض حلقۂ دامِ خیال نہ تھی۔ وہ فطرت کے تقاضے پر لبیک کہنے اور ہر شب کو سحر کرنے کے قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان اپنی فطری قوتوں کو بروئے کار لاکر، فطرت کی عطا کردہ نعمتوں سے لطف اندوز ہو۔ ٹیگور کے فلسفے کے مطابق:

''انسان کا اعلیٰ مقصد، شخصیت کی تکمیل ہے۔''

اور شخصیت کا یہ عمل محض مراقبے میں بیٹھ کر انجام پذیر نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے لکھا ہے:

''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنی نجات کی خاطر اس پریشاں حال اور آفتوں میں گھری دنیا کو چھوڑ کر گوشۂ تنہائی میں سادھی لگالوں۔''

('Rabindra Nath Tagore: p 41 by Chakravasti.A Mitra, A K Sen, Sachin and Ray)

ہندوستانی عوام کو بیدار کرنے اور انھیں باعمل بنانے کے لیے انھوں نے تعلیم کو ذریعہ بنایا۔ وہ سیاسی تحریک کے بجائے اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے خواہاں تھے۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ دیہاتوں میں آباد ہے، جو نہ صرف زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے بلکہ تعلیم کی نعمت سے بھی محروم ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پوری توجہ اپنے 'تعلیمی مشن' پر مرکوز کر دی۔

رابندر ناتھ ٹیگور فرقہ وارانہ منافرت اور علاقائی عصبیت کے خلاف تھے۔ اس ضمن میں ان کا خیال تھا:

''جب تک ہمارے کردار کی وہ خامیاں جن کے سبب یہ عالم ہے، ختم نہیں ہوجاتیں، یہ مشکلات ہماری سیاسی زندگی کی ہر راہ کے ہر قدم پر روڑے اٹکاتی رہیں گی اور ہم کسی اپنی عظیم کوششوں کو کامیابی کی منزل تک نہیں لے جاسکیں گے۔''

('Tagore Rabindra Nath towards Universal man' p 105)

حکومت ہند کے مختلف تعلیمی مشن کی رپورٹوں 'قومی تعلیمی پالیسی 1986' اور 'نیشنل پروگرام آف ایکٹ' کے مسودات نیز مختلف اوقات میں شائع شدہ این سی ای آر ٹی کے قومی درسیات کے خاکے 'خصوصاً نیشنل کری کولم فریم ورک— 2005' کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تعلیمی دستاویزوں میں رابندر ناتھ ٹیگور کے تعلیمی نظریات اور ان کے فکر و فلسفے سے خاطر خواہ استفادہ کیا گیا ہے۔

'قومی درسیات کا خاکہ— 2005' کا آغاز ٹیگور

کے مضمون 'تہذیب و ترقی' کے درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

''جب میں بچہ تھا تو مجھے چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اپنے کھلونے اور اپنے تخیل سے نئے نئے کھیل ایجاد کرنے کی پوری آزادی تھی۔ میری خوشی میں میرے ساتھیوں کا پورا حصہ ہوتا تھا بلکہ کھیلوں کا پورا مزہ ان کے ساتھ کھیلنے پر منحصر تھا۔ ایک دن ہمارے بچپن کی اس جنت میں بالغان کی کاروباری دنیا سے ایک تحریص داخل ہوئی۔ ایک انگریزی دکان سے خریدا گیا کھلونا ہمارے ایک ساتھی کو دیا گیا۔ وہ کمال کا کھلونا تھا، بڑا اور سمجھو جیتا جاگتا۔ ہمارے ساتھی کو اس پر بہت ناز تھا اور اب کھیلوں کی طرف سے اس کی توجہ کم ہوگئی تھی بلکہ وہ اس قیمتی شے کو بہت ہی احتیاط سے ہماری دسترس سے دور رکھتا تھا اور اپنی اس خاص چیز پر بہت شان دکھاتا تھا۔ وہ اپنے ان ساتھیوں سے خود کو اعلیٰ تصور کرتا تھا جن کے کھلونے سستے تھے میں یقیناً یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ تاریخ کی جدید زبان کا استعمال کرسکتا تو شاید یہی کہتا کہ اس اعلیٰ کھلونے کا مالک ہونے کی حد تک ہم سے زیادہ مہذب ہے۔ لیکن اپنے جوش میں وہ ایک چیز بھول گیا کہ وہ حقیقت جو اسے اس وقت بہت معمولی لگتی تھی کہ اُس تحریص میں ایک ایسی قیمتی شے گم ہوگئی ہے جو اُس کے کھلونے سے کہیں زیادہ ارفع تھی یعنی ایک اعلیٰ اور مکمل بچہ۔ اس کھلونے سے محض اس کی دولت کا اظہار ہوتا تھا۔ بچے کی تخلیقی توانائی، کھیل میں فراخ دلانہ خوشی اور کھیل کی دنیا میں ساتھیوں کی شرکت سے وہ محروم ہوگیا تھا۔''

رابندر ناتھ ٹیگور نے تعلیم کے حصول میں بچوں کی تخلیقی، فطری صلاحیت، شمولیت اور مادری زبان پر خصوصی توجہ صرف کی تھی۔ مادری زبان کی اہمیت اور ضرورت سے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

''... بالکل اُس بچے کی طرح جو اپنی ماں کے دودھ سے سب سے زیادہ صحت مند اور مضبوط بنتا ہے، اگر انسان کی مادری زبان میں اسے تعلیم دی جائے تو اس کا دل و دماغ بھی سب سے زیادہ مضبوط بنے گا۔''

دنیا کے تمام ماہرین تعلیم بچے کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دیے جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ دستورِ ہند کے آرٹیکل '350-A' کے مطابق:

''ہر ریاست اور ریاست کے مقامی حکام کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ لسانی اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو ابتدائی سطح پر مادری زبان کے ذریعے تعلیم کی تمام تر ضروری سہولتیں مہیا کرائیں۔''

این سی ای آر ٹی کے 'قومی درسیات کا خاکہ 2005' میں سہ لسانی فارمولے کے نفاذ نیز بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دیے جانے سے متعلق نہ صرف پرزور سفارش کی گئی ہے بلکہ این سی ای آر ٹی سبھی مضامین کی درسی کتب کا اردو ورژن بھی شائع کرتی ہے۔ 'NCF-2005' کے مطابق:

''جب ہم گھر کی زبان اور مادری زبان کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہم گھر کی زبان، بڑے کنبے کی زبان، گلی کوچوں کی زبان مراد لیتے ہیں جسے بچہ فطری طور پر اپنے گھر اور سماج کے ماحول سے سیکھتا ہے ... بچے کو اس کی مادری زبان سے محروم کرنا، اس کے احساس تشخص میں دخل اندازی کے مترادف ہے ... بچوں کے گھر کی زبان اسکولی تعلیم کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ کلاس میں اعلیٰ سطح کی ترسیلی اور ذہنی استعداد کو فروغ دینا ہی پہلی یا مادری زبان کی تدریس کا مقصد ہونا چاہیے۔''

رابندر ناتھ ٹیگور کی صلاحیتیں فطری اور وہبی تھیں۔ جستجوئے حق میں وہ تاعمر سرگرداں رہے۔ ان کے وجدان نے ان میں وحدت کا شعور اور ایسی بصیرت پیدا کردی جس کا عکس ان کی تخلیقات نیز فکر و عمل میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ٹیگور نے اپنے فکر و فلسفے کی تعمیرو تشکیل میں صالح تہذیبی روایات اور اعلیٰ کلاسیکی ادب کے ساتھ جدید علوم و فنون سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا تھا۔ انھوں نے کائنات کا مطالعہ چشم بصیرت سے کیا اور اپنے شعورو تجربات سے ایسی دنیا کھوج نکالی جس میں فکر و عمل، یقین و اعتماد اور امید و مسرت کی لہریں موجزن نظر آتی ہیں۔

تعلیمی امور میں رابندر ناتھ ٹیگور نے مادری زبان کے ساتھ ساتھ دیسی فنون اور مقامی صنعتوں یا ان کی مصنوعات کو فروغ دینے کی بھرپور سعی کی۔ اس ضمن میں انھوں نے نہ صرف ایک 'سودیشی بھنڈار' قائم کیا بلکہ اپنے عظیم تہذیبی ورثے سے آگاہ کرانے کی خاطر ہندوستانی تاریخ کے اہم واقعات اور اہم شخصیات پر موثر نظمیں بھی لکھیں این سی ای آر ٹی کے 'قومی درسیات کا خاکہ' میں دیسی فنون خصوصاً مقامی دست کاریوں کو فروغ دینے کی نہ صرف پرزور سفارش کی گئی ہے بلکہ درسی کتب میں ان سے متعلق اسباق بھی شامل کیے گئے ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے آزاد فطری ماحول میں تعلیم دیے جانے کے لیے 'گروکل' کی طرز پر 22 دسمبر 1901 کو 'شانتی نکیتن' کی بنیاد رکھی تھی۔ اس تعلیمی ادارے کا اولین مقصد ''تعلیم کو عملی زندگی کا ایسا حصہ بنانا تھا جسے عام زندگی سے علیحدہ نہ کیا جاسکے۔'' تقریباً اسی خیال کو 'NCF-2005' کے پانچ رہنما اصولوں کے پہلے اصول میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

''علم کو اسکول سے باہر کی زندگی سے منسلک کرنا،

رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے تعلیمی مشن میں کام، امن، سیکولرزم، کھیل کود، جسمانی نشو و نما، حفظانِ صحت اور اعلیٰ انسانی اور تہذیبی قدروں کے تحفظ پر خاص توجہ صرف کی تھی۔ 'NCF-2005' میں مذکورہ امور کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔

1918 میں جب 'شانتی نکیتن' کو 'وشو بھارتی' کے بطور بین الاقوامی تعلیمی ادارے کی حیثیت عطا کی گئی تو ٹیگور نے اس کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا:

''ہندوستان کو دنیا سے سچے اور صحیح رشتوں کے ساتھ جوڑنا ہوگا۔ انسانیت دنیا کی تمام سچائیوں سے بڑی حقیقت ہے۔ ہندو، بدھ، جینی، سکھ، عیسائی اور مسلمان ہر نسل و مذہب اپنے اپنے مذہبوں کی عظیم روایات رکھتے ہیں اور یہ سب الگ الگ دھارے آگے بڑھتے ہوئے ایک دھارے میں بدل جاتے ہیں ... سب لوگوں کو حق ہے کہ وہ سچائی کی تلاش میں جس میں انسان مصروف ہے، شامل ہوجائیں مشرق و مغرب میں کوئی فرق نہ ہو۔ وشو بھارتی ہی ایک ایسی جگہ ہوگی جہاں حق کی یہ جستجو ہندوستان کو دنیا کے بقیہ حصوں کے ساتھ منسلک کردے گی۔

ہماری قومی تعلیمی پالیسی اور 'NCF-2005' میں بھی سیکولرزم، قومی یکجہتی اور 'سرو دھرم سمبھاؤ' کے عناصر نمایاں طور پر شامل ہیں۔

لہٰذا رابندر ناتھ ٹیگور کے مذکورہ بالا افکار و نظریات کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان کی قومی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں افکار ٹیگور سے خاطر خواہ استفادہ کیا گیا ہے۔

Dr. Mohd Noman Khan,
Prof. NCERT, New
Delhi - 110016

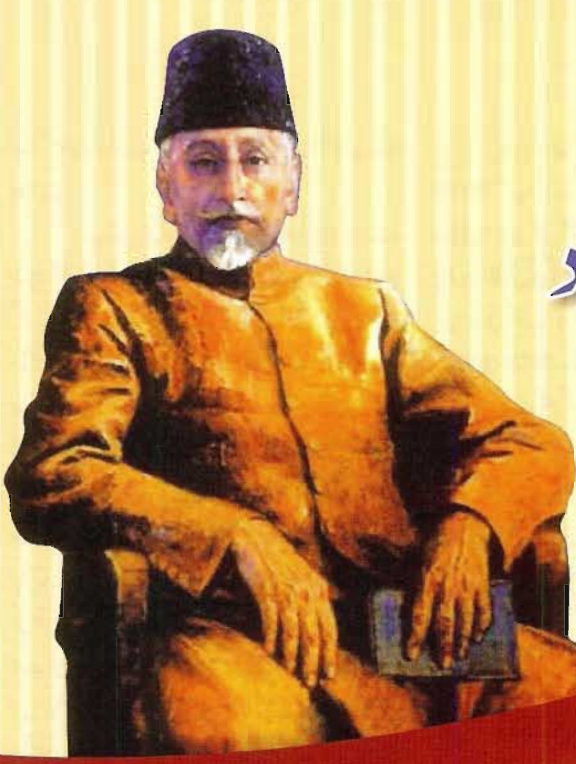

دیوان حنان خان

مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات

ہندوستانی سماج وسیاست میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ایک روشن دماغ عالم، ادبی صحافی اور مدبر سیاست داں کی تھی۔ انھوں نے پرزور خطابت اور بلیغ صحافت کے ذریعے جذبۂ حب الوطنی کا مظاہرہ کیا اور اپنی تحریر وتقریر کے جادو سے خوابیدہ معاشرے میں زندگی کی تڑپ پیدا کردی۔ مولانا آزاد ماہر تعلیم تھے۔ انھوں نے ملک وملت کی جو رہنمائی فرمائی ہے وہ ناقابل فراموش تو ہے ہی عہدِ حاضر کے اہم اور پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے بھی ان کی یادگار تحریریں ہماری رہنمائی کے لیے معاون ہیں۔

ایک مفکر اور عالم کی حیثیت سے مولانا آزاد کا دائرۂ عمل نہایت وسیع تھا۔ مبدا فیض سے انھیں غیر معمولی ذہانت اور نگاہِ دوررس حاصل ہوئی تھی۔ وہ طباع بھی تھے اور علم کے شیدائی بھی۔ انھوں نے صرف عربی زبان وادب ہی میں کامل دست گاہ حاصل نہیں کی تھی بلکہ تمام مشرقی علوم سے شغف رکھتے تھے۔ انگریزی زبان وادب سے واقفیت کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفہ اور افکار پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ صحافت اور سیاست کے مردِ میدان ہونے کے باعث زمانے کے پیچ وخم سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ملکی وسیاسی مصلحتوں کی جو تفہیم مولانا کو تھی شاید ہی کسی اور رہنما کو رہی ہو۔ وہ تعلیمی اُمور سے بھی آگاہ تھے۔ اسی سبب گاندھی جی نے اُنھیں آزاد ہندوستان کے تعلیمی مستقبل کی رہنمائی کے لیے سب سے موزوں شخصیت قرار دیا تھا۔

مولانا آزاد نے اپنی زندگی کے آخری گیارہ برس آزاد ہندوستان کے تعلیمی نظام کی تشکیل و تنظیم کے مسائل حل کرنے میں صرف کیے۔ اُن کی رہنمائی میں ہمارے نظام تعلیم پر حقیقی قومی رنگ چڑھا اور مختلف النوع ثقافتوں کے حامل ملک کے تقاضوں کے مطابق ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں۔ وزیر تعلیم کے عہدے پر جلوہ افروز ہونا نہ مولانا آزاد کی مجبوری تھی اور نہ ان کی موقع پرستی بلکہ انھوں نے اپنے مزاج کی مناسبت سے قومی خدمت کی یہ راہ اختیار کی تھی۔ وہ اس عہدے پر متمکن ہونے سے قبل بھی اکثر اپنی تحریروں میں تعلیمی خیالات کا اظہار کرچکے تھے۔ مثلاً تذکرہ میں انھوں نے لکھا تھا:

''انسان کے لیے معیارِ شرف، جو ہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم وعمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرورِ باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے سارے خاندان کو لوگ پہچانیں نہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں۔''

قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے ہندوستانی معاشرے میں خاندانی عزت وتوقیر کے سائے سب سے بلند قامت نظر آتے ہیں۔ ان ادوار میں شرف وعزت کا معیار ذاتی اہلیت وقابلیت نہیں بلکہ کسی نامی گرامی خاندان یا اعلیٰ نسل سے وابستگی ہے۔ مولانا آزاد کا تاریخی شعور اس معیار کے تباہ کن اثرات سے واقف کرا رہا تھا۔ اسی لیے انھوں نے اسلاف کی روایت پارینہ اور نسب کے باطل غرور کے برعکس جوہر ذاتی اور تعلیم وعمل کو معیارِ شرف قرار دیا۔ غبارِ خاطر کے بعض خطوط میں بھی ان کی یہی فکر کارفرما نظر آتی ہے۔ 12 اکتوبر 1942 کے خط میں لکھتے ہیں کہ

''انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں... بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد وپیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کرسکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا... عقائد کی بنیاد علم ونظر پر ہونی چاہیے۔ تقلید وتوارث پر کیوں ہو۔''

اس طرح کے بیانات سے مولانا آزاد کے ترقی پسندانہ رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ مولانا کا بچپن خاندانی افتخار وامتیاز کے گہوارے میں گزرا تھا۔ اس کے باوجود وہ تقلید وتوارث کے بجائے علم ونظر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ 1947 میں وزیر تعلیم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد 18 فروری کی پریس کانفرنس میں انھوں نے تعلیم اور قومی تشکیل کے سلسلے میں چند اہم اور بنیادی اُمور کی طرف توجہ دلائی اس موقع پر انھوں نے مذہبی تعلیم کے مسئلے پر بھی اظہار خیال کیا تھا۔ انھوں نے زور دے کر کہا تھا کہ مذہبی تعلیم کا مقصد وسیع النظری، رواداری اور انسان دوستی ہونا چاہیے۔ مذہب کے متعلق مولانا کا یہی احساس تھا جس نے انھیں مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ محبِّ وطن اور سچا قوم پرست بنایا۔ ان کا ذہن ہمیشہ ہر قسم کی تنگ نظری اور تعصب سے پاک رہا۔ مذہب کی حقیقی روح کا عرفان انھیں حاصل ہو چکا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ نونہالانِ وطن کے دلوں کو بھی اس حقیقت سے آشنا کرائیں تاکہ ملکی فضا کسی طرح مسموم نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ تھی کہ سچے دین کی پیروی میں پیدا ہونے والے یقین اور اعتقاد کو وہ تعلیم کا اساسی عنصر سمجھتے

تھے۔ وہ حقیقی مذہب کے قائل تھے جو تقلید کے بجائے تحقیق پر مبنی ہوتا ہے۔ اُن کے نزدیک تحقیق پر مبنی مذہب علم کے منافی نہیں ہوتا بلکہ اس سے مطابقت پیدا کرتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''علم اور مذہب کی جتنی نزاع ہے فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے۔ یہ مدعیانِ علم کی خامکاریوں اور مدعیانِ مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے۔ حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ ملتے ہیں الگ الگ راستوں سے مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر۔''

مولانا کی فکر میں مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی اور وہ اسے انسانی زندگی کا ایک لازمی عنصر قرار دیتے ہیں۔ مدعیانِ مذہب کے منفی اور گمراہ کن رجحانات کے برعکس وہ مذہب کی مثبت حیثیت کے قائل ہیں۔ انھوں نے مختلف مذاہب کے اتحاد کے سلسلے میں حیاتِ انسانی کے تحفظ کی خاطر اپنی پراثر تحریروں میں اظہارِ خیال فرمایا ہے:

''دنیا کے تمام مذاہب حق پر ہیں لیکن دنیا کے پیروانِ مذہب حق سے منحرف ہو گئے ہیں۔ جس قدر بھی گمراہی ہے، جس قدر بھی اختلاف ہے، پیروانِ مذہب کے فعل و عمل پر ہے، مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔ اگر پیروانِ مذہب کا انحراف دور ہو جائے تو ہر جماعت کے پاس وہ چیز باقی رہ جائے گی جو حق ہے۔''

یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں انسانی عقیدوں کی اتنی کثرت نہیں ہے جتنی ہندوستان میں۔ ظاہر ہے کہ مذاہب کی اس رنگارنگی میں متحدہ قومیت کے استحکام اور تقویت کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ اور مشکل الحل ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد کو اس پیچیدگی کا بخوبی احساس تھا۔ انھوں نے متحدہ قومیت کی اہمیت اور اس میں تمام فرقوں کی شمولیت پر بار بار اصرار کیا ہے۔ قومی اتحاد پر مولانا کا اعتقاد غیر متزلزل تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر جماعت اپنے عقائد پر قائم رہتے ہوئے ملک کی ترقی میں معاون بنے۔ متحدہ قومیت کے ضمن میں ان کا یہ بیان حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے کہ

''ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی بن چکے ہیں۔'' (خطباتِ آزاد مرتبہ مالک رام)

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ یہ سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے تو ہم اس فیصلے کو کس طرح بدل سکتے ہیں۔ اگر ہم نے اس فیصلے کو ناقابلِ قبول قرار دیا تو اس سے ملک کے اتحاد کو نقصان پہنچے گا۔ اس لیے جو سانچا بن چکا ہے اب وہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے نفرت کے بجائے اس پر توجہ دیں کہ ملک میں جمہوریت، بہرصورت قائم رہے۔ ہمیں مکمل عزم کے ساتھ اس مقصد کو پورا کرنا چاہیے تاکہ متحدہ قومیت کے تصور کو تقویت مل سکے۔

مولانا آزاد کے نزدیک مذہب، فلسفہ، سائنس اور سیاست، سب کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انسان اپنی زندگی کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالے جو تمام تفریقوں کو مٹا کر انھیں انسانیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچا دے۔ مولانا آزاد کی سعی و کاوش سیاست سے زیادہ صالح قدروں کی تبلیغ واشاعت اور کردار کی مثبت تشکیل تھی۔ ان کا خیال تھا کہ متحدہ قومیت کا تصور اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب ہم وطنوں میں رواداری، جرأت، سچائی، محنت، ڈسپلن، مل جل کر کام کرنے اور ایثار کی صفات پیدا ہو جائیں۔ اس سلسلے میں ان کا بیان ہے:

''ہماری فتح مندی کی تمام بنیاد چار سچائیوں پر مشتمل ہے۔ میں اس وقت بھی اس ملک کے ہر باشندے کو صرف انھیں کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ (1) ہندو مسلم کا کامل اتفاق۔ (2) امن (3) نظم (4) قربانی اور اس کی استقامت''۔ (فرموداتِ آزاد، ص 203)

مولانا کے افکار و نظریات کی اس وسعت اور کشادگی کے سبب ان کا تعلیمی تصور بھی عالمگیر انسانیت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ زمین پر بسنے والوں کے جذبات و احساسات میں بڑی حد تک یکسانیت ہے اور مقامی رنگ کی آمیزش اور ماحول کے امتیازات کو قبول کرنے کے باوجود فرزندانِ آدم کی خلقت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ یونیسکو کی جانب سے دسمبر 1951 میں منعقدہ سیمنار کے افتتاحی خطبے میں مولانا آزاد کے ان خیالات پر بہ صراحت نظر کی جا سکتی ہے۔ وہ کسی خطۂ زمین یا رنگ و نسل کے انسان کی تخصیص نہیں کرتے۔ وہ انسانی فطرت کی بوقلمونی کے باوجود اس کے خمیر کی یک رنگی میں مکمل یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے فنونِ لطیفہ کی تعلیمی اہمیت کا اسی لیے اعتراف کیا ہے کہ ان کے خیال میں یہ فنون مختلف ملکوں کے مابین امن اور خیرسگالی کے پیغام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی بحث قطعی فضول ہے۔ حقیقی فن افراد کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا محتاج نہیں ہوتا۔ معیاری نمونۂ فن حقیقی تعلیم کا مؤثر ذریعہ ہوتا ہے۔ اس سے جذبات کی تہذیب اور ادراک و تخیل کی تربیت ہوتی ہے۔ 1949 میں فنونِ لطیفہ کی کل ہند کانفرنس میں افتتاحی خطبہ دیتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا تھا کہ:

''ایک سماج کی صحت مندی اور اعتدال پسندی کا اظہار اس کے افراد میں ذوقِ لطیف کی ترویج سے ہوا کرتا ہے۔''

ان کے نزدیک تعلیم محض ذہنی قویٰ کی بیداری کا نام نہیں ہے بلکہ جذباتی آسودگی، جسمانی ترقی، تہذیب و شائستگی غرض اس کے ذریعے شخصیت کے تمام پہلوؤں کی تربیت ضروری ہے۔ شخصیت کی نشو و نما کے لیے مولانا مصوری، موسیقی، رقاصی، سنگ تراشی، ڈراما تمام فنون کو اہم خیال کرتے تھے۔ فنونِ لطیفہ کے تئیں ان کی دلچسپی کا اظہار ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی اور سنگیت ناٹک اکادمی کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے میدان میں مولانا آزاد نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ طلبا کی اہلیت و قابلیت کی سطح کو بلند کیا جائے۔ ثانوی تعلیم کے تئیں ان کا نظریہ تھا کہ یہ تکمیلِ علم کی ایک ایسی منزل قرار پائے جسے طے کرنے کے بعد زیادہ طلبا عملی زندگی میں قدم رکھ سکیں۔ ان کی تجویز تھی کہ ثانوی تعلیم کے لیے ہمارے اسکول کثیر المقاصد ہوں جو نونہالانِ قوم کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو سکیں اور انھیں مکمل زندگی گزارنے کے اہل بنائیں۔ وہ ہر شہری کی تعلیم کے حق میں تھے اور اسے پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ موجودہ حکومت نے پارلیمنٹ کے ایک بل کے ذریعے ہر بچے کے تعلیمی حق کو اب تسلیم کیا ہے۔ یہ دراصل مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات کی صدائے بازگشت ہے۔ ہر بچے کے تعلیمی حق کو تسلیم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا آزاد کے افکار و نظریات کی معنویت آج بھی برقرار ہے اس لیے ہمیں آج پہلے سے کہیں زیادہ ان کے افکار کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

■

Dr. Deewan Hannan Khan, Dept of Education in Languages, NCERT, New Delhi - 110016

فاصلاتی نظامِ تعلیم کے لیے خود اکتسابی مواد کی تیاری: ایک جائزہ

عرفان عالم

عصر حاضر میں فاصلاتی نظام تعلیم پوری دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنا چکا ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم سے مُراد ایک ایسا نظام تعلیم جس میں طلبا اور اساتذہ کے درمیان ایک طرح کی زمانی و مکانی دوری قائم رہتی ہے، حالانکہ جدید ٹیکنالوجی نے اِن دوریوں کو یکسر کم کر دیا ہے، لیکن ترقی پزیر ممالک میں یہ بعد ابھی تک کسی نہ کسی صورت میں برقرار ہے، اس لیے ترقی پزیر ممالک میں فاصلاتی نظام تعلیم کے پروگراموں کو فعال اور مضبوط بنانے میں 'خود اکتسابی مواد' (Self Instructional Material [SIM]) نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ خود اکتسابی مواد [SIM] فاصلاتی نظام تعلیم کے پروگراموں کی روح ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم کے پروگراموں کو موثر بنانے میں خود اکتسابی مواد کافی کار آمد ثابت ہو رہا ہے، کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو طالب علم کو ٹھوس صورت میں دستیاب رہتا ہے اور ہر ادارہ اپنے اپنے طریقے سے خود اکتسابی مواد تیار کرنے میں خون جگر صرف کرتا ہے تاکہ اُمیدوار صحیح معنوں میں تعلیم سے بہرہ مند ہو جائے۔ حالانکہ فاصلاتی تعلیمی ادارے اپنے اپنے طریقے سے طلبا کے لیے اپنے اپنے مراکز پر تجربہ کار اساتذہ کے ذریعے ذاتی رابطہ پروگراموں (Personal Contact Programme) کا بھی اہتمام بھی کراتے ہیں۔

فاصلاتی نظام تعلیم سے وابستہ ہندوستان کی دو بڑی جامعیات اِگنو (IGNOU) اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) اپنے طلبا کے لیے ہر اتوار کو کلاسس مختص رکھتی ہیں اور اکثر ریاستی جامعات سے وابستہ فاصلاتی نظام تعلیم کے ادارے سال میں دو مرتبہ تجربہ کار اساتذہ کے ذریعے نظامت (Directorate) اور تعلیمی مراکز (Study Centers) پر ذاتی رابطہ پروگرام (Personal Contact Programme) کا اہتمام کراتے ہیں، جس کے ذریعے طلبا کو نصاب کے حوالے سے واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے، لیکن یہ پروگرام کسی بھی صورت میں رسمی اور با قاعدہ جماعتوں کے متبال نہیں کیونکہ ان قلیل مدتی رابطہ پروگراموں میں پورے نصاب کو بذریعہ درس پڑھایا نہیں جاسکتا، بلکہ یہ ایک طرح کا مشاورتی پروگرام ہے، اس پروگرام میں طلبا کو لازماً شمولیت کرنی ہوتی ہے لیکن اُس پر طرہ یہ کہ بہت سارے طلبا اپنے ذاتی مسائل کی وجہ سے اِن جماعتوں میں شرکت نہیں کر پاتے اور فاصلاتی نظام تعلیم کا اصول یہ ہے کہ طلبا کو تعلیم حاصل کرنے کا کھُلا ماحول میسر ہو اس لئے خود اکتسابی مواد کو اس طریقے سے لکھنا یا مُرتب کرنا چاہیے، تاکہ طلبا کو مواد کا مطالعہ کرتے وقت یوں محسوس ہو کہ جیسے وہ جماعت میں بیٹھ کر اُستاد سے درس لے رہے ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ خود اکتسابی مواد کو نصاب کے مطابق مختلف اکائیوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے اور ہر اکائی درج ذیل طریقے سے اس طرح منقسم کی جانی چاہیے، تاکہ طلبا گھر بیٹھے جماعت کے لطف سے بہرہ مند ہو جائے۔

(جدول الف)		(جدول ب)	
اکائی کے اجزا		اکائی کے اجزا	
1.0	تعارف	1.1	انتخاب متن
1.1	اغراض و مقاصد	1.2	تجزیہ متن
1.2	اصل موضوع	1.3	اغراض و مقاصد
1.2	ذیلی موضوعات	1.4	اصل موضوع
1.3	ذاتی جانچ	1.4	ذیلی موضوعات
1.4	خلاصہ	1.5	ذاتی جانچ
1.5	گھریلو مشق/نمونہ امتحانی سوالات	1.6	غلاصہ
1.6	فرہنگ	1.7	گھریلو مشق/ نمونہ امتحانی سوالات
1.7	سفارش کردہ کتابیں	1.8	فرہنگ
1.8	ردعمل	1.9	سفارش کردہ کتابیں
		1.10	ردعمل

یہاں یہ باور کرانا مقصود ہے، کہ جدول الف اکائی کے اجزا میں اُس وقت ترمیم ہونی چاہیے، جہاں کسی سبق کے ساتھ متن بھی شامل ہو۔

جہاں تک دوسرے اور چوتھے پرچے کی پہلی اکائیوں کا تعلق ہے، پہلی اکائیوں میں غزل کی صنفی شناخت، غزل کی مقبولیت، اُردو غزل کا ارتقا، غزل پر اعتراضات، ولی کی غزل گوئی اور حصہ نثر میں مختصر افسانہ - صنفی شناخت، اُردو افسانے کا آغاز و ارتقا، پریم چند اور ان کے ہم عصر افسانہ نگار، ترقی پسند افسانہ، نفسیاتی افسانہ، اُردو افسانہ اور فسادات، جدید اُردو افسانہ وغیرہ وغیرہ بالترتیب اِن عنوانات کے لیے جدول الف کا طریقہ صحیح ہے۔ لیکن جب ہم اسی نصاب کے دوسرے حصے پر جائیں گے، تو دوسری اکائیوں میں

میر، ناسخ، آتش، غالب، اقبال، فیض، فراق، ناصر، حالی، اقبال، راشد، اختر الایمان اور حصہ نثر میں پریم چند کفن، کرشن چندر۔ مہالکشمی کا پُل، سعادت حسن منٹو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، راجندر سنگھ بیدی، لاجونتی، قرۃ العین حیدر، یہ غازی یہ ترے پُر اسرار بندے، انتظار حسین، کایا کلپ، اقبال مجید، دو بھیگے ہوئے لوگ وغیرہ وغیرہ عنوانات اور اُن کا منتخب متن دیا گیا ہے۔ یہاں پر نقشہ الف میں

کسی حد تک تبدیلی کرنی پڑے گی، جو نقشہ ب میں مختصر اضافے کے ساتھ کچھ یوں ہے۔

یہاں پر متذکرہ بالا تمام اجزا کی الگ الگ سے وضاحت کرنا مناسب ہے، تاکہ طلبا اور مصنّفین پر ہر بات عیاں ہو جائے کہ کیونکر یہ طریقہ خود اکتسابی مواد کی تیاری کے لیے لازمی بن جاتا ہے۔

طالب علموں کے لیے

1. جو طلبا اس نظامِ تعلیم کے لیے نئے ہوں وہ اس طریقہ تعلیم سے روشناس ہو جائیں۔

2 تاکہ طلبا سبق کا صحیح طریقے سے مطالعہ کرنے میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کریں۔

3. اکائی کے سبھی اجزا کی وضاحت کے بعد آپ کو یوں محسوس ہو جائے جیسے آپ اس سبق کا مطالعہ گھر بیٹھے نہیں بلکہ کسی جماعت میں بذریعہ درس لے رہے ہوں۔

مصنّفین و مرتبین کے لیے

1. تاکہ آپ خود اکتسابی مواد کو اس طریقے سے لکھنے میں ماہر ہو جائیں کہ طالب علم مواد پڑھ کر یقینی طور محظوظ ہوں۔

2. اجزا کے مطالعے کے بعد اگر آپ کے ذہن میں کوئی سوال اٹھے جس سے مواد اور بہتر بن جائے۔

3. اکائی کے سبھی اجزا کی وضاحت کے بعد آپ کو یوں محسوس ہو کہ اگر اس میں کسی قسم کی خامی رہ گئی ہو تو اُس کو سامنے لایا جائے تاکہ باقی لکھنے والوں کی خامیاں دور ہو سکیں۔

یہاں میں یہ بات دہرانا چاہتا ہوں کہ ہر اکائی کو مزید اجزا میں منقسم کرنے کا مقصد سبق کو جاذبِ نظر اور دلچسپ بنانا ہے اور ہر اکائی کی شروعات 'تعارف' سے کی گئی ہے۔

1.0 **تعارف** [Introduction] : تعارف دراصل اکائی کے ابتدائیہ کو کہا جاتا ہے، جو کہ تقریباً ایک 'پیراگراف' یا زیادہ سے زیادہ پچاس '50' الفاظ پر مشتمل ہونا چاہیے۔ یہ بات یاد رہے کہ تعارف کا فن اس کے اجمال میں پوشیدہ ہے۔ تعارف کو پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہونا چاہیے کہ اس سبق کی نوعیت کیا ہے۔ تعارف دراصل اس سبق کے بارے میں معلومات کا خزانہ اپنے اندر سموئے ہوتا ہے اور اس کی دلکشی طالب علم کے اندر مطالعے کی دلچسپی پیدا کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے۔ تعارف اس قدر سحر انگیز ہو، کہ طالب علم میں باقی ماندہ سبق کو پڑنے کی بے قراری پیدا ہو جائے۔

1.1 **انتخاب متن** : یہاں پر راقم الحروف ایک چھوٹی سی کہانی سنانا چاہتا ہے" یہ اُن دنوں کی بات ہے جب راقم کشمیر یونیورسٹی کے مرکز فاصلاتی تعلیم سے ایم اے اردو کر رہا تھا۔ اور ہمارے نصاب میں قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' بھی شامل تھا۔ چونکہ ناول طویل ہونے کے ساتھ ساتھ دستیاب بھی نہیں تھا، اِس لیے میں اِس ناول کا تنقیدی جائزہ یا تجزیہ تلاش کرنے میں مصروف عمل تھا، اِس سلسلے میں میں نے بہت سارے لوگوں سے اِس بارے میں پوچھا کہ ناول کا تنقیدی جائزہ کہاں سے ملے گا، مجھے اب بھی یاد ہے اِسی دوران مجھے ایک اور طالب علم روف راحت سے ملاقات ہوئی، جب میں نے اُن سے دریافت کیا تو انھوں نے جواباً کہا اچھا یہ رہتا اگر آپ ناول کے اصل متن کا مطالعہ کرتے اور اس کا تنقیدی جائزہ خود لکھتے مجھے اس حقیقت نے چونکا دیا اور میری آنکھیں کھل گئیں"۔

میری اس کہانی کی طرح تقریباً اٹھانوے فیصد طالب علم ہیں جو بنیادی متن سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں اور ہمیشہ رسمی مسالے (Notes) پر یقین رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے اکثر طلبا نصاب کی اصل حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ لکھتے وقت خود اکتسابی مواد میں 'انتخابِ متن' بھی شامل کریں۔ اس حصے کا نام انتخابی متن اِس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ ہر جگہ پورے متن کو شامل کرنا ممکن نہیں۔ جہاں جہاں پورے متن کو شامل کرنا مناسب ہو سکتا ہے وہاں پورے کا پورا متن شامل کرنا چاہیے جیسے رباعی، قطعات، رپوتاژ، انشائیہ، افسانہ، غزل وغیرہ اور جہاں پر ہم پورا متن شامل نہیں کر سکتے جیسے ناول، ڈرامہ، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ یہاں پر چاہیے کہ متن کا ایسا انتخاب شامل کریں کہ طالب علم کے اندر پورے متن کو پڑھنے کی بے چینی پیدا ہو جائے اور وہ متن کو ڈھونڈ کر پڑھیں۔

1.2 **تجزیہ متن** : حالانکہ صحیح معنوں میں اس حصے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اصل موضوع میں مکمل تجزیہ شامل رہتا ہے۔ اب یہ حصہ اِس لیے شامل مواد کرنا چاہیے کہ طالب علموں کو ذہنی سکون میسر رہے۔ یہاں پر متن کا مختصر تجزیہ شامل ہونا چاہیے اور اِس حصے میں صرف تخلیق کے متعلق خوبصورت طریقے سے اختصاراً بات ہونی چاہیے نہ کہ تخلیق کار کے متعلق اور تخلیق کی بھی اس طریقے سے کہ طالب علم تخلیق اور تخلیق کار کی پوری وضاحت کو پانے کے لیے بے تاب رہے اور یوں اصل موضوع کو پڑھنے کی اس کی چاہت میں اور اضافہ ہونا چاہیے۔

1.3 **اغراض و مقاصد** [Objectives] : تعارف کو پڑھنے کے بعد طالب علم کے ذہن میں اس اکائی کو پڑھنے کے اغراض و مقاصد واضح ہو جاتے ہیں، اس طرح کچھ سوالات جنم لیتے ہیں کہ مذکورہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے اور یوں مطالعے کی دلچسپی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اس لیے تعارف کے فوراً بعد اس طریقے سے سوالات وضع کریں کہ طالب علم کو جماعت کا ماحول میسر ہو۔

1.4 **اصل موضوع** : اکائی کے اس حصے کو ہم اگر اکائی کی جان کہیں گے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ حصہ معلومات کا خزانہ اپنے اندر سموئے ہوتا ہے۔ اس حصے کو ہم اکائی کا سب سے اہم حصہ بھی کہتے ہیں۔ یہ اکائی کا طویل حصہ ہوتا ہے، اس لیے لکھتے وقت احتیاط برتنا چاہیے کہ طوالت طالب علموں میں اکتاہٹ نہ پیدا کر دے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ الفاظ کا شوق استعمال ہو اور زبان و بیان میں سادگی نظر آئے۔ مصنف یہ خیال میں رکھے کہ اُس کا قاری دراصل ایک نو آموز طالب علم ہے اور یہ بھی خیال رکھیں کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم سے وابستہ طلبا کی درجہ بندی تین حصوں میں کی جانی چاہیے۔

1. فاصلاتی نظامِ تعلیم سے وابستہ اکثر وہی طلبا ہوتے ہیں، جو رسمی تعلیم کے ذریعے نشستیں حاصل کرنے میں رہ جاتے ہیں، یہ طلبا تعلیمی میدان میں کسی حد تک کمزور بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر ان کے اندر پڑھنے کا زبردست شوق ہوتا ہے۔

2. بہت سارے طلبا رسمی تعلیم میں اپنا پسندیدہ شعبہ یا مضمون منتخب کرتے ہیں، لیکن کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے اور فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے وہ مضمون میسر نہ ہونے کی وجہ سے ناپسندگی کے باوجود کسی اور مضمون کا انتخاب کرتے ہیں۔

3. وہ لوگ جو زبردست قابل اور محنتی ہونے کے باوجود، معاشی تنگدستی، گھریلو مصروفیت، جغرافیائی حالات، تعلیمی پسماندگی وغیرہ کی وجہ سے آگے پڑھ نہ پائے، لیکن اَب کسی نہ کسی طرح ایک طویل عرصے بعد پھر سے علم کے سمندر میں غوطہ زن ہونے آئے ہیں۔

4. وہ لوگ جو سرکاری یا غیر سرکاری ملازمتوں سے وابستہ ہیں اور دفتری معاملات کی بنا پر سند حاصل کرنا اِن کے لیے لازمی بن گیا ہو اور اَب اسی وجہ سے تعلیم کی طرف راغب ہوئے ہیں۔

درج بالا دلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنّفین و مرتبین کو چاہیے کہ وہ اپنے ذہن کے دریچوں کو کھول کر خود اکتسابی مواد طلبا کے لیے تیار کریں اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ طلبا کی پڑھائی کو دلچسپ بنانے کے لیے اس حصے یعنی اصل موضوع کو بھی 'ذیلی موضوعات' (Sub-titles) کے ذریعے کئی حصوں میں منقسم کیا جانا چاہیے۔ 'ذیلی موضوعات' کو لکھتے وقت یہ خیال رکھیں کہ

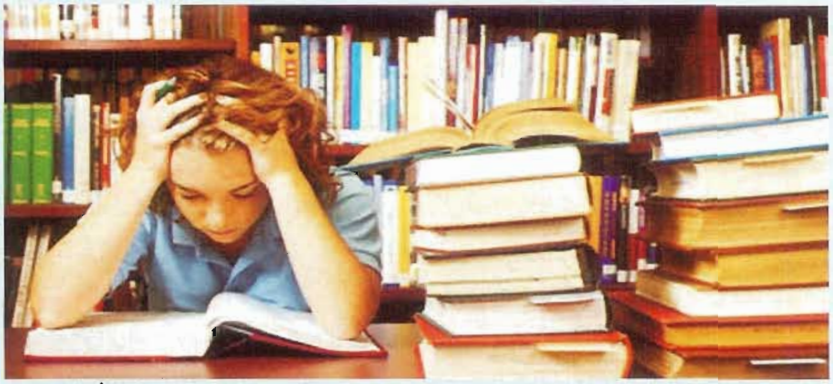

ہر موضوع کا الگ نام رکھیں، مثلاً اگر ہمارے پاس 'غالب کی شخصیت' کا موضوع دستیاب ہو اِس مضمون کو اصل موضوع میں لکھتے لکھتے 'ذیلی موضوعات' کے ذریعے ہم اِس طرح منقسم کر سکتے ہیں (1) غالب کا ابتدائی دور (2) لڑکپن (3) آگرہ اور دلی کا عہد (4) غالب اور غدر (5) غالب اور پنشن (6) کلامِ غالب کی انفرادیت (7) آخری ایام وغیرہ جیسے ذیلی موضوعات لکھنے کے بعد ایک واضح، معلوماتی اور منفرد موضوع سامنے آسکتا ہے اور یوں اصل موضوع کی طوالت سے تنگ آ کر طالب علموں پر بھی بے لطفی: بے لفظی یا پھر طبیعت کی بیزاری سے اکتاہٹ (Boredom) طاری نہ ہو پائے گی۔

1.5 ذاتی جانچ: جس طرح اُستاد جماعت میں دورانِ درس طلبا سے سوالات وغیرہ پوچھتے رہتے ہیں، من وعن اکائی کے اس حصے 'ذاتی جانچ' کے ذریعے بھی طلبا سے اپنے سبق کے متعلق بحث، تجزیہ وغیرہ جاری رہتی ہے، تاکہ طلبا ذہنی طور پر بیدار رہیں اور سبق کے مطالعے سے انصاف ہو پائے۔

1.6 خلاصہ [Extract]: اکائی کا مختصر جائزہ، جس میں اکائی کے تمام پہلو کھُل کر سامنے آتے ہیں 'خلاصہ' کہلاتا ہے، خلاصے کا فن تعارف کی طرح اس کا اجمال ہے، جس کی وجہ سے اس مختصر تحریر میں اکائی کا پورا خاکہ طالب علم کے سامنے آجاتا ہے، یوں طالب علم کو سبق دہرانے کا بھی موقع فراہم ہوجاتا ہے۔

1.7 گھریلو مشق [Home work]: اکائی کے اس حصے کو 'نمونہ امتحانی سوالات' کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اکائی کے اس حصے میں ایسے سوالات مشتہر کیے جاتے ہیں، جسے تجربہ کار اساتذہ امتحانی پرچوں کو مدنظر رکھ کر مرتب کرتے ہیں اکائی کے اس حصے میں پوچھے گئے سوالات کا حل دراصل اکائی کے اجزا میں پوشیدہ ہوتا ہے، جسے طلبا اکائی میں تلاش کر کے امتحانات کے لیے تیار رہتے ہیں۔

1.8 فرہنگ [Glossary]: اکائی کے اس جز میں مشکل الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں، یہ حصہ دراصل طلبا میں لغت نگاری کا فہم پیدا کرنے کی غرض سے 'اکائی' میں شامل کیا جاتا ہے، جہاں تک ممکن ہو سکے آپ اپنے پاس بھی ایک اُردو لغت ضرور رکھیں، تاکہ مشکل الفاظ کے وقت اُس کا استعمال کر سکیں اور یاد رکھیں کسی بھی لفظ کا متبادل تلاش کرتے وقت ایسا لفظ اختیار کریں جسے اِس لفظ کے مشتقات واضح ہو سکیں۔

1.9 سفارش کردہ کتابیں [Recommended Books]: آپ کے ذہن میں یہ بات عیاں رہنی چاہیے کہ آپ تعلیم کی ایک اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے جارہے ہیں، اس لیے آپ کو روایتی مسالا جس کو عرفِ عام میں 'نوٹس' وغیرہ کہا جاتا ہے سے مکمل طور پر گریز کرنا چاہیے اور خالی 'خود اکتسابی مواد [SIM]' تک ہی محدود بھی نہیں رہنا چاہیے بلکہ ''سفارش کردہ کتابوں میں درج کتابوں کے علاوہ باقی کتابوں سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ ہر مرکز یا نظامت فاصلاتی تعلیم کے پاس اپنا ایک بڑا کتب خانہ موجود ہوتا ہے، اس کے علاوہ آپ دانش گاہوں کے کتب خانوں کے علاوہ ریاستی یا ملکی سطح پر چلائے جانے والے جیسے ریاستی، ضلعی، تحصیلی کتب خانوں اور قومی کونسل (NCPUL) اور اس جیسے اداروں کے موبائل کتب خانوں سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ معلومات بھی دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے ہر تعلیمی مرکز (Study Centre) پر آپ کے مطالعے کے لیے کتابیں فراہم کی جاتی ہیں، جہاں زرخیز مواد کتابوں کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ کتب خانوں میں مواد کو نقل کرنے کے لیے آپ فوٹو سٹیٹ (Xerox) کی خدمات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

1.10 ردعمل [Feedback]: جو خود اکتسابی مواد [SIM] کی ہر اکائی کے اجزا کا اختتام 'ردعمل' پر کیا جانا چاہیے۔ ردعمل اکائی کا وہ حصہ ہے، جس کے ذریعے طلبا اکائی کے متعلق اپنی تجاویز ظاہر کر سکتے ہیں، طلبا کی تجاویز کا احترام کرنا چاہیے، یہ بات ذہن میں رکھیں آپ صرف ردعمل کے ذریعے مواد کی تعریف یا صرف مواد کی تنقید کر کے اپنا اور تدریسی عملے کا قیمتی وقت ضائع نہ کریں، بلکہ تعمیری کردار ادا کرتے ہوئے کوتاہیوں کو ظاہر کر کے ایک اچھے طالب علم ہونے کا ثبوت دیں، آپ اپنا 'ردعمل' بذریعہ ڈاک یا پھر انٹرنیٹ کے ذریعے تدریسی عملے کے دیے گئے پتے پر بھیج سکتے ہیں تدریسی عملہ آپ کی تجاویز کا احترام کرتے ہوئے اپنی خامیوں کو آنے والی نئی اشاعت میں دور کرنے کی کوشش کرے گا، یوں نئے طلبا تک اور بہتر مواد [SIM] پہنچے گا۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ 'اکائی کے اجزا' کے متعلق متذکرہ بالا باتوں کے مطالعے کے بعد آپ اس پر عمل کریں گے۔

□ خود اکتسابی مواد تیار ہونے کے بعد جب یہ کتابی شکل میں طالب علموں تک پہنچے تو انھیں چاہیے کہ وہ درج ذیل ہدایت پر عمل کریں تاکہ مطالعے کا صحیح حق ادا ہو پائے۔

□ اپنے اس خود اکتسابی مواد [SIM] کو حاصل کرنے کے بعد فوراً اس کا مطالعہ شروع کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ مواد حاصل ہونے کے بعد یہ گھر کی الماریوں میں پڑا رہے۔

□ جو کچھ پڑھیں، اس طریقے سے پڑھیں کہ اُس کی تصویر آپ کے سامنے عیاں ہو جائے اور آپ اس میں اس قدر منہمک ہو جائیں کہ اس کی دلچسپی آپ کے اندر بے چینی پیدا کردے۔

□ پڑھتے وقت کاہلی سے گریز کریں، مطالعہ اطمینان سے کریں اور زیادہ سے زیادہ وقت مطالعے کے لیے نکالیں، اگر کہیں جانا ہو، تو مواد [SIM] کو ساتھ اُٹھائیں، تاکہ آپ اپنا قیمتی وقت اسی پر صرف کریں، جو کچھ پڑھیں اس کو دہرائیں، پڑھنے سے جی نہیں چُرانا چاہیے۔

□ پڑھنے سے پہلے سوچ لیں، آج آپ کو کیا پڑھنا ہے، کیوں پڑھنا ہے اور کیسے پڑھنا ہے، پڑھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنا ایک اوقات نامہ (Time Table) بنا کر اِسے کمرے کی دیوار پر آویزاں رکھیں یا پھر اپنے پاس، تاکہ آپ اپنے قیمتی وقت کو اپنی پڑھائی میں صحیح طریقے سے صرف کر سکیں۔

□ صحیح مطالعہ ہر طالب علم کے لیے ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، ہمیشہ گہرائی اور تہہ داری سے مطالعہ کریں، تاکہ کل امتحانات میں آپ کے جوابات قدر پیما (Evaluator) کو متاثر کریں۔

■

Irfan Alam, Asst. Prof. Room No. 202, Nizamate-Faslati Taleem, Kashmir University, Hazratbal, Srinagar - 190006

منی بھوشن کمار

مہاتما گاندھی کے سوراجی تصورات

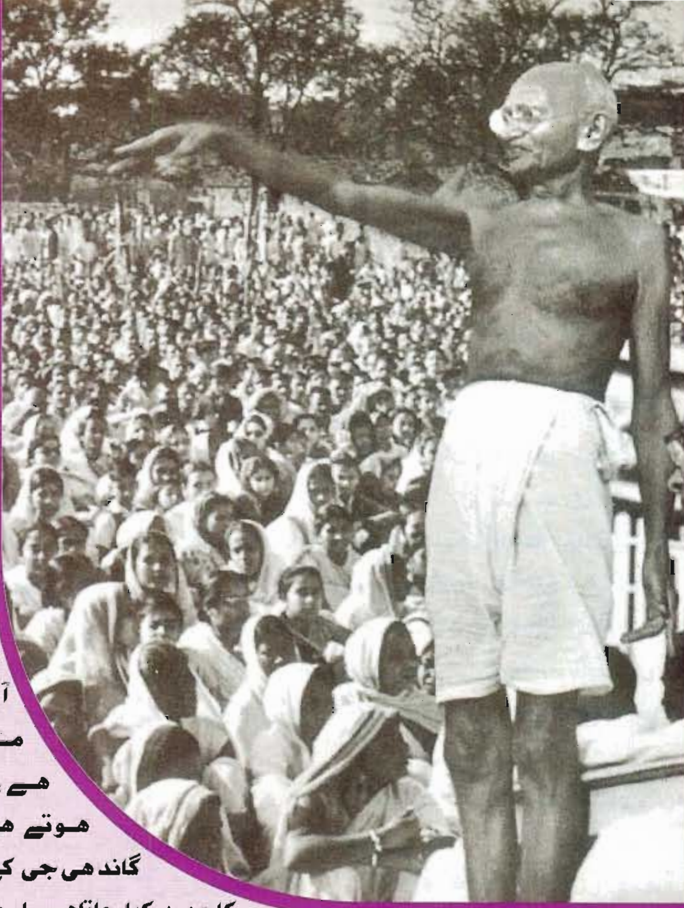

مہاتما گاندھی کا یوم ولادت ,یوم جمہوریت اور یوم آزادی کے بعد تیسرے قومی تہوار کی طرح ہر سال منایا جاتا ہے ۔ قوم اس روز گاندھی جی کو یاد کرتی ہے ،ان کے نام پر سماجی فلاح کے نئے منصوبے شروع ہوتے ہیں اور کئی طرح کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں جن میں گاندھی جی کے آدرشوں ، سچّائی اور عدم تشدد کے راستے پر چلنے کا عہد کیا جاتاہے ۔ اردو سماج بھی بابائے قوم کو خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کے فکرو فلسفے کی تفہیم و تبلیغ میں کسی سے پیچھے نہیں رہا ہے ۔ اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ہم اردو والے گاندھی جی کو اردو زبان کے بھی خواہ اور اس کے رسم خط کی بقاپر اصرار کو اپنے ’بھاشائی نظریات‘ کا جزو بنانے والے دانش ور کے طور پر کم یاد کرتے ہیں۔ گاندھی جی نے جس طرح اپنی فکر کو ’لسانی تعصبات‘ سے پاک رکھ کر ہندوستان کی اس عظیم زبان کی اہمیت کا اعتراف کیا تھااور اپنے اردو داں ہم خیالوں کے ساتھ اردو میں ہی خط و کتابت کرنے کے خیال سے از خود اردو لکھنا پڑھنا سیکھا تھا اس کی دوسری مثال ان کے ہم عصر قومی رہنمائوں میں مشکل سے ملے گی۔ مہاتماگاندھی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کئی اردو خط جو اُن کی اردو خط وکتابت کے سیکڑوں نمونوں کے ساتھ ، گاندھی جی سے متعلق میوزیموں اوردھلی میں راج گھاٹ کے قریب واقع گاندھی میوزیم میں آج بھی اردو زبان کے ساتھ ان کے لگائو کے روشن ثبوت کے طور پر موجود ہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ گاندھی جی کو ’اردو دنیا ‘ کی کور اسٹوری کامرکزی موضوع بناتے وقت ، ’سوراج‘ کے تعلق سے ان کے تصورات اور ہندوستانی آئین میں اردو زبان کی حیثیت کے بارے میں گراں قدر مضامین کے ساتھ گاندھی جی کے اردو زبان سے تعلق اور اردو ادب پر اُن کے نظریات سے مرتب ہونے والے اثرات پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔امید ہے ان مضامین سے گاندھی جی کے نظریات اوراردو کے تعلق سے اُن کے ’بھاشائی سیکولرزم‘ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ادارہ

مہاتما گاندھی کے مجموعۂ خیالات میں ’سوراج‘ سے متعلق تصورات ایک ترمیم اور اضافہ کیے جانے والے مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سوراج اصل میں سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ لیکن مہاتما گاندھی کے تصورات سے وابستگی نے اس میں ایسی روح پھونک دی کہ گاندھیائی فلسفے پر ہونے والی گفتگو میں ماہرین نے سوراج کے کسی لفظی بدل کا استعمال نہیں کیا، خواہ وہ گفتگو کسی ہندستانی زبان میں ہورہی ہو یا غیر ملکی زبان میں۔ انگریزی زبان میں تو اس کے شواہد ہر شخص ملاحظہ کرسکتا ہے۔ اسی وجہ سے خاکسار نے ’سوراج‘ کے لیے اردو بدل کی تلاش سے گریز کیا ہے۔ سوراج کے لفظی معنی پر ابتدا میں مہاتما گاندھی نے بھی روشنی نہیں ڈالی تھی۔ مہاتما گاندھی کے علم میں بھی یہ بات شاید ہی رہی ہوگی کہ ان کے سوراجی تصورات آنے والے برسوں میں اس قدر اہمیت اختیار کرلیں گے اور بعد وفات ان کی نیک نامی کا یہ ایک اہم حوالہ ہوگا۔ ویسے سوراج دو لفظوں ’سو‘ اور ’راج‘ کے میل سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ’خود کی حکومت‘ یا ’خود پر حکومت‘۔ سوراج کے لفظی معنی کی وضاحت پر مہاتما گاندھی کی توجہ بھی 1931 سے قبل شاید ہی ہوئی ہو۔ 19-3-1931 کے ’ینگ انڈیا‘ (Young India) کے صفحہ 38 پر وہ لکھتے ہیں:

”سوراج ایک پاک لفظ ہے، یہ ایک وید میں استعمال شدہ لفظ ہے جس کا مطلب ہے، اپنی حکومت اور قربانیِ

ذات۔ اس کا مطلب تمام طرح کی پابندیوں سے نجات نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر آزادی کا مطلب لگایا جاتا ہے۔''

ایسا بالکل نہیں ہے کہ سوراج سے متعلق تصورات سب سے پہلے مہاتما گاندھی کے ذہن میں آئے۔ مہاتما گاندھی سے قبل 'ٹالسٹائے' کی تحریروں میں ایسے یا اس سے ملتے جلتے تصورات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ہندستانی سیاق وسباق میں یہ مہاتما گاندھی کے حوالے سے ہی سامنے آسکا۔ نیز گفتار و کردار کا فرق بھی غالباً پہلی بار مہاتما گاندھی کے یہاں ہی مٹا ہے۔ اس لیے اصولی اور عملی دونوں سطحوں پر گاندھی جی کے سوراجی تصورات کسی دوسرے مفکر اور راہ نما کے مقابلے اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔

مہاتما گاندھی کے سوراج سے متعلق خیالات یقینی طور پر ان کے جنوبی افریقہ میں قیام کے دوران وجود میں آئے۔ اس کے آغاز کی تاریخ کا تعین کیے بغیر اگر براہِ راست 'ہند سوراج' میں پیش کردہ ان کے سوراج سے متعلق تصورات پر گفتگو کی جائے تو اس کے (سوراج سے متعلق تصورات) کسی خاص سلسلے کے چھوٹنے کا خدشہ نظر نہیں آتا۔ 'ہند سوراج' اصلاً گجراتی میں لکھی گئی تھی اور سب سے پہلے جنوبی افریقہ سے شائع ہونے والے اخبار 'انڈین اوپی نین' (Indian Opinion) میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ 1909 میں یہ کتاب لندن سے جنوبی افریقہ واپسی کے دوران جہاز پر ہندستانیوں کے تشدد پسند گروہ اور اسی خیال کی تقلید کرنے والے جنوبی افریقہ کے ایک طبقے کو دیے گئے جواب کے طور پر سوال و جواب کی طرز میں لکھی گئی تھی۔

'کانگریس اور اس کے کارکنان' کے عنوان سے پیش 'ہند سوراج' کے بابِ اوّل کا پہلا سوالیہ جملہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

''سوال: آج کل ہندستان میں سوراج کی ہوا چل رہی ہے۔۔۔۔۔۔''[1]

مہاتما گاندھی اس باب کے آئندہ سطور میں بتاتے ہیں کہ جب سے 'نیشنل کانگریس'[2] کی داغ بیل پڑی ہے تبھی سے ہندستان میں سوراج کا جذبہ پیدا ہوا۔ آگے وہ کانگریسی راہ نماؤں کی فعالیت، کانگریس کے بہی خواہ انگریزوں سے تعلقات، پروفیسر گوکھلے وغیرہ کے خیالوں کے وسیلے سے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کانگریس نے ہندستانیوں کو ایک اسٹیج پر یکجا کر کے ان میں سوراج سے متعلق تصورات کی اشاعت کی ہے۔ ان کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں:

''محصول کا حق رعایا کا ہونا چاہیے، ایسی مانگ کانگریس نے ہمیشہ کی ہے۔ جیسا سوراج کناڈا میں ہے، ویسا سوراج کانگریس نے ہمیشہ چاہا ہے۔

ویسا سوراج ملے گا یا نہیں ملے گا، ویسا سوراج ہمیں چاہیے یا نہیں چاہیے، اس سے بڑھ کر دوسرا کوئی سوراج ہے یا نہیں، یہ سوال علاحدہ ہے۔ مجھے دکھانا تو اتنا ہی ہے کہ کانگریس نے ہند کو سوراج کا رس چکھایا۔۔۔۔۔۔''[3]

ہندستان کی جنگِ آزادی کے پہلے دور کو ماہرین نے 'لبرل دور' (Liberal Phase) کا نام دیا ہے جس میں ہندستانی راہ نماؤں نے گزارش اور رورعایت سے کام لیا۔ مہاتما گاندھی نے اسی دور کا تحفظ کرتے ہوئے یہ تصور قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان لبرل راہ نماؤں کی رکھی گئی بنیاد پر ہی سوراج کا محل کھڑا ہوگا۔ 1947 میں جو نیا ہندستان ابھر کر سامنے آیا، اس میں لبرل راہ نماؤں کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مہاتما گاندھی کی پیش نظری کا یہاں ہمیں قائل ہونا پڑتا ہے کیوں کہ وہ یہ بات 1909 میں ہی کہہ رہے تھے۔

اس کے بعد کے دو ابواب تقسیم بنگال سے پیدا شدہ ہنگامے، نااتفاقی اور عوامی بیداری سے متعلق ہیں۔ مہاتما گاندھی واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ ''تقسیم بنگال کو رد کرنے کی مانگ سوراج کی مانگ کے برابر ہے۔''[4]

مہاتما گاندھی تقسیم بنگال کو اصل بیداری کی وجہ مانتے ہوئے اسے اس وقت کے وائسرائے 'لارڈ کرزن' (Lord Curzon) کی دین بتاتے ہیں۔ تقسیم بنگال سے پیدا شدہ نااتفاقی مہاتما گاندھی کی نظر میں، سوراج حاصل کرنے کے لیے لازمی پس منظر ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ہر ایک اصلاح سے پہلے نااتفاقی ہونا ہی چاہیے۔''[5]

غور طلب ہے کہ حصولِ مقصد کے لیے پس منظر میں اُبھر رہی نااتفاقی کو مارکسی مفکرین نے بے حد اہمیت دی ہے۔ مہاتما گاندھی 'اصلاح' کی بات کرتے ہیں اور مارکسی مفکرین 'انقلاب' کی۔ مارکسی اصطلاح کی رو سے تو انقلاب کے لیے 'طبقاتی جد و جہد' کا بتدریج تیز تر ہوتا جانا اس کی (انقلاب کی) آمد اور کامیابی کے لیے لازمی ہے۔ مہاتما گاندھی کی 'اصلاح' سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے الٹ پھیر کی جگہ پر ان کا مقصد محدود تبدیلی ہے۔

مہاتما گاندھی کے ذہن میں سوراج کی کیسی تصویر ہے اور اس کی حصول یابی کی راہ کون سی ہے، اس پر گاندھی جی کی سوچ بالکل واضح ہے۔ 'ستیا گرہ' اور 'عدم تشدد' سے متعلق ان کے افکار بھی سوراج سے متعلق سوچ سے متحد ہو کر ہی واضح ہو پاتے ہیں۔ 'سوراج کیا ہے؟' عنوان کے تحت چوتھے باب میں ہم عصر مخالفین کے خیالات کو رد کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے اپنے خیالات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''سوراج کے لیے آپ ہم سب بے قرار ہو رہے ہیں؛ لیکن وہ کیا ہے، اس بارے میں ہم ٹھیک رائے پر نہیں پہنچے ہیں۔ انگریزوں کو نکال باہر کرنا چاہیے، یہ خیال بہتوں کے منہ سے سنا جاتا ہے؛ لیکن انھیں کیوں نکالنا (جانا) چاہیے، اس پر ٹھیک سے غور کیا گیا ہو، ایسا نہیں لگتا۔ آپ سے ایک سوال میں پوچھتا ہوں۔ مان لیجیے کہ ہم مانگتے ہیں، اتنا سب انگریز ہمیں دے دیں تو پھر انھیں (یہاں سے) نکال دینے کی ضرورت آپ سمجھتے ہیں؟''[6]

اسی باب کے کچھ دوسرے حصوں میں مہاتما گاندھی کے حصولِ سوراج کا منصوبہ بھی سامنے آتا ہے۔ اس کے مختلف حصوں میں انھوں نے کچھ سوالات قائم کیے ہیں:

- ''ہم انگریزوں کو کیوں نکالنا چاہتے ہیں؟''[7]
- ''اگر وہ دولت باہر نہ لے جائیں، نرم خیال بن جائیں اور ہمیں بڑے عہدے دیں، تو ان کے رہنے میں آپ کو کچھ ہرج ہے؟''[8]
- ''اس سوال کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ریاست تو چاہیے، پر انگریز (حکمران) نہیں چاہیے۔ آپ باگھ کا مزاج تو چاہتے ہیں، لیکن باگھ نہیں چاہتے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ ہندستان کو انگریز بنانا چاہتے ہیں اور ہندستان جب انگریز بن جائے گا تب وہ ہندستان نہیں کہا جائے گا لیکن سچا انگلستان کہا جائے گا۔ یہ میرے خیالوں کا سوراج نہیں ہے۔''[9]

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مہاتما گاندھی ایک وکیل بھی ہیں۔ وکالت کے پیشے میں ماہر شخص ہمیشہ اپنے مخالف کو لاجواب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ درج بالا اقتباس نمبر 7 اور 8 کو جوڑ کر دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ مہاتما گاندھی انگریزوں کے نرم دل بن جانے پر انھیں ملک سے نکالنے کے حمایتی نہیں ہیں۔ حالانکہ 1942 کی تحریک میں ان کا نعرہ تھا: ''انگریزو! بھارت چھوڑو!'' یہاں تھوڑا سا ترکِ موضوع کرتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا کہ عدالتوں میں مالک مکان اور کرایہ دار کے درمیان میں پیدا اختلاف جب فیصلے کے لیے پیش کیا جاتا ہے تو متعلقہ منصف کرایہ دار کی طرف اچھے سلوک کی شرط پر فیصلہ دے دیتے ہیں۔ گاندھی جی نے بھی اپنے علمِ قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں سے سلوکِ بجا کی توقع کی ہے۔ اقتباس نمبر 9 سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ گاندھی جی کسی انگریز سے کینہ نہیں رکھتے بلکہ ان کے پیشِ نظر انگریزی نظامِ حکومت ہے جو نظامِ استحصال کی بنیاد ہے۔ گاندھی

کور اسٹوری

جی اگر عدم تشدد کی بات اپنی پوری سیاسی زندگی میں کرتے رہے تو اس کے پیچھے ان کی بے پناہ انسان دوستی تھی نہ کہ ان کی کمزوری۔ یہاں ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے کہ غلامی کا ذریعہ انگلینڈ سے جاری اس وقت کا ہندستانی نظامِ حکومت (نظامِ استحصال) تھا، جس میں کسی شخص خاص کی موجودگی یا عدم موجودگی سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ ان باتوں پر مہاتما گاندھی کی نظر تھی۔ اس لیے وہ انگریزی ریاست کو 'باگھ کا مزاج' اور انگریز حکمران کو 'باگھ' سے تشبیہ دیتے ہیں۔ گاندھی جی نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کا سوراج نہ تو 'باگھ کا مزاج' ہے اور نہ ہی 'باگھ کی حکومت'۔ ان کے مطابق تشدد پسند ذہنیت نہ تو سوراج دلا سکتی ہے اور نہ ہی اسے دائمی بنا پائے گی۔

مہاتما گاندھی ہندستانی ثقافت کو انگریزی ثقافت سے برتر مانتے ہیں۔ وہ واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ یونان کی ثقافتیں مٹ گئیں لیکن ہندستانی ثقافت پر آنچ نہیں آئی۔ ہندستان میں انگریزوں کی کامیابی کا راز کیا ہے اور دوسری مختلف قوموں مثلاً شک، کشان، ہون، افغان وغیرہ کی طرح وہ ہندستانی ثقافت کا حصہ کیوں نہیں بن پائے؟ ... یہ ماہرین کے درمیان غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ مارکس نے اس کی وجہ اس وقت کی انگریزی ثقافت کا ہندستانی ثقافت سے برتر ہونا مانا تھا۔ اس نکتے پر مہاتما گاندھی کی بھی نظر تھی اور انھوں نے ہندستانی ثقافت کی قدیم عظمت کو یاد کر کے انگریزی ثقافت کی برتری سے پیدا شدہ ہندستانیوں کی احساسِ کمتری کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگر انگریز ہندستانی بن کر رہیں، تو ان کی شمولیت یہاں کر سکتے ہیں۔ انگریز اگر اپنی ثقافت کے ساتھ رہنا چاہیں، تو ان کے لیے ہندستان میں جگہ نہیں ہے۔''10

حصولِ سوراج میں ایک اہم رکاوٹ ذہنی غلامی تھی۔ اس لیے گاندھی جی نے مانا کہ ریل، وکیل اور ڈاکٹر جن کا سماج میں اعلا مقام ہے، ہندستان کو کنگال بنا رہے ہیں۔ 'ہند سوراج' کے الگ الگ حصوں میں گاندھی جی نے ان پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ریل نے ہندستان پر انگریزی نظام کو مضبوط بنانے میں مدد دی؛ ڈاکٹر، روگی کی خود اعتمادی چھین لینے والا آلہ ہے اور وکیل موجودہ نظام کو قائم رکھنے میں مدد کرنے والا لالچی معاون ... ایسا خیال گاندھی جی کا تھا۔ حالانکہ جدید نظام حکومت جسے جمہوریت کا نام دیا گیا ہے، اس میں ان تینوں کی جڑیں بے حد گہرائی تک چلی گئی ہیں۔ بلا شبہ یہ باتیں مغرب سے آئیں اور اپنے ساتھ لالچ اور استحصال کے خبط کو پھیلاتی چلی گئیں۔ یہاں مہاتما گاندھی درجِ بالا پیشہ وروں کے خاتمے کی شکل میں اس خبط کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ان کے جملے ہیں:

''... سارا ہندستان اس میں (غلامی میں) گھرا ہوا نہیں ہے۔ جنھوں نے مغربی تعلیم اور جو اس کے جنجال میں پھنس گئے ہیں، وہی غلامی میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہم دنیا کو اپنی دمڑی کی ناپ سے ناپتے ہیں۔ اگر ہم غلام ہیں، تو دنیا کو بھی غلام مان لیتے ہیں۔ ہم افلاس کی حالت میں ہیں، اس لیے مان لیتے ہیں کہ سارا ہندستان ایسی حالت میں ہے۔ دراصل ایسا کچھ نہیں ہے۔ پھر بھی ہماری غلامی ملک کی غلامی ہے، ایسا ماننا ٹھیک ہے ... ہم اپنے اوپر راج کریں، وہی سوراج ہے، اور وہ سوراج ہماری ہتھیلی میں ہے۔

اس سوراج کو آپ خواب جیسا نہ مانیں۔ دل سے مان کر بیٹھے رہنے کا بھی یہ سوراج نہیں ہے ... ہم خود غلام ہوں گے اور دوسرے کو آزاد کرنے کی بات کریں گے، تو یہ ممکن نہیں ہے۔''11

مہاتما گاندھی کی سیاسی زندگی میں اصلاح پسند اور انقلاب پسند؛ دونوں طرح کے تصورات ملتے ہیں۔ ان کے اصلاح پسند تصورات میں ہری جن بھتری؛ چھوٹے اور گھریلو کام دھندوں کے ذریعے حصولِ خود مختاری؛ انسان کو بُرے کاموں سے دور کرنے کے لیے اس کے دل و ذہن کو تبدیل کرنا؛ ٹرسٹی شپ (Trusteeship) کے اصول اور ضبطِ ذات وغیرہ کو رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف جنگِ آزادی کے لیے عوام کو متحرک کرنے کی قوت؛ وطنی افتخار کے زیرِ اثر برطانوی حکومت سے مسلسل بر سر پیکار ہونا؛ ان کی انقلاب پسندی کی مثالیں ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کا ترقی پسند طبقہ مہاتما گاندھی کو ان کی پوری زندگی کے دوران اصلاح پسند سمجھتا رہا اور ان کے مباحثے میں صرف مہاتما گاندھی کی اصلاح پسندی ہی جگہ بنا سکی۔

مہاتما گاندھی کی مختلف تحریکوں کے خاکے کا ماحصل بھی سوراج کے ذرائع کی بحث میں سامنے آجاتا ہے۔ 'ستیا گرہ - طاقتِ ذات' عنوان سے تحریر کردہ سترھویں باب میں مہاتما گاندھی نے انتہا پسندوں اور دہشت گردوں (انقلابیوں)، دونوں کے طریقۂ کار پر اپنے خیالات کو ظاہر کیا ہے۔ ساتھ ہی ستیاگرہ جیسے حربے کو استعمال کرنے کا طریقہ بھی اس باب میں موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''قانون ہمیں پسند نہ ہو تو بھی اس کے مطابق چلنا چاہیے، یہ درس مردانگی کے خلاف ہے، اور غلامی کی حد ہے۔''12

''اگر لوگ ایک بار سیکھ لیں کہ جو قانون ہمیں غیر انصاف پسندانہ معلوم ہو اسے ماننا نامردگی ہے، تو ہمیں کسی کا بھی ظلم باندھ نہیں سکتا۔ یہی سوراج کی کلید ہے۔''13

سوراج پر ہو رہے غور و فکر میں مہاتما گاندھی انگریزی نظامِ تعلیم کو غیر مفید اور افتخارِ ملک کے خلاف مانتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ سوراج کی بات غیر زبان میں کی جائے۔ پہلے بھی یہ بات آچکی ہے کہ مہاتما گاندھی ہندستانی ثقافت کو انگریزی ثقافت سے برتر سمجھتے ہیں۔ بعنوان 'تعلیم' وہ اپنے سوراجی افکار پر کچھ نئے زاویے سے باتیں کرتے ہیں۔ عنوان 'چھٹکارا' کے تحت وہ ان تمام شبہات کی تردید کرتے ہیں جو انگریزوں کے چلے جانے یا انگریزی حکومت کے ختم ہو جانے سے پیدا ہو سکتی تھیں۔ مہاتما گاندھی ظلم کے خلاف ہیں اور راجا کا خادمِ عوام ہونا لازمی تصور کرتے ہیں۔ وہ ان شرطوں کا اعلان کرتے ہیں جن کے تحت انگریز ہندستان میں رہ سکیں گے:

''ہم کسی کا بھی ظلم یا دباؤ نہیں چاہتے ... چاہے وہ گورا ہو یا کالا یا ہندستانی۔ ہم سب کو تیرنا سیکھنا اور سکھانا ہے۔''14

''... راجا ہوتے ہوئے بھی آپ کو ہمارا نوکر بن کر رہنا ہوگا۔ آپ کا کہا ہمیں نہیں، بلکہ ہمارا کہا آپ کو کرنا ہوگا ...

آپ ہندستان میں سپاہ گری کرنا چاہیں تو رہ سکتے ہیں۔ ہمارے ساتھ تجارت کرنے کا لالچ آپ کو چھوڑنا ہوگا۔ جس ثقافت کی آپ حمایت کر رہے ہیں، اسے ہم نقصان دہ مانتے ہیں۔ اپنی ثقافت کو ہم آپ کی ثقافت سے کہیں زیادہ اونچی سمجھتے ہیں ...

لیکن ایسا نہ لگے تو بھی آپ کو، آپ ہی کی کہاوت کے مطابق ہمارے ملک میں ہندستانی ہو کر رہنا ہوگا۔''15

'ہند سوراج' میں 'انگلینڈ کی حالت' عنوان سے پیش پانچویں باب میں انگلینڈ کی پارلیامنٹ کے لیے مہاتما گاندھی نے لائقِ اعتراض صفات کا استعمال کیا ہے۔ ان کا جملہ ہے:

''جسے آپ پارلیامنٹوں کی ماں کہتے ہیں، وہ پارلیمنٹ تو بانجھ اور طوائف ہے ...''16

مہاتما گاندھی ایسا کہنے کا سبب بھی آئندہ جملوں میں ظاہر کر دیتے ہیں۔لیکن 'بانجھ' اور 'طوائف' ہونے کے درد کا تجربہ، ان کے پاس تو ہے ہی نہیں۔ آج پارلیامانی جمہوریت اپنی تمام برائیوں کے باوجود اب تک کے نظامِ حکومت میں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی ہے۔ خود ہندستان میں موجودہ نظامِ حکومت پارلیامانی جمہوریت ہے۔ مہاتما گاندھی نے انگلینڈ کی پارلیامنٹ پر بہتان تراشی ضرور کی ہے لیکن 'ہندسوراج' میں اس کا کوئی بدل نہیں ملتا۔ خود مہاتما گاندھی نے بھی بعد کے برسوں میں اس غلطی کو محسوس کیا اور 'ہندسوراج' کے اصل متن میں دوسری کوئی تبدیلی کیے بغیر 'طوائف' لفظ کو بدلنے کی خواہش ظاہر کی:

''اس وقت اس کتاب کو اسی شکل میں شائع کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر اس میں مجھے کچھ بھی درست کرنا ہو تو میں ایک لفظ درست کرنا چاہوں گا۔ ایک انگریز خاتون دوست سے میں نے وہ لفظ بدلنے کا وعدہ کیا ہے۔ پارلیامنٹ کو میں نے طوائف کہا ہے۔ یہ لفظ ان بہن کو پسند نہیں ہے۔ ان کے نازک دل کو اس لفظ کے دیسی معنی سے تکلیف پہنچی ہے۔''

(سنہ:1921[17])

مہاتما گاندھی کی شخصیت میں جیسی سادگی ہے ،ویسی ہی بے باکی بھی۔ ان کی خودنوشت' تلاشِ حق' پڑھیے تو اس بات کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ ان کی بے باکی کسی کو ذہنی اذیت پہنچانے کے لیے نہیں ہے۔ 'ہندسوراج' کے آخری صفحے پر وہ اپنی سوراج سے متعلق فکر کو سلسلہ وار پیش کرتے ہیں:

''(1) اپنے من کی حکومت سوراج ہے۔

(2) اس کی کلید ستیا گرہ، طاقتِ ذات یا طاقتِ رحم ہے۔

(3) اس طاقت کو آزمانے کے لیے سودیشی کو پوری طرح اپنانے کی ضرورت ہے۔

(4) ہم جو کرنا چاہتے ہیں، وہ انگریزوں کے لیے (ہمارے من میں) کینہ ہے، اس لیے یا انھیں سزا دینے کے لیے نہ کریں، بلکہ

اس لیے کریں کہ ایسا کرنا ہمارا فرض ہے...

میں نے جو کچھ کہا ہے وہ انگریزوں کے لیے کینہ ہونے کی وجہ سے نہیں ، بلکہ ان کی ثقافت کے لیے ناپسندیدگی کے سبب کہا ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ ہم نے سوراج کا نام تو لیا لیکن اس کی اصل شکل ہم نہیں سمجھے ہیں۔ میں نے اسے جیسا سمجھا ہے، ویسا یہاں بتانے کی کوشش کی ہے۔''[18]

اس اقتباس کے بعد ہندسوراج میں پیش گاندھی جی کے سوراج سے متعلق خیالات پر شاید ہی کسی تجزیے کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ مہاتما گاندھی نے 1938 میں 'ہند سوراج' کے شائع ہونے والے اڈیشن کے لیے بھیجے گئے پیام میں لکھا تھا کہ ''میرے ایک مرحوم دوست کی یہ رائے بھی جان لیں کہ 'یہ ایک بے وقوف انسان' کی تخلیق ہے۔''[19] 'ہند سوراج' کے مواد پر کئی اطراف سے اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ مشینوں سے متعلق 'ہند سوراج' میں پیش خیالات کا بچاو کرتے ہوئے مہادیو ہری بھائی دیسائی نے لکھا ہے کہ ''گاندھی جی نے 'اپنے خیالوں کے جوش میں' مشینوں کے متعلق ان گڑھ زبان استعمال کی ہے۔''[20]

'ہندسوراج' میں گاندھی جی کے سوراج سے متعلق خیالات جامد نہیں تھے بلکہ ان میں عصری تبدیلیوں کی آمیزش بھی ہوتی رہی۔ 'انڈین اوپی نین' (Indian Opinion) جس میں 'ہندسوراج' پہلی بار شائع ہوا تھا، کے بعد 'ینگ انڈیا' (Young India) اور 'ہری جن' (Harijan) میں گاندھی جی کے سوراج سے متعلق خیالات وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں چلی تحریکِ آزادی میں تین بڑی تحریکیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ تینوں تحریکیں- عدم تعاون، ترکِ موالات اور ہندستان چھوڑو- مختلف ادوار میں چلائی گئیں۔ ان کا پس منظر اور ان کے دوررس اثرات بھی الگ الگ ہیں۔ اس کے علاوہ حصولِ آزادی کے دو برسوں 1946 اور 1947 میں ملک کی الگ ہی سماجی حالت تھی۔ درجِ بالا ادوار میں گاندھی جی نے اپنے سوراج سے متعلق خیالات میں ترمیم و اضافے کیے۔

مہاتما گاندھی کی سیاسی زندگی میں اصلاح پسند اور انقلاب پسند؛ دونوں طرح کے تصورات ملتے ہیں۔ ان کے اصلاح پسند تصورات میں ہَری جن بہتری؛ چھوٹے اور گھریلو کام دھندوں کے ذریعے حصولِ خود مختاری؛ انسان کو بُرے کاموں سے دور کرنے کے لیے اس کے دل و ذہن کو تبدیل کرنا؛ ٹرسٹی شپ (Trusteeship) کے اصول اور ضبطِ ذات وغیرہ کو رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف جنگِ آزادی کے لیے عوام کو متحرک کرنے کی قوت؛ وطنی افتخار کے زیرِ اثر برطانوی حکومت سے مسلسل برسرِ پیکار رہنا؛ ان کی انقلاب پسندی کی مثالیں ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کا ترقی پسند طبقہ مہاتما گاندھی کو ان کی پوری زندگی کے دوران اصلاح پسند سمجھتا رہا اور ان کے مباحثے میں صرف مہاتما گاندھی کی اصلاح پسندی ہی جگہ بنا سکی۔ دوسری جانب اسی عرصے میں مہاتما گاندھی کے مقلدین نے صرف ان کی انقلاب پسندی تک خود کو محدود رکھا۔ حصولِ آزادی (1947) کے بعد مقلدین اور ترقی پسند طبقے کے زاویۂ نظر آپس میں بدل گئے۔ مقلدین کا رجحان اب گاندھیائی اصلاح پسندی کی طرف تھا اور ترقی پسندوں نے انقلابی گاندھیائی افکار و تصورات پر توجہ مبذول کی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم پڑتی ہے کہ 'ترقی پسند' کی اصطلاح کا استعمال کسی خاص مسلک سے وابستہ افراد کے لیے نہیں کیا گیا ہے۔

انگریزوں کی آمد سے قبل ہندستان کا دیہی سماج اپنی تمام برائیوں کے باوجود خود کفیل تھا۔ ماہرین نے ہندستان کی اس سماجی حالت کی تعریف کم کم ہی کی ہے اور تضحیک زیادہ۔ لیکن آج کا صنعتی معاشرہ ترقی کے تمام دعووں کے باوجود آسودہ اور مطمئن انسان پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ سوراج کا گاندھیائی تصور چکنی چپڑی باتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ماضی کے تجربے کی بنیاد پر گڑھا گیا ٹھوس افکارِ انسانی ہے۔ 'سوراج' کو گاندھیائی طرز پر من و عن لاگو (Apply) کرنا نہ تو پہلے ممکن تھا اور نہ آج ہے۔ لیکن اس سے استفادہ کرنے کی گنجائش تو ہمیشہ بنی رہے گی۔ سوراجی تصورات نیز گاندھیائی افکار پر اب تک چل رہی گفتگو اس کی جاوداں حیثیت کا بین ثبوت ہے۔ پوری دنیا میں آج نظامِ حکومت جس قدر بے پرواہ ہوتا جا رہا ہے، اس میں گاندھی جی کے سوراج سے متعلق افکار کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔

مآخذ

1. ہند سوراج؛ مصنف گاندھی جی؛ ہندی مترجم- امرت لال ٹھاکور داس ناناوٹی؛ سنہ اشاعت- جون 2009؛ ناشر- سَرو سیوا سنگھ پرکاشن، بنارس؛ صفحہ 23، **2.** پیش کردہ مضمون کے لیے درجِ بالا محولہ کتاب کے ہندی متن میں مترجم نے 'نیشنل کانگریس' کی اصطلاح ہی استعمال کی ہے۔ **3.** ایضاً حوالہ (1)؛ صفحہ: 28-27؛ **4.** ایضاً؛ صفحہ- 29 **5.** ایضاً؛ صفحہ- 31؛ **6.** ایضاً؛ صفحہ- 31؛ **7.** ایضاً؛ صفحہ- 32؛ **8.** ایضاً؛ صفحہ- 32؛ **9.** ایضاً؛ صفحہ- 33 **10.** ایضاً؛ صفحہ- 66؛ **11.** ایضاً؛ صفحہ- 66-65 **12.** ایضاً؛ صفحہ- 80؛ **13.** ایضاً؛ صفحہ- 81؛ **14.** ایضاً؛ صفحہ- 98؛ **15.** ایضاً؛ صفحہ- 99؛ **16.** ایضاً؛ صفحہ- 34؛ **17.** ایضاً صفحہ- 105؛ **18.** ایضاً صفحہ- 104 **19.** ایضاً صفحہ- 11؛ **20.** ایضاً؛ صفحہ- 15

■

Mani Bhushan Kumar, Deptt. of Urdu, BHU, Varanasi (UP)

محمد عبدالقدیر

اردو زبان اور ہندوستان کا دستور

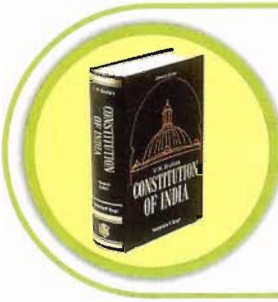

بادی النظر میں یہ عنوان باعثِ استعجاب ہوگا کہ کیا دستورِ ہند (Constitution of India) میں اردو زبان کے بارے میں بھی کچھ ہے؟ اس کا جواب ہوگا کہ آئین کے آٹھویں ضمیمہ (8th Scedule) میں جو آئین کی تسلیم شدہ بائیس زبانوں کی فہرست ہے اس میں بائیسواں نام حروف تہجی کے لحاظ سے اردو کا ہے۔ اس کے علاوہ پورے آئین میں بہ اسمہٖ اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ دستورِ ہند میں کل 395 دفعات (Articles)، 22 ابواب (Chapters)، 12 ضمیمے (Schedules) اور دو تتمے (Appendix) ہیں اور یہ دستور اپنی 62 سالہ عمر میں 97 مرتبہ ترمیم (Constitutional Amendments) ہو چکا ہے۔ یہ تحریر اسی آئین کی روشنی میں اردو کے حقوق، ان کے حصول کے اقدامات اور سرکاری کام کاج میں اس کے استعمال کے امکانات کو تلاش کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔

کسی بھی ملک کا دستور اس ملک کے باشندوں کی آرزوؤں، ضرورتوں اور تمناؤں کا مظہر ہوتا ہے تو ان کے مستقبل کے خوابوں کا ترجمان بھی۔ حکومت کے نظم ونسق کی مکمل دستاویز اور اس کے جملہ قوانین کی شاہ کلید ہوتا ہے جو قوانین اس سے متصادم ہوں وہ کالعدم (Ultra Vires) قرار پاتے ہیں موٹے طور پر اگر 1857 سے شمار کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس ملک کے باشندوں نے کم وبیش ایک سو سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد 15 اگست 1947 کو آزادی حاصل کی اور اس کے بعد تین سال تک ملک کے بہترین دماغوں نے غور وخوض اور دنیا کے تمام جمہوری ممالک کے دستور کے مطالعہ کے بعد یہ قیمتی تحفہ اس ملک کے عوام کو دیا جس کا نفاذ 26 جنوری 1950 کو ہوا۔ اگر بطور قانونی کتاب کے موازنہ کیا جائے تو یہ دستور دنیا کے بہترین آئین میں شمار ہوگا لیکن اس کے حرف (Letter) کی جتنی پامالی اور اس کی روح (Spirit) کی جتنی بے حرمتی ہم نے کی ہے، اس کی مثال بھی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ نہ اس میں کوئی کمی ہے نہ اس کے مشمولات میں۔ کوئی نقص یا کمی ہے تو اس کی تشریح، تعبیر اور نفاذ میں، اس کو نیک نیتی سے روبہ عمل لانے میں۔ اس کے نفاذ پر مامور لوگوں کے تعصب اور بددیانتی کی وجہ سے اس ملک کے باشندے اس کی ساری خوبیوں سے ہنوز ناآشنا ہیں، اس کی اصل قوت سے بے خبر ہیں، اپنے آئینی حقوق سے محروم ہیں۔ اردو اور اردو والے محرومین کی اس فہرست میں سرفہرست ہیں۔

آزادی کی جنگ تمام ہندوستانیوں نے شانہ بہ شانہ لڑی۔ سب نے مل کر آزاد ہندوستان کا خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھا۔ اردو زبان کے 'انقلاب' اور 'زندہ باد' جیسے نعروں نے منتشر قوم کو ایک نقطے پر ایک مقصد کے لیے مجتمع کردیا جو اس سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ترانہ ہر خاص وعام کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ اردو بولنے والوں خاص کر مسلمانوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حتی کہ علما اپنی درس گاہیں اور مشائخ وسجادگان اپنی خانقاہیں چھوڑ کر میدان میں اتر آئے اور انھوں نے آزادی کی لڑائی میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ سب ٹکٹکی لگائے تھے کہ آزادی کا سورج کب منصۂ شہود پر طلوع ہوگا؟ امید باندھے تھے کہ ہم آزاد ہوں گے تو ہماری زبان کا کھویا ہوا وقار بحال ہوگا۔ کانگریس پارٹی جو اس تحریک میں قائدانہ رول ادا کر رہی تھی، اس کی واضح پالیسی تھی کہ آزاد ہندوستان میں بولی جانے والی 'ہندوستانی' ہی ملک کی زبان ہوگی جس میں دونوں رسمِ خط شامل ہوں گے۔

آئین کے باب 3 میں وہ بنیاد حقوق (Fundamental Rights) درج کیے گئے جو ملک کے باشندوں کو بغیر امتیاز مذہب، رنگ، نسل، ذات، جنس کے حاصل ہیں۔ دفعات (Articles) 25-26 میں اقلیتوں کے مذہبی حقوق اور دفعات 30-29 میں اقلیتوں کے تعلیمی، لسانی اور تعلیمی اداروں کے قیام وانتظام کے حقوق کو بنیادی حقوق میں شامل کیا گیا اور ان کے نفاذ کی نگرانی دفعہ 226 میں صوبہ کی ہائی کورٹ اور دفعہ 32 میں سپریم کورٹ کے ذمے کی گئی ہے۔ دفعہ 29 (1) کی رو سے:

''ہندوستان یا اس کے کسی حصے میں رہنے والے باشندوں کو اپنی زبان، رسم الخط اور تہذیب کے تحفظ کا حق ہوگا۔''

اس طرح اردو زبان، اس کی روایات، اس کے رسم الخط اور اس کے تہذیبی ورثے کے تحفظ کی ضمانت آئینِ ہند نے صاف لفظوں میں فراہم کردی ہے۔ یہ اردو اور اردو والوں کا بنیادی حق ہے جس سے انھیں دستبردار نہیں کیا جاسکتا۔

آئینِ ہند میں زبانوں سے متعلق قوانین اس کے سترہویں باب میں درج ہیں۔ دفعہ (Article) 343 میں درج ہے کہ وفاقی حکومت (Union of India) کے سرکاری کام کاج کی زبان (Official Language) دیونا گری رسم الخط میں 'ہندی' ہوگی لیکن حکومت کو یہ حق ہوگا کہ پندرہ سال یا ایسی توسیعی مدت تک جیسا وہ طے کرے، انگریزی کو بھی اسی طرح استعمال کرسکتی ہے جیسا کہ آئین کے نفاذ سے پیشتر کیا جارہا تھا۔ دفعہ 345 میں ہر صوبے کو اپنے سرکاری کام کاج کی زبان طے کرنے کا اختیار دیا گیا اسی میں یہ بھی درج ہے کہ دفعات 346 اور 347 کی پابند رہتے ہوئے کوئی بھی صوبائی حکومت کسی ایک زبان یا ایک سے زائد زبانوں یا ہندی کو اپنی سرکاری زبان کے طور پر اختیار کرسکتی ہے۔ جب تک کوئی زبان اختیار نہ کی جائے صوبے میں آئین کے نفاذ سے پہلے سے رائج زبان میں سرکاری کام کاج ہوتا رہے گا۔

اِس وقت ملک میں کل اٹھائیس (28) ریاستیں اور سات ذیلی صوبے (Union Territories) مرکز کے زیر انتظام ہیں۔ تمام صوبوں نے دفعہ 345 کے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اپنے اپنے صوبوں میں 'سرکاری کام کاج کی زبان کا قانون' یا 'سرکاری زبان قانون' (Official Language Act) پاس کیے ہیں۔ اردو کو پہلی زبان کا درجہ علاوہ جموں وکشمیر کے اور کسی صوبے میں نہ ملا۔ چونکہ صوبوں کی تقسیم زبانوں کی بنیاد پر ہوئی تھی اور تقسیم کرنے والوں نے اردو کے پاؤں کے نیچے کوئی زمین ہی نہ چھوڑی تھی۔ کشمیر کی بات دیگر ہے کیوں کہ وہاں کے بہت سے قوانین ملک میں نافذ مختلف ہیں۔

بہار اسمبلی نے سرکاری زبان قانون 1950 (Bihar Offical Languages Act - 1950) اور اتر پردیش اسمبلی نے اتر پردیش سرکاری زبان ایکٹ (UP Official Languages 1951 Act-1951) کے ذریعے ہندی دیونا گری رسم الخط کو اپنی سرکاری زبان اختیار کیا۔ 1981 میں بہار کی جگن ناتھ مشرا حکومت نے مذکورہ بالا ایکٹ میں ترمیم کرکے چند امور کے لیے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا اور اسی کی

تقلید کرتے ہوئے 1981 میں بہار کی جگن ناتھ مشرا حکومت نے مذکورہ بالا ایکٹ میں ترمیم کرکے چند امور کے لیے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا اور اسی کی تقلید کرتے ہوئے 1989 میں یوپی نے اپنے مذکورہ بالا ایکٹ میں ترمیم کرکے (نرائن دت تیواری حکومت نے) چند امور کے ذریعے اردو کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا لیکن یہ بہت محدود معنی میں ہے جو حقیقت کم اور واہمہ زیادہ ہے۔ قریب قریب یہی حالت دہلی کی ہے جہاں محترمہ شیلا دکشت سرکار نے اردو اور پنجابی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ ابھی 2010 میں محترمہ ممتا بنرجی نے مغربی بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا ہے۔ ان صوبوں کے یہ قانون ناکافی ہیں۔ بہت محدود دائرے میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان صوبوں میں ان امور میں بھی اردو کو سرکاری زبان کی طرح استعمال نہیں کیا جارہا ہے جن امور کے لیے اسے سرکاری زبان تسلیم کیا گیا ہے۔

آئین سازوں کی یہ دوراندیشی تھی کہ انھوں نے اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا کہ کسی صوبے میں ایک سرکاری زبان مقرر ہوجانے سے اس صوبے کی دوسری زبانوں کی کہیں حق تلفی نہ ہو لہٰذا انھوں نے اسی باب کے دفعہ 347 میں یہ اختیار محفوظ کردیا جس میں تحریر ہے کہ اگر صدر جمہوریہ سے مانگ کی جائے اور وہ اس مانگ سے مطمئن ہوجائیں کہ کسی ایک صوبے یا اس کے کسی حصے یا حصوں میں خاطر خواہ آبادی کے لوگ کسی خاص زبان کا استعمال کرتے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں تو صدر جمہوریہ اس صوبائی حکومت کو ہدایت (Direction) دے سکتے ہیں کہ اس صوبے یا اس کے کسی حصے میں اس زبان کو خاص مقاصد کے لیے سرکاری زبان تسلیم کرلیا جائے۔ اس طرح صدر جمہوریہ چاہیں (یا مرکزی حکومت چاہے کہ جس کی کابینہ کے مشوروں پر وہ کام کرتے ہیں) تو وہ ان ریاستوں میں یا ریاستوں کے ان اضلاع میں جہاں اردو بولنے والوں کی خاطر خواہ آبادی ہے وہاں اردو کو سرکاری زبان بنائے جانے کا حکم نامہ جاری کرسکتے ہیں۔ (سوال یہ ہے کہ کیا اردو والوں نے کبھی ایسی مانگ کی ہے؟ جواب ہوگا کہ نہیں)۔

دفعہ 350 میں درج ہے کہ کوئی بھی شخص (جب کہ دوسری دفعات میں باشندہ citizen لکھا ہے) اپنی دادرسی یا چارہ جوئی کے لیے مرکزی حکومت، صوبائی حکومت یا ان حکام یا کارگزار ان کو کسی بھی زبان میں درخواست دے سکتا ہے (سوال ہوگا کہ کیا اردو والے واقعی کبھی ایسی درخواستیں اردو میں پیش کرتے ہیں؟ جواب ہوگا کبھی نہیں۔)

دفعہ 350 الف میں صاف طور پر دیا ہوا ہے کہ ہر صوبائی حکومت یا مقامی ادارے (Local Bodies) کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ اپنے باشندوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں مہیا کریں، بالخصوص اقلیت کے افراد کو پرائمری تعلیم ان کی مادری زبان میں دینے کی کوشش کی جائے۔ اس دفعہ کی رو سے نگر نگم، نگر پالیکا، ضلع پنچایت، نگر پنچایت، گاؤں سبھا وغیرہ جیسے مقامی اداروں کو اردو میں تعلیم مہیا کرنے کے لیے قانونی طور پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ اس دفعہ میں بھی صدر جمہوریہ کو اضافی طور پر یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی صوبے یا لوکل اتھارٹی کو اس دفعہ میں دیے گئے حقوق کو بروئے کار لانے کے احکامات جاری کرسکتے/سکتی ہیں۔ (کیا ہم نے صدر جمہوریہ، صوبائی حکومت یا مقامی اداروں سے ایسی مانگ کبھی کی ہے؟ کبھی نہیں)

دفعہ 350 ب (350 B) میں صدر جمہوریہ پر یہ آئینی ذمے داری عائد کی گئی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ایسے

اگر اردو کے سرکاری اور غیرسرکاری ادارے اور ان کے عہدے داران، یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کے ذمے داران، معروف ادبا و شعرا جو حکومت سے بڑے بڑے عہدے اور اعزازات حاصل کرلینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور اردو کے عام شیدائی منصوبہ بند طریقے سے ایک اسکیم اور پلاننگ کے تحت کوشش کریں اور اس میں ان اردو دوستوں کی بھی معاونت لیں جو حکومت میں بھی شامل ہیں، یا اثر و رسوخ رکھتے ہیں تو مشکل نہیں کہ آئین کی ان غیرمستعمل دفعات میں خونِ عمل دوڑا دیں۔ ان کے حروف کو معنی پہنادیں اور اردو کو اس کا کم سے کم وہ حق تو مل جائے جو دستور کی دفعات سے مترشح ہوتا ہے۔ ان دفعات کو بالقصد نظرانداز کرکے ہم دستورِ ہند کی روح کی خلاف ورزی کررہے ہیں:

کمیشن اور کمیٹیاں بنائیں جو ملک کی دیگر زبانوں کی حالت، ان کے مسائل، ان کے حل وغیرہ کے امور پر کھوج بین کریں اور اپنی سفارشات اور تجاویز صدر جمہوریہ کو پیش کریں جو ان کی روشنی میں صوبائی حکومتوں کو ضروری احکامات و ہدایت جاری کریں گے تاکہ ان سفارشات اور تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

اردو والوں کے حافظے سے یہ بات محو نہ ہوگی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس وقت کے صدر جمہوریہ کو اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے بیس لاکھ افراد کے دستخطوں کا ایک میمورینڈم پیش کیا تھا۔ بعد میں وہ ملک کے تیسرے صدر جمہوریہ (دوسرے نائب صدر جمہوریہ) ہوئے لیکن اس میمورنڈم کا کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں گیا؟ اسی طرح مرکزی حکومت کے مشورے پر صدر جمہوریہ نے گوپال سنگھ کمیٹی مقرر کی جس نے اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے متعلق چونکا دینے والے حقائق پیش کیے اور ان کے حل کے لیے اہم تجاویز و سفارشات پیش کیں۔ کئی حکومتیں آئیں گی۔ اپنے مفاد کے مطابق منڈل کمیشن کی رپورٹ کو دس سال بعد ٹھنڈے بستے سے نکال کر زندہ کردیا گیا اور نافذ بھی لیکن گوپال سنگھ کمیٹی رپورٹ کا کوئی پتہ نہ چلا نہ معلوم کہ زمین کھا گئی یا آسمان؟ اسی طرح اندر کمار گجرال کمیٹی تشکیل دی گئی اس نے بھی بڑی قیمتی رپورٹ پیش کی حتی کہ بعدہ شری گجرال جی خود وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن انھوں نے بھی اس کے نفاذ کی زحمت نہ کی۔ اسی طرح موجودہ حکومت نے جسٹس سچر کمیٹی تشکیل دی ہے جس میں اقلیتوں کے مسائل بشمول زبان، شامل ہے۔ اس کمیٹی نے پہلے ایک امتناعی رپورٹ دی تھی اور اب فائنل رپورٹ بھی مرکزی حکومت کو پیش کردی۔ رنگ ناتھ مشرا کمیٹی کی رپورٹ بھی کب کی آچکی مگر زبان کے حوالے سے ابھی تک ان سفارشات کا نفاذ جوئے شیر ہے۔

مرکزی حکومت نے مستقل طور پر لسانی اقلیتوں کے لیے ایک کمیشن (Commissioner for Linguistic Monorities in India) بھی بنا رکھا ہے، جس کا صدر دفتر الہ آباد میں واقع ہے مگر اس کے کام کاج سے الہ آباد کے اردو والے تک واقف نہیں۔ عام طور پر اس کے چیئر مین حکومت ہند کے سبکدوش آفیسر ہوا کرتے تھے مگر چند برس پہلے حکمراں جماعت نے اپنے ایک ایم پی کو ہی اس کا چیئر مین بنا دیا تھا لہٰذا جو کام ہونا بھی تھا وہ بند ہوگیا۔ یہ کمیشن بھی ماضی میں متعدد رپورٹیں حکومت کے حوالے کرچکا ہے مگر نہ کسی رپورٹ کو عام کیا گیا نہ پارلیمنٹ کی میز پر اسے پیش کیا گیا اور نہ حکومت نے اس پر کوئی عمل درآمد ہی کیا عوام کی کثیر رقم بے مصرف گئی۔

اس طرح اس دفعہ یعنی 350 ب کے تحت بھی اردو کو اس کا خاطر خواہ مقام مل سکتا ہے جو نہ ملا۔

ان دفعات کے علاوہ دفعہ 351 بھی بہت اہم ہے جس میں حکومت پر یہ ذمے داری عائد کی گئی ہے کہ وہ ہندی زبان اور آئین کے ضمیمہ آٹھ (Eight

(Schedule) میں شامل تمام زبانوں کی ترقی کی کوشش (Endeavour) کرے گی۔ خیال رہے کہ آئین میں کل 395 دفعات اور بارہ ضمیمے ہیں۔ ضمیمہ آٹھ میں بائیس تسلیم شدہ زبانوں بشمول اردو کی فہرست درج ہے۔ آئین ہند اپنے نفاذ کے 62 سالوں میں 97 سے بھی زائد مرتبہ ترمیم ہو چکا ہے۔ آخری ترمیم 12 جنوری 2012 کو ہوئی جس میں امداد باہمی کی سوسائٹی کے قوانین کا اضافہ کیا گیا ہے جو 13 جنوری 2012 کے گزٹ میں شائع ہوا ہے۔

ان دفعات کے علاوہ آئین کی دفعہ 351 بھی کافی اہمیت کی حامل ہے، اس دفعہ کے متن کو ہی نقل کر دینا مناسب ہوگا:

''دفعہ 351 وفاقی حکومت (Union of India) پر لازم (Duty) ہوگا کہ وہ ہندی زبان کو ترقی دے اور اس کو پھیلائے اور اس کو اس طرح بڑھاوا دے کہ وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیبوں کے تمام عناصر کے اظہار کا ذریعہ بنے۔ اس کی ہیئت میں مداخلت کیے بغیر ہندوستان اور آئین ہند کے ضمیمہ 8 میں درج دوسری ہندوستانی زبانوں کی ہیئت (Form) اسلوب (Style) اور اظہار (Expression) کو اپنے اندر سمیٹ کر اور اگر ضرورت پڑے یا مناسب ہو تو پہلے سنسکرت اور پھر دوسری زبانوں کی لفظیات لے کر اسے مالا مال کرے۔''

لسانیات سے متعلق حکومت کے جتنے ادارے ہیں وہ ہندی کو محض سنسکرت آمیز کرنے کو ہی ہندی کی ترقی کا ذریعہ مانتے ہیں جب کہ ہمارا دستور کچھ اور کہتا ہے یعنی اس کا منشا یہ بھی ہے کہ ہندی کو دوسری زبانوں اور ان کے اسالیب ولفظیات کو اختیار کر کے ترقی دی جائے۔ اگر اس دفعہ پر صحیح طور پر عمل درآمد کیا جائے تو آئین میں مذکور تمام زبانوں کو بہ شمول ہندی فائدہ پہنچے گا۔ زندہ زبانیں دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرتی رہتی ہیں جو زبانیں ایسا نہیں کرتیں وہ محدود رہتی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق آکسفورڈ ڈکشنری کے ہر نئے اڈیشن میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ دوسری زبانوں سے اپنائے گئے نئے لفظوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

آئین کی دفعہ 210 میں صوبائی حکومتوں کو یہ بھی اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے قانون ساز اداروں یعنی Legislative Assembly اور Legislative Council کی زبان ہندی، انگریزی یا کسی اور زبان کو اپنے کام کاج کی زبان طے کر سکتی ہے اور اس کا یہ اختیار آئین کے مذکورہ بالا باب سترہ (17) کے علی الرغم اور دفعہ 341 کے ماتحت ہوگا۔ ظاہر بات ہے سب صوبوں نے اپنی اپنی سرکاری زبان کو ہی اسمبلی اور کونسل کی زبان اختیار کر رکھا ہے لیکن اس دفعہ میں ایک بہت اہم جز شامل ہے جس کا ہم استعمال ہی نہیں کرتے اور وہ یہ کہ اسمبلی کے صدر (Speaker) اور کونسل کے صدر (Chairman) کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر کوئی رکن مقرر کردہ سرکاری زبان میں تقریر نہ کر سکتا ہو تو اسے ہاؤس میں اس کی اپنی مادری زبان میں بولنے کی اجازت دی جائے۔

مرکزی حکومت کا ایک اور اہم قانون ہے جس کا نام آفیشیل لینگویجز ایکٹ مجریہ 1963 (Official Languages Act) اس میں صوبے کے گورنروں کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ صدر جمہوریہ کی رضامندی سے یہ حکم جاری کر سکتے ہیں کہ صوبہ کے ہائی کورٹ (جن کی آئینی زبان انگریزی ہے) اپنے فیصلے، احکام، ڈگری کسی بھی دوسری زبان میں دے سکتے ہیں لیکن ان کے ساتھ کورٹ کے رکارڈ میں انگریزی کا ترجمہ بھی رکھا جائے گا۔ اس طرح اگر گورنر چاہیں تو اردو کو بھی ہائی کورٹ کے کام کاج کی زبان بنا سکتے ہیں جیسے اترپردیش میں گورنر نے بذریعہ نوٹیفکیشن ہندی کو ہائی کورٹ میں استعمال کی اجازت دے رکھی ہے جن کی بنیاد پر کئی ہائی کورٹ میں ہندی میں بھی کچھ جج فیصلے دیتے ہیں۔

اسی طرح مرکزی حکومت کے اور بھی بہت سے قوانین ہیں، مثلاً عوامی انتخاب ایکٹ (Representation of People's Act)، انڈین پوسٹ آفس ایکٹ، انڈین ریلوے ایکٹ اور ان کے رولس، بینکوں کے قوانین وغیرہ جس میں صوبوں میں صوبے کی زبان اور علاقائی زبان (Regional Language) میں بھی کام کاج کرنے کی اجازت ہے۔ لہٰذا ہر ایکٹ کی مجاز اتھارٹی (Authority) سے اگر یہ حکم نامہ جاری کرا دیا جائے کہ فلاں صوبے یا فلاں صوبے کے فلاں علاقے میں اردو علاقائی زبان تصور کی جائے گی تو اس محکمے کا بہت سا بلکہ سارا کام کاج اردو زبان میں بھی ہونے لگے گا۔

انھیں قوانین کا سہارا لے کر چند سال پیشتر محکمہ ریلوے نے اردو میں ریلوے ٹائم ٹیبل شائع کیا تھا۔ کچھ دن تو یہ ٹائم ٹیبل چند ریلوے اسٹیشنوں پر نظر آئے بعد میں وہ بھی غائب ہو گئے۔ اوّل تو ریلوے کے بک اسٹال والے اردو کا ٹائم ٹیبل رکھتے ہی نہ تھے اور جہاں رکھتے تھے وہاں بکتا نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے منگانا بند کر دیا اور بالآخر ریلوے نے اسے چھاپنا ہی بند کر دیا۔ کیا ہم نے کبھی ریلوے سے مانگ کی یا اس بات کا احتجاج کیا کہ ہم اردو کا ٹائم ٹیبل چاہتے ہیں یا یہ کہ اسٹیشنوں میں کوئی بھی اردو کا معیاری رسالہ یا جریدہ کیوں نہیں ملتا؟ حتیٰ کہ سرکاری اداروں کے رسائل مثلاً آج کل، اردو دنیا اور سائنس دنیا وغیرہ جو پہلے ملتے تھے اب وہاں نہیں ملتے۔ کیوں؟

اسی طرح اترپردیش الیکشن کمیشن نے ان حلقہ ہائے انتخاب میں جہاں اردو کے ووٹروں کی آبادی خاطر خواہ ہے، یعنی اترپردیش کے 25 پارلیمانی اور 130 صوبائی اسمبلی کے حلقوں کے لیے گزشتہ انتخابات میں اردو میں بھی ووٹر لسٹ کی اشاعت کی تھی مگر ہم نے اپنے حلقۂ انتخاب میں جا کر دیکھا کہ وہ امیدوار جو اردو کے نام پر بھی ووٹ مانگ رہے تھے ان کے بستوں میں بھی اردو کی لسٹ نہیں تھی کیوں کہ ان کے کارندے اردو سے نابلد تھے اور امیدوار بھی بس دستخط اردو میں کر سکتے تھے اور خود کو اردو والوں کے ووٹوں کا پیدائشی حقدار سمجھتے تھے۔ اب اگر آئندہ الیکشن میں کمیشن اس بنیاد پر اردو میں اپنے کاغذات شائع نہ کرے تو ذمے دار کون ہوگا؟

مذکورہ بالا تجزیے کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملک کے دستور میں خاطر خواہ مواد اور جواز موجود ہے جس سے اردو کی ترقی کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اعضائے معطّل کی طرح آئین کی مذکورہ دفعات میں روح پھونکنے سے اردو زبان کے آئین میں منظور شدہ حقوق کی بازیابی کی جاسکتی ہے۔ اس لیے اجتماعی کوشش اور سیاسی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔

اگر اردو کے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اور ان کے عہدے داران، یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کے ذمے داران، معروف ادبا و شعرا جو حکومت سے بڑے بڑے عہدے اور اعزازات حاصل کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور اردو کے عام شیدائی منصوبہ بند طریقے سے ایک اسکیم اور پلاننگ کے تحت کوشش کریں اور اس میں ان اردو دوستوں کی بھی معاونت لیں جو حکومت میں بھی شامل ہیں، یا اثر و رسوخ رکھتے ہیں تو مشکل نہیں کہ آئین کی ان غیر مستعمل دفعات میں خونِ عمل دوڑا دیں۔ ان کے حروف کو معنی پہنا دیں اور اردو کو اس کا کم سے کم وہ حق تو مل جائے جو دستور کی دفعات سے مترشح ہوتا ہے۔ ان دفعات کو بالقصد نظر انداز کر کے ہم دستورِ ہند کی روح کی خلاف ورزی کر رہے ہیں:

راہ اور رسم ہماری ہے بہت اس سے مگر
جسم دیکھا ہے، کبھی روح میں جھانکا ہی نہیں

نوٹ: یہ مقالہ شعبۂ اردو دھلی یونیورسٹی کے زیراہتمام منعقدہ سیمینار مورخہ 12 مارچ 2012 میں پیش کیا گیا۔

Mohd Abdul Qadeer, Senior Advocate High Court
D-909, Kraeli Colony, GTB Nagar Allahabad-16

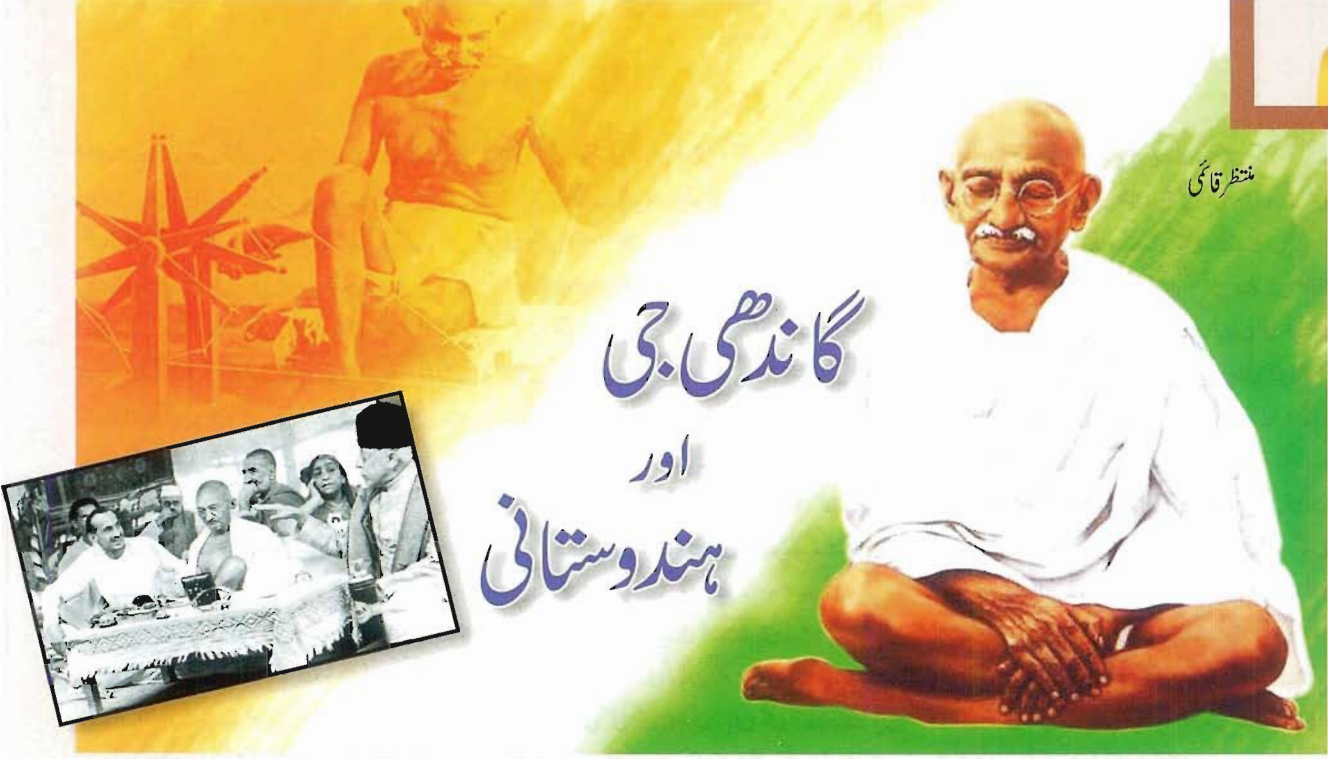

گاندھی جی اور ہندوستانی

منتظر قائمی

ہندوستان ایک ایسا کثیر لسانی ملک ہے جہاں نہ صرف یہ کہ نسلی، مذہبی اور تہذیبی رنگا رنگی اور امتیاز پایا جاتا ہے بلکہ یہ زبانوں اور بولیوں کی بھی ایک بڑی آماجگاہ کے طور پر دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ اردو اور ہندی دستورِ ہند کے آٹھویں شیڈول کی دو اہم زبانیں ہیں اور ان کا شمار ہندوستان کی دو بڑی جدید ہند آریائی زبانوں کے طور پر ہوتا ہے اور دونوں زبانوں کے آغاز وارتقا کے علاقے ایک ہی ہیں یعنی جن جن علاقوں میں کھڑی بولی مروج تھی انھیں خطوں کی یہ دونوں زبانیں پروردہ ہیں۔ عموماً یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ شمالی ہندوستان کی جدید زبانوں کی ماں سنسکرت ہے جسے ہندوستان کی سب سے قدیم زبان کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ سنسکرت بھی یہاں کی اصل زبان نہیں ہے بلکہ فارسی زبان سے اس کے قدیم مراسم اور قدیم اور جدید یوروپی زبانوں سے اس کے روابط اس بات کے غماز ہیں کہ سنسکرت بھی ہندوستان کی اصل زبان نہیں رہی ہے بلکہ یہ ویدوں کے عہد میں شمال مغرب کے راستے بھارت میں داخل ہوئی ہے تاہم اس بات کے بھی ثبوت ملے ہیں کہ دراوڑی تہذیب کے لوگ آریوں کی آمد سے قبل شمالی ہندوستان میں ہی رہتے تھے اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ آریائی قوم اور دراوڑی قوم کے ایک دوسرے سے اختلاط کے ساتھ دونوں قوموں کی زبانوں میں بھی باہم اختلاط ہوا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت سے ہی کھڑی بولی میں ترکی اور فارسی کے الفاظ اور تراکیب داخل ہونا شروع ہو گئے تھے جو اس وقت عوامی رابطے کی زبان کی شکل میں رائج تھی۔ پروفیسر مسعود حسن خاں کا خیال ہے کہ ''ہندوستان کی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کا داخلہ ہی اردو کی تخلیق کی ضمانت نہیں کرتا بلکہ جب لسانی اثرات ''زبان دہلی و پیرامنش'' میں نفوذ کرتے ہیں تب اردو کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے، اور یہ ہوتا ہے مسلمانوں کی فتحِ دہلی کے بعد۔''[1] رفتہ رفتہ اردو زبان جب معیاری روپ اختیار کرتی چلی گئی تو اس پر سے دیگر زبانوں اور بولیوں کے اثرات کم ہوتے چلے گئے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جتنا گہرا رشتہ اردو اور ہندی میں دیکھنے کو ملتا ہے شاید ہی دیگر دو زبانوں میں نظر آئے کبھی کبھی یہ یگانگی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اکثر دونوں کو ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے بس فرق اتنا سا ہے کہ ہندی نے اپنا فیضان سنسکرت اور اردو نے عربی فارسی سے زیادہ حاصل کیا ہے، جس کی بنا پر لفظیات کی سطح پر فرق نمایاں ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کی رسم خط علاحدہ علاحدہ ہے جس کے سبب لسانیاتی سطح پر اردو اور ہندی کو دو زبانوں کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ دونوں ہی زبانیں اپنے اپنے معتقدین کی تعداد کے لحاظ سے اس وقت اپنی علاقائی حدوں کو تجاوز کر کے دنیا کی دو بڑی اور اہم زبانوں میں شمار کی جاتی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سنیتی کمار چٹرجی نے بارھویں اور تیرھویں صدی میں ترکی فتح کے بعد سے شمالی ہند (مشرقی پنجاب سے بنگال تک) کی رائج زبان کا قدیم ترین اور آسان ترین نام 'ہندی' تحریر کیا ہے جو آج بھی عوام الناس کے درمیان موجود ہے۔[2] جس کو بعد کے زمانوں میں کبھی ہندی کبھی ریختہ کبھی ہندوی، اردوئے معلیٰ اور زبان حضرتِ دہلی جیسے متعدد ناموں سے پہچانا گیا۔ یہی وہ زبان ہے جس کا استعمال صوفی، سنتوں اور درویشوں نے اپنا پیغام اور تعلیمات عوام وخواص تک پہنچانے کے لیے کیا جو ہمیں امیر خسرو سے لے کر کبیر، تلسی، سورداس، جائسی، رس کھان، عبدالرحیم خان خاناں سے نظیر اکبرابادی تک کی شاعری میں اپنے اپنے علاقے کے اثرات کے ساتھ عوام الناس کی زبان کے طور پر ملتی ہے۔ اردو اور ہندی زبان کے تمام تر تنازعات کے باوجود بول چال کی سطح پر رابطے کی ایک ہی زبان ہے جس کو چاہے آسان اردو کہیں یا آسان ہندی۔

اسی بولی یا زبان کی پیروی ہمیں سنیما سے لے کر سیر وتفریح اور فنون کے منجملہ مظاہر کی زبان میں نظر آتی ہے اور یہی وہ زبان ہے جس کی وکالت ہندوستان کی آزادی کے جدوجہد کے دوران بابائے قوم مہاتما گاندھی نے کی تھی جس کے لیے انھوں نے لسانی تنازعے کے حل کے طور پر قوم کے سامنے 'ہندوستانی' زبان کی تجویز رکھی تھی۔ یعنی ہندوستان کی قومی زبان ایک ایسی زبان ہو جو کہ آسان اور رواں ہندی اردو کا اختلاط ہو جسے ہر کوئی سمجھتا اور بولتا ہے۔

ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے دوران یہ سوال بڑے زور وشور سے اٹھ رہا تھا کہ ہماری قومی زبان کیا ہوگی اور اس اہم سوال پر ہمارے رہنما نہایت متفکر تھے۔ گاندھی جی کی زندگی میں ہی یہ تنازعہ کافی بڑی شکل اختیار

کر گیا تھا جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندی اور اردو کو ہندوستانیوں کی زبان سے زیادہ دو مذاہب کی زبان مان لیا گیا جس کی وجہ سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے پیروکار ایک دوسرے کے آمنے سامنے صف آرا ہو گئے۔ ایسے نازک حالات میں مہاتما گاندھی نے اس تنازعے کو ختم کرنے کے لیے قومی زبان کے طور پر ایک مشترکہ ''ہندوستانی'' زبان کا مشورہ دیا جسے ہندی۔ ہندوستانی یا ہندی اردو کے ذیلی عنوان سے بھی تعبیر کیا گیا۔ یوں تو اردو کو بھی عہد گزشتہ میں ہندی، ہندوی، ریختہ جیسے ناموں سے پہچانا جاتا رہا ہے۔ اندور میں 1918 میں آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کی صدارت کے دوران اپنے ہندوستانی زبان کے عقیدے کو مزید تقویت بخشتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

''ہندی سے میری مراد وہ زبان ہے جو کہ شمالی ہندوستان میں رائج ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں ہی مشترکہ طور پر استعمال کرتے ہیں اور جس کو ہندو اور مسلمان دونوں ہی بآسانی سمجھ لیتے ہیں اور جس کی لفظیات بھی مشترکہ ہے۔''[3]

گاندھی جی کے ان خیالات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بطور قومی زبان وہ ہندوستان میں ایک ایسی زبان کا خواب دیکھ رہے تھے جس میں مذکورہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کو انگریزی کی ضرورت یا اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ انھیں اس بات سے بھی اعتراض نہیں ہے کہ حصول علم اور روزگار کے لیے انگریزی زبان سیکھی جائے بلکہ ان کا اعتراض انگریزی کے حوالے سے محض اتنا تھا کہ انگریزی زبان کو اس قدر اہمیت نہ دی جائے کہ اس کے سامنے ہماری قومی زبان ہیچ نظر آئے۔ جدید اور عصری علوم کے لیے انگریزی کا سیکھنا تو ضروری ہے اور یہ ایک بین الاقوامی زبان بھی ہے لیکن اسی کو سب کچھ مان لینا ٹھیک نہیں ہے۔ درحقیقت یہ خیال ان لوگوں کے لیے ایک چیلنج کی نوعیت رکھتا ہے جنھوں نے انگریزی کو ہی سب کچھ مان لیا ہے اور ان کو اس خیال پر ذرہ برابر بھی ایمان نہیں تھا کہ کبھی ہماری قومی زبان بھی ترقی یافتہ ہو کر انگریزی کے مدمقابل کھڑی ہوسکتی ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے اکثر لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ جیسے مغل عہد میں سرکاری، دفتری اور امرا و شرفا کی زبان فارسی تھی اسی طرح برطانوی راج میں انگریزی زبان کی وہی حیثیت اور وقعت تھی۔ تاریخی اعتبار سے جب ہم زبانوں پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ زبانیں جن کا ایک خاص عہد میں تسلط رہا ہے ان کا اُس خاص زبان استعمال کرنے والوں سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے یعنی یہ کہ اس زبان کا استعمال کرنے والوں کی تعداد کتنی ہے۔ عموماً کسی بھی نظام کے ماتحت ہر عہد مجموعی طور پر دو قسم کی زبانوں سے عبارت رہا ہے ایک عوام کی اور دوسری خواص کی۔ یہی وہ نظریہ ہے جو زبان کو معیاری اور غیر معیاری بناتا ہے۔ زبان ترقی کی منزلیں طے کر کے جب ادبی سطح تک آجاتی ہے تو وہ معیاری قرار دی جانے لگتی ہے اور جب وہی بولی یا زبان عوام میں رہتی ہے تو غیر معیاری یا عوامی زبان کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس لیے ہمارے یہاں بھی جب قومی زبان کا مسئلہ اٹھا تو کچھ لوگوں کو یہی لگا کہ انگریزی تو ہماری پہلے ہی سے قومی زبان ہے اور یہ چند برسوں میں پورے ہندوستان کی زبان ہو جائے گی۔ مہاتما گاندھی نے اس قسم کے خیالات کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح ہندوستان میں ہم کو ریلوے اور انتظامی خدمات حاصل کرتے وقت ذرا سی بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی ہے اسی طرح انگریزی زبان بھی کیونکہ انگریز ہمارے درمیان کچھ اچھی چیزیں بھی چھوڑ کر گئے ہیں لہٰذا ہمیں کہیں کہیں افادیت پسندی اپنانا چاہیے۔ حالانکہ اس سے قبل 1916 میں بنارس ہندو یونیورسٹی کی رسمِ سنگ بنیاد کی تقریب میں انھوں نے اساتذہ اور طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''انڈین نیشنل کانگریس اپنے اجلاس انگریزی میں کرتی ہے جو کہ احمقانہ ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو کہ انگریزی سمجھ سکتے ہیں۔ 1916 میں بمبئی میں کچھ مقررین نے ہندی میں اظہار خیال کیا تھا اور انھیں عوام نے بڑے سلیقے سے سنا اور داد دی۔ میں یہاں انگریزی میں اس لیے تقریر کر رہا ہوں کیوں کہ یہی روایت رہی ہے لیکن کیا آپ سب کو لگتا ہے کہ انگریزی زبان ہماری قومی زبان ہوگی تو عوام کا جواب نفی تھا۔''[4]

گاندھی جی کے ان خیالات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ھے کہ بطور قومی زبان وہ ہندوستان میں ایک ایسی زبان کا خواب دیکھ رھے تھے جس میں مذکورہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہوں۔اس کا یہ مطلب ھر گز نہیں ھے کہ ان کو انگریزی کی ضرورت یا اھمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ انھیں اس بات سے بھی اعتراض نہیں ھے کہ حصول علم اور روزگار کے لیے انگریزی زبان سیکھی جائے بلکہ ان کا اعتراض انگریزی کے حوالے سے محض اتنا تھا کہ انگریزی زبان کو اس قدر اھمیت نہ دی جائے کہ اس کے سامنے ھماری قومی زبان ھیچ نظر آئے۔ جدید اور عصری علوم کے لیے انگریزی کا سیکھنا تو ضروری ھے اور یہ ایک بین الاقوامی زبان بھی ھے لیکن اسی کو سب کچھ مان لینا ٹھیک نہیں ھے۔

اس کے باوجود انگریزی کے حامیوں کے حوصلے پست نہیں پڑے جن کا کہنا تھا کہ اس سے ملک کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے مگر اس قسم کے خیالات رکھنے والوں کی ایک نہیں چلی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد کے برسوں میں گاندھی جی نے خود ہی تمام جگہ تقاریر اور جلسے جلوسوں میں ہندی زبان کا استعمال شروع کر دیا۔ وہ اب ہندی میں تقریر کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کا ایک بڑا طبقہ ہندوستانی بولتا ہے اور اسے آسانی سے سمجھ بھی لیتا ہے۔ اس تحریک کو منظم ہوتے ہوتے انڈین نیشنل کانگریس مہاتما گاندھی کے زیر سایہ ایک ایسی عوامی تنظیم بن کر ابھری جس میں عوامی تحریک کا جذبہ اور عمل دیکھنے کو ملتا ہے جس کے تحت 'پورن بھاشا سوراج' کا مطالبہ ہوا تھا۔ یہی وہ مناسب وقت تھا جب مہاتما گاندھی نے 1925 میں کانپور کے اجلاس میں کانگریس پر زور دیا کہ وہ ہندوستانی کو اپنانے کی قرارداد پیش کرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کے اجلاس ہندوستانی زبان میں ہونے لگے اور ایسے لوگ جن کو ہندوستانی نہیں آتی وہ انگریزی یا اپنی صوبائی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے تھے۔ یہ کسی تاریخی حصولیابی سے کم اہمیت نہیں رکھتی ہے کیونکہ اس وقت کا ہندوستان انگریز اور انگریزی زبان کی گرفت سے رفتہ رفتہ آزاد ہونے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستانی زبان شمالی ہندوستان میں بڑی مقبول ہوگی یہاں تک کہ گجرات اور مہاراشٹر جیسی ریاستیں بھی بڑی آسانی سے اسے قبول فرمالیں گی۔ البتہ جنوبی ریاستوں میں جہاں لوگ وہاں کی علاقائی زبان استعمال کرتے ہیں خصوصاً تمل زبان والوں کے لیے بڑا ہی دشوار گزار مرحلہ ہوگا۔ ہندی کے خلاف سب سے زیادہ غم و غصہ بھی جنوبی ریاستوں میں ہی دیکھنے کو ملا۔

ہندی یا ہندوستانی کو جن معنوں میں استعمال کیا جاتا رہا ہے اگر اس پر غور کیا جائے تو اس کی رو سے گاندھی جی کی 'ہندوستانی' زبان کی وکالت میں فقط اردو اور ہندی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر وہ زبان جو یہاں رائج ہے وہ ہندوستانی زبان کے زمرے میں آتی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندی اردو کے درمیان جب بھی

کوئی نااتفاقی یا اختلاف کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو 'ہندوستانی' زبان آپسی مصالحت اور صلحِ کل کے طور پر سامنے آجاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ 'ہندوستانی' فقط رابطے کی زبان کی حد تک شناخت کی جاسکتی ہے اس کے علاوہ دیگر اہم امور میں مثلاً دفتری نظام، عدالت اور تعلیم جیسے اہم شعبوں میں اس زبان کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا۔ اب جبکہ ہندی اور اردو لسانی اور ادبی سطح پر اپنی علاحدہ علاحدہ شناخت رکھتی ہیں ایسے میں صلحِ کل کا یہ نسخہ دونوں ہی زبانوں کے علاحدہ علاحدہ وجود کے حامیوں کو زبان کے وجود کے لیے ایک ممکنہ خطرہ کی طرح محسوس ہوتا ہے اور دونوں ہی خیموں میں اضطراب اور غیر اطمینانی کی فضا پائی جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ جس طرح سب کے لیے کسی ایک مذہب کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا اسی طرح سب کے لیے کسی ایک زبان کا انتظام بڑا ہی مشکل اور وقت طلب امر ہے۔

حالانکہ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر آزاد ہندوستان کے لیے یک لسانی فارمولے کے حق میں تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ قومی زبان فقط ایک ہونا چاہیے اور متعدد ریاستوں کے ذریعے علاقائی زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ دینا مناسب نہیں ہے کیونکہ لسانی ریاست میں سرکاری زبان کے بطور ایک علاقائی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جانا گویا ایک آزاد ملک بنانے جیسا ہے۔ اس سے ملک کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''ایک زبان لوگوں کو جوڑ سکتی ہے جبکہ دو زبانیں یقیناً لوگوں کو تقسیم کر دیں گی۔ یہ ایک سخت قانون ہے لیکن تمدن زبان کے ذریعہ ہی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ ہندوستانی اتحاد کے خواہاں ہیں اور ایک عمومی کلچر تعمیر کرنا چاہتے ہیں لہٰذا تمام ہندوستانیوں کا یہ عینی فریضہ ہے کہ ہندی کو اپنی زبان کے طور پر قبول کریں۔''[5]

ڈاکٹر امبیڈکر کا خیال تھا کہ لسانی اعتبار سے ریاستیں تشکیل دینے میں خطرہ لاحق ہے اور اتنا ہی خطرہ لسانی اعتبار سے ریاست کو تشکیل نہ دینے میں بھی ہے۔ ایک ہوشمند اور ماہر حکمراں پہلے خطرے کو ٹال بھی سکتا ہے مگر دوسرے خطرے کو تو کسی بھی صورت ٹالا نہیں جا سکتا۔ اس معاملے پر وہ اس قدر شدید ہو گئے کہ انھوں نے یہ تک کہا کہ اگر ہندوستانی یک لسانی فارمولے کو قبول نہیں کرتے ہیں تو انھیں ہندوستانی ہونے کا کوئی حق نہیں ہے حالانکہ ان کے خیالات کو قبولیت کا درجہ حاصل نہ ہوسکا۔ گاندھی جی ڈاکٹر امبیڈکر کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے کیونکہ ان کا ماننا تھا کی قومی سطح پر ایک زبان ہو اور ہندوستان کے صوبے اپنی مقامی زبان یا زبانوں کو فروغ دیں۔ بین ریاستی یا مرکزی سطح پر کام کاج کے لیے ہندی زبان کا استعمال ہو۔

موجودہ دور میں عدالت اور تعلیم کے شعبے میں نوعیت بدل چکی ہے۔ عدالتوں میں ضلعی سطح تک ریاستی زبان میں بے جھجک عدالتی امور کو انجام دیتے ہیں لیکن جیسے ہی معاملہ بڑی عدالتوں یا عدالتِ عظمیٰ کا آتا ہے تو ریاستی زبانیں ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں نتیجتاً یہاں تمام امور کے لیے انگریزی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تعلیم کے شعبے میں بھی کچھ اسی قسم کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے میٹرک یا انٹر میڈیٹ تک یا یوں کہیں اسکول ڈراپ آؤٹ سطح تک علاقائی زبانیں کسی حد تک اپنے احکامات بحسن و خوبی انجام دیتی ہیں مگر جیسے ہی اعلیٰ تعلیم تک معاملہ پہنچتا پھر وہاں بھی بڑی عدالتوں جیسی نوعیت ہو جاتی ہے۔ حالانکہ بابائے قوم نے اس شعبے میں قومی زبان پر ہی زور دیا تھا ان کا کہنا تھا کہ ہماری تمام تر تعلیم ہماری اپنی زبانوں کے میڈیم سے ہوگی۔ لیکن آزادی کے ساٹھ سے زیادہ برس گزر جانے کے بعد بھی آخر آج تک ہم اس ہدف کو حاصل کیوں نہیں کر پائے؟ ہم کو قومی زبان یا کسی ریاستی زبان میں تعلیم دینے کے لیے اُس خاص زبان میں معیاری کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم میں آج بھی انگریزی کا غلبہ ہے البتہ ادب اور سماجیات سے متعلق شعبوں میں حالات نسبتاً قدرے غنیمت ہیں۔ اس کے لیے مختلف حکومتوں نے متعدد اقدامات کیے اور اس کے ذریعے سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق اصطلاحات وضع کرنے پر خوب دھیان مرکوز کیا گیا جو ہنوز جاری ہے۔

جس وقت مہاتما گاندھی نے 'ہندوستانی' کو بطور قومی زبان رائج کرنے کی مہم چھیڑی تو اس وقت رسمِ خط کا معاملہ بھی سامنے آیا۔ رسمِ خط کے ذیل میں ماہرینِ لسانیات کا ماننا ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانیں ایک دوسری زبان سے تھوڑا بہت فرق کے ساتھ مختلف رسمِ خط کا استعمال کرتی ہیں۔ ہندوستان میں رسمِ خط کی سطح پر جدید ہند آریائی زبانوں میں زیادہ تر ایک ہی رسمِ خط کا استعمال تھوڑا بہت فرق کے ساتھ کرتی ہیں البتہ اردو کا رسمِ خط عربی۔فارسی رسمِ خط ہے۔ مہاتما گاندھی نے جب قومی زبان کے بطور 'ہندوستانی' زبان کو پیش کیا تو اس کے لیے دو رسمِ خط یعنی دیوناگری اور عربی۔ فارسی رسمِ خط کا بھی اہتمام کرنے کی سفارش کی۔ بقول پروفیسر جی سندرا ریڈی زبان سے متعلق ان کی آرا یہ ہیں:

'' ہندوستان کی قومی زبان انگریزی نہیں بلکہ ہندوستانی ہے جو کہ آسان اور رواں ہندی۔ اردو کا اختلاط ہے۔ لہٰذا ہندوستان کے عوام پر یہ لازم ہے کہ وہ دونوں ہی رسمِ خط میں ہندوستانی کو سیکھنے کی عادت ڈالیں۔ ہندوستانی نہ ہی سنسکرت زدہ ہندی اور نا ہی فارسی زدہ اردو ہونی چاہیے بلکہ ان دونوں کا ایک خوبصورت امتزاج ہونا چاہیے۔ اس زبان کو کسی بھی علاقائی زبان سے لے کر بدیسی زبان سے الفاظ اخذ یا قبول کرنے کی آزادی ہو اور ایسی امیر اور مستحکم ہو کہ انسانی جذبات اور خیالات اس میں بآسانی بیاں ہوسکیں۔''[6]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی زبان یا بولی نے آزادی کی جد و جہد میں لوگوں کو یکجا اور متحد کرنے میں، متعدد تحریکوں، جلسوں اور جلوسوں میں اور عوام کا عوام سے رابطہ قائم کرنے میں بڑا نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے اور یہ آج بھی ہمارے درمیان عوامی رابطے کی ایک اہم زبان ہے۔ اس سے کم سے کم یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادبی اور لسانی سطح پر نہ سہی لیکن کم از کم بول چال کی سطح پر اردو اور ہندی مشترک ہیں اور یہی زبان پورے ہندوستان میں اردو اور غیر اردو داں ہندوستانی جن کی مادری زبان ہندی یا اردو نہیں ہے وہ رابطے کے لیے اسی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور آج بھی یہ زبان لنگوا فرینکا کے منصب پر فائز ہے۔

حواشی:

1. مسعود حسن خاں، مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص76
2. سنیتی کمار چٹرجی، ہند آریائی اور ہندی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ص125
3. Dr. B.R. Saxena, Gandhiji's Solution to Language Problems in India, Mahatma Gandhi Memorial Research Centre Hindustani Prachar Sabha, Bombay, 1972, p. 7
4. ایضاً، ص7
5. Dr. B.R. Saxena, p.25
6. Gandhiji's Approach to the Language Problem: Its Relevance Today in "The Language Problem in India" ed. by Prof. G.S. Reddy, National Publishing House, New Delhi, 1973, pp. 77-78

◘

Muntazir Qaiami, Room No.: 123-E, Mahanadi Hostel, Jawaharlal Nehru University, New Delhi - 110067

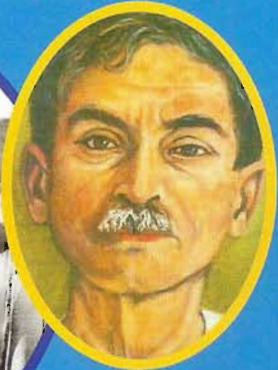

عبدالرشید خان

پریم چند کی تخلیقات پر گاندھی جی کا اثر

تحریک آزادی کے علمبردار مہاتما گاندھی کی سوچ و فکر نے ہندوستانی سیاست کا ناک ونقشہ بدلنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے سماجی، اقتصادی، معاشی اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں تغیر وتبدل لانے میں بھی نمایاں رول ادا کیا۔ چنانچہ ادب اردگرد کے ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ گاندھی جی کی تحریک نے بھی ہندوستان کی مختلف زبانوں میں لکھے جانے والے ادب کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اُردو ادب نے نہ صرف اس تحریک کا اثر قبول کیا بلکہ تحریک کے شانہ بہ بشانہ چل کر انتہائی اہم کردار بھی نبھایا اور 'انقلاب زندہ باد' جیسا نعرہ دے کر مجاہدین آزادی کے لہو کو گرمانے کا سامان فراہم کیا۔ شعری اور نثری ادب میں تحریک آزادی سے وابستہ مختلف النوع موضوع پر لکھا گیا۔ شاعروں نے گاندھی جی کی رہنمائی کے اصولوں کی تحسین کی۔ تحریک آزادی کو کامیابی کے ساتھ ہمکنار کرنے کے لیے، ان کی تدابیر اور ملک پر ان کے احسانات جیسے موضوعات پر ہزاروں نظمیں تخلیق کی گئیں۔ اُردو شاعری کی طرح اُردو نثر میں بھی گاندھی جی کی ان سیاسی خدمات کی ستائش کی گئی جن کے لیے سارا ملک ان کا احسان مند ہے۔ ڈراما، ناول اور افسانہ جیسی نثری اصناف میں گاندھی جی کی انسانی ہمدردی اور سیاست پر بہت کچھ لکھا گیا۔ ان تینوں نثری صنفوں میں پائے جانے والے بعض کردار وہی مجاہدین آزادی ہیں جنھوں نے ملک کو انگریزی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ اُردو میں ایسے سیکڑوں ناول اور افسانے ہیں جن کا تعلق گاندھی جی اور ان کی سیاسی تحریک کے ساتھ ہے۔ افسانہ نگاری کے سرخیل منشی پریم چند کے افسانوں اور ناولوں پر گاندھی تحریک کا گہرا اثر ہے۔

''یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ پریم چند 1928 تک مہاتما گاندھی کے زیرِ اثر رہے اور انھوں نے اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی کے بیشتر مسائل کو مہاتما گاندھی کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اس دور کے ہندوستان کی تمام سماجی اور سیاسی تحریکیں جو پریم چند کے فن کا موضوع تھیں مہاتما گاندھی کی قیادت میں آگے بڑھ رہی تھیں''[1]

گاندھی جی کی رہنمائی میں تحریک آزادی کا زمانہ منشی پریم چند کی ادبی شخصیت کے ابھرنے کا زمانہ تھا۔ وہ ملک کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشی حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ ان کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ انگریز دھوکہ بازی کر کے ملک پر قابض ہوئے اور نہتے لوگوں پر مظالم ڈھائے۔ لہٰذا ان کو انگریزی حکومت اور انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ گاندھی جی کو اپنا ہم خیال راہنما پا کر پریم چند بھی ان ہی کی راہ پر چل پڑے اور گاندھی تحریک کے اصولوں کو لفظی جامہ پہنا کر قلمی جہاد شروع کیا۔ وہ گاندھی جی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور جدوجہد میں شامل ہو گئے۔۔

''یہ 1920 کا واقعہ ہے۔ ان دنوں تحریکِ عدم اشتراکِ عمل زوروں پر تھی۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہو چکا تھا۔ ان ہی دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا۔ غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا۔ دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ تمام ضلع کی عقیدت مند پبلک دوڑی آئی تھی، ایسا مجمع اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے جیسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آ گئی۔ اس کے دو چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیا''۔[2]

منشی پریم چند تلوار و تفنگ اٹھانے کے بجائے قلم اٹھا کر تحریک آزادی میں شامل ہو گئے۔ ان کی تخلیقات نے نہ صرف ہندوستانیوں کا حوصلہ بڑھایا بلکہ انگریزوں کی نیند بھی حرام کر دی۔ انھوں نے اپنی تحریر کو ہندوستان اور ہندوستانیوں کی بہبودی اور بہتری کے لیے وقف کیا۔ 3 جون 1930 کو پریم چند نے پنڈت بنارسی داس صاحب چترویدی ایڈیٹر وشال بھارت کلکتہ کے نام ایک خط میں اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں لکھا تھا۔

''میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگِ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہشمند نہیں ہوں۔ کھانے کو بھی مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں لیکن ان کا مقصد بھی حصولِ آزادی ہی ہو۔ اپنے دونوں لڑکوں کے لیے بھی میں کوئی منصوبہ نہیں رکھتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایماندار، مخلص اور مستقل مزاج ہوں۔ عیش پسند اور دولت پرست اور خوشامدی اولاد سے مجھے نفرت ہے۔ میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ دھیان ہے۔ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دال روٹی اور معمولی کپڑے میسر ہو جائیں''۔[3]

تحریکِ آزادی میں منشی پریم چند کی شرکت فقط تحریر تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ جہاں چاہتے تقریر سے بھی کام لیتے تھے۔ وہ ترکِ موالات کے بہت بڑے حامی تھے اور عملی طور پر اس کو کامیاب بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ ان کے ایک دوست ایڈیٹر زمانہ نے اپنے مضمون میں پریم چند کی عملی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''میرے یہاں ایک مرتبہ لڑکی کی شادی کے موقعہ پر دیگر احباب کے ساتھ چند انگریز حکام کی بھی دعوت ہوئی تھی مگر پریم چند نے اس کو پسند نہ کیا، اور ایک خط میں لکھا کہ آپ نے انگریز حکام کی دعوت ناحق کی، آخر اس سے کیا فائدہ سمجھا، جہاں میں سمجھتا ہوں۔ یہ خیال ان کے ذہن نشین ہو گیا تھا کہ جب انگریز ہم ہندوستانیوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔ تو ہم لوگوں کو بھی ان سے

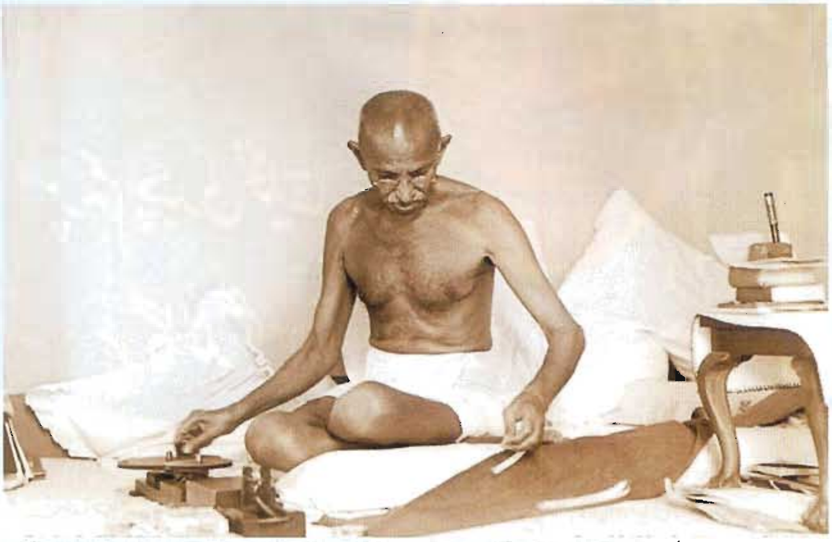

دور ہی رہنا چاہیے‘‘4

گاندھی جی کو اس بات کا بہ شدت احساس تھا کہ چھوت چھات، نااتفاقی اور وطن کے ساتھ محبت کی عدم موجودگی ملک کی سالمیت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ لہٰذا وہ ان تینوں چیزوں کی اہمیت پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ وہ چھوت چھات کی بیماری کو نہ صرف ہریجنوں بلکہ اعلیٰ ذات کے لوگوں کے لیے بھی انتہائی مضر قرار دیتے تھے۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کا آخری دور انتہائی پیچیدہ اور نازک تھا۔ مالی بحران نے عوامی زندگی کو حد سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ ہر طرف سیاسی تحریکوں نے سر اٹھایا تھا۔ مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہہ تھی۔ غریب طبقہ کسمپرسی کے عالم میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ملک میں گاندھی جی کی رہنمائی میں عدم تعاون کی تحریک دن بہ دن زور پکڑ رہی تھی۔ سیاسی افراتفری کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی شخص کو سکون و قرار حاصل نہیں تھا۔ ترکِ موالات، گول میز کانفرنس کا انعقاد، سائمن کمیشن کی آمد نے یہاں کے سیاسی ماحول میں گڑبڑی پیدا کی تھی۔ ان سیاسی حالات سے متعلق جانکاری حاصل کرنے کے لیے پریم چند کے افسانوں کا مطالعہ کرنا کافی ہے کیونکہ انھوں نے ان تمام حالات کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ کہانی ’آخری تحفہ‘ میں سودیشی تحریک اور چرخہ تحریک کی عکاسی کی گئی ہے۔ ’آشیانہ برباد‘ 1919 کو جلیانوالہ باغ میں پیش آنے والے خونی واقعے کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانہ ’قاتل‘ گاندھی جی کے عدمِ تشدد پر مبنی ہے۔ اس میں عدم تشدد کے اصولوں اور اس کے مثبت نتائج کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

’’آج ہندو مذہب میں جس طرح چھوت چھات برتا جاتا ہے وہ میرے خیال میں خدا اور انسان دونوں کے تئیں گناہ ہے اور ایسا زہر ہے جو آہستہ آہستہ ہندو مذہب کی قوتِ حیات کو ختم کیے جا رہا ہے۔ میرے خیال میں اگر پورے ہندو شاستر کو دیکھا جائے تو اس سے چھوت چھات کی کسی بھی طرح تصدیق نہیں ہوتی۔ اس برائی نے اونچی ذات والوں اور اچھوتوں دونوں کو گراوٹ کا شکار بنایا ہے۔ اس کی وجہ سے لگ بھگ چار کروڑ افراد کی ترقی کے راستے بند ہیں۔ انھیں زندگی کی عام سہولیات بھی میسر نہیں۔ لہٰذا چھوت چھات جتنی جلد ختم ہوجائے اتنا ہی یہ ہندو مذہب کے لیے، ہندوستان کے لیے اور تمام بنی نوع انسان کے لیے اچھا ہوگا‘‘۔5

پریم چند نے اپنی کہانیوں میں چھوت چھات کے نام پر ہونے والی ناانصافی، ظلم و بربریت اور حق تلفی کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔ افسانہ ’تالیف قلوب‘ اسی معاملے سے متعلق ہے۔ اس میں سماج کے اُس طبقے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو فقط زبان سے ہریجنوں کی خیر خواہی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے اور دل ہی دل میں ان سے نفرت کرتا ہے۔

منشی پریم چند تلوار و تفنگ اٹھانے کے بجائے قلم اٹھاکر تحریک آزادی میں شامل ہوگئے۔ ان کی تخلیقات نے نہ صرف ہندوستانیوں کا حوصلہ بڑھایا بلکہ انگریزوں کی نیند بھی حرام کردی۔ انھوں نے اپنی تحریر کو ہندوستان اور ہندوستانیوں کی بہبودی اور بہتری کے لیے وقف کیا۔

’دودھ کی قیمت‘ بھی چھوت چھات کے خلاف ایک بہترین کہانی ہے۔ گاؤں کے زمیندار ٹھاکر مہیش ناتھ کے نوزائیدہ بچے سُریش کی پرورش ایک اچھوت عورت بھونگی کرتی ہے جو اصل میں بھنگن ہے۔ وہ اُسے اپنا دودھ پلاتی ہے اور اپنے بچے منگل کو بازاری دودھ پر پالتی ہے۔ ایک سال کے بعد بھنگن کا دودھ چھڑایا جاتا ہے تاکہ مذہب پر آنچ نہ آجائے۔ بھنگن اور اس کے شوہر گودڑ کی موت واقع ہونے کے بعد ان کا یتیم بیٹا منگل اپنے کُتے ’ٹامی‘ کے ساتھ ٹھاکر مہیش ناتھ کے گھر میں پرورش پاتا ہے۔ ایک دن بڑی ذلت کے ساتھ منگل کو یہاں سے نکال دیا جاتا ہے لیکن اس کا دوست ٹامی اس کو یہ تذلیل برداشت کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

’’اس طرح کی ذلتیں تو زندگی بھر سہنی ہیں۔ یوں ہمت ہارو گے تو کیسے کام چلے گا۔ مجھے دیکھو نا جب کسی نے ڈنڈا مارا تو چلا اٹھا۔ پھر ذرا دیر بعد دُم ہلاتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ ہم دونوں اسی لیے بنے ہیں بھائی‘‘۔6

مذکورہ کہانی میں ہریجنوں کے ان حالات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے جنھوں نے ان کو حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ انسانی حقوق سے محروم تھے، ان کی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، تعلیم حاصل کرنے، مذہبی کتابوں کو چھونے، مندروں میں داخل ہونے پر پابندی تھی۔ ’صرف ایک آواز‘ اور ’کفن‘ ہریجنوں کی حالتِ زار سے متعلق دو اہم افسانے ہیں۔

ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جو کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ یہاں کے لوگ مختلف مذاہب اور فرقوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی زبان، رنگ اور نسل جداگانہ ہے۔ یہاں کی مشترکہ تہذیب کو محفوظ رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ لوگ وطن کی سرزمین کے ساتھ گہری محبت رکھیں۔ مہاتما گاندھی نے بھی ہندوستان کی بقا اور خوشحالی کے لیے جذبۂ حب الوطنی کو انتہائی اہم قرار دیا ہے۔

’’ہندو اور مسلمان، دونوں ہی بھارت کے بیٹے ہیں۔ جو ماں ہمیں جنم دیتی ہے وہ عزت، احترام اور عبادت کی مستحق ہے۔ ایسی عبادت سے روح پاکیزہ بنتی ہے۔ یہ صورت تو ماں کے تئیں ہے۔ مادرِ وطن کے تئیں کتنا احترام اور سلوک ہم پر واجب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہم اسی ماں کے آغوش میں پھل پھول کر بڑے ہوتے اور پھر اسی ماں کی آغوش میں سما جاتے ہیں۔ وہ سبھی لوگ جو اس ملک میں پیدا ہوئے ہیں اور جو اسے اپنا ملک سمجھتے ہیں، وہ اسی دھرتی کے بیٹے ہیں۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا عیسائی، سکھ ہوں یا جین، لہٰذا وہ بھائی بھائی

ہیں اور ایک ایسے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں جو خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط ہے''۔ 7

حب الوطنی سے متعلق گاندھی جی کے خیالات کو عام کرنے میں منشی پریم چند نے نمایاں کام انجام دیا۔ ان کے بیشتر افسانے جذبہ حب الوطنی کو اُبھارنے پر منتج ہوتے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ سوز وطن اسی موضوع سے متعلق ہے۔ مجموعے کی پہلی کہانی میں پریم چند نے خون کے اُس قطرے کو دنیا کا سب سے انمول رتن قرار دیا ہے جو فقط وطن کے لیے ٹپکایا جائے۔ دوسری کہانی 'شیخ مخمور' کا کردار وطن پرستی کے جذبات سے مخمور ہے۔ تیسری کہانی 'یہی میرا وطن ہے' کا کردار امریکہ میں ساٹھ سال گذارنے کے باوجود ہندوستان کی سرزمین پر مرنے کا متمنی ہے وہ گنگا کے کنارے بیٹھ کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

''ہاں ہاں یہی میرا دیس ہے۔ یہی میرا پیارا وطن ہے۔ یہی میرا بھارت ہے اسی کے دیدار کی اور اسی کی خاک میں پیوند ہونے کی حسرت دل میں تھی''۔ 8

'قاتل' حُب الوطنی کے موضوع پر ایک جاندار کہانی ہے۔ کہانی کا ہیرو دھرم ویر اپنی ماں کے ساتھ ہم کلام ہو کر مادرِ وطن کی عظمت بیان کرتے ہوئے اس کے ساتھ والہانہ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ جنم دینے والی ماں سے بھی زیادہ اہمیت مادرِ وطن کو دیتا ہے کیونکہ اس نے ان دونوں کو جنم دیا ہے۔

''تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے اسے تمھارے قدموں پر نثار کرسکتا ہوں لیکن مادرِ وطن نے تمھیں اور مجھے دونوں ہی کو زندگی عطا کی ہے۔ اور اس کا حق افضل ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع ہاتھ آجائے کہ مجھے مادرِ وطن کی حمایت کے لیے تمھیں قتل کرنا پڑے تو میں اس ناگوار فرض سے بھی منہ نہ موڑ سکوں گا۔ آنکھوں سے آنسوں جاری ہوں گے لیکن تلوار گردن پر ہوگی''۔ 9

ہندوستان مشترکہ تہذیب کا حامل ملک ہے یہاں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ گاندھی جی کو اس بات کا یقین تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کے جابرانہ قبضے سے آزاد کرانے کے لیے مختلف قوموں کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے قومی یکجہتی کا نعرہ دے کر تمام ہندوستانیوں کو بلا امتیاز مذہب و ملت، رنگ و نسل، علاقہ اور زبان تحریک آزادی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ان کے اس اثر انداز پروگرام کے تحت ہندوستان کے کروڑوں لوگ میدانِ عمل میں کود پڑے جنھوں نے بڑی بہادری کے ساتھ جنگِ آزادی

میں حصہ لیا اور نصرت پائی۔

''حقیقت میں بھارت میں جتنے لوگ ہیں، اتنے ہی مذہب ہیں۔ لیکن جو لوگ قومیت کے جوہر سے باخبر ہیں وہ ایک دوسرے کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتے۔ اگر ہندوؤں کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں صرف ہندوؤں کو رہنا چاہیے تو وہ خواب کی دنیا میں سانس

پریم چند نے اپنی کہانیوں میں چھوت چھات کے نام پر ہونے والی ناانصافی، ظلم و بربریت اور حق تلفی کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔ افسانہ 'تالیف قلوب' اسی معاملے سے متعلق ہے۔ اس میں سماج کے اُس طبقے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو فقط زبان سے ہریجنوں کی خیر خواہی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے اور دل ہی دل میں ان سے نفرت کرتا ہے۔

لے رہے ہیں۔ جن ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں اور عیسائیوں نے ہندوستان کو اپنا ملک بنالیا ہے وہ ایک دوسرے کے ہم وطن ہیں اور یہ کہ انھیں اتحاد و یگانگت کے ساتھ رہنا ہوگا''۔ 10

گاندھی جی کے نظریہ قومی یکجہتی نے پریم چند کو بھی اپنے دائرہ اثر میں لیا۔ انھوں نے قومی یکجہتی کے موضوع پر درجنوں کہانیاں لکھی ہیں جن کو تحریک آزادی کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ قومی یکجہتی سے متعلق ان کی کہانی 'دوبیل' نہایت ہی عمدہ ادبی تخلیق ہے جس میں ہیرا اور موتی کی یکجہتی کو پیش کرکے ہندوستانیوں کو متحد رہ کر انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

افسانوں کے علاوہ پریم چند کے کئی ناولوں پر بھی گاندھی واد کا گہرا اثر ہے۔ ان ناولوں میں پریم چند نے ان تمام سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کی عکاسی کی ہے جن کے مقابلے میں مہاتما گاندھی ہمیشہ سینہ سپر رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ناول 'میدانِ عمل'، 'چوگانِ ہستی' اور 'گوشہ عافیت' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حواشی

1 پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار۔ ڈاکٹر قمر رئیس، ص 202، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی 2 (زمانہ) پریم چند نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ص57 3 ایضاً ص118 4 ایضاً ص 165 5 پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، ڈاکٹر قمر رئیس، ص 404، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی 6 مہاتما گاندھی کا پیغام مرتب یو ایس موہن راو، پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات، حکومتِ ہند دہلی 1969 7 دودھ کی قیمت، پریم چند کے مختصر افسانے، ص 102 مرتب رادھا کرشن، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی 1978 8 مہاتما گاندھی کا پیغام، مرتب یو ایس موہن راو پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند، دہلی، اکتوبر 1969 9 سوزِ وطن، منشی پریم چند 10 مہاتما گاندھی کا پیغام، مرتب یو، ایس، موہن راوَ، پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند، دہلی، اکتوبر 1969، ص109

■

Dr. Abdul Rasheed Khan, (Gold Medalist)
Dept of Urdu, Govt. Degree College, Bervah
Kashmir

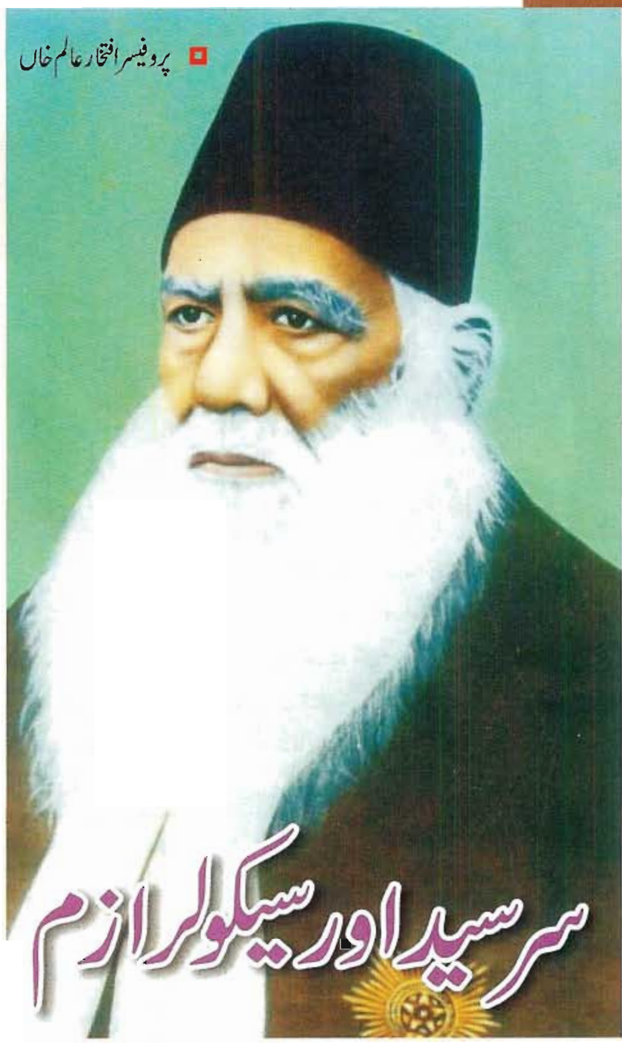

سرسید اور سیکولرازم

پروفیسر افتخار عالم خاں

'سیکولرازم' کی اصطلاح لفظ 'سیکولر' سے اخذ کی گئی ہے جس کے لفظی معنی 'دنیاوی' کے ہیں۔ مغرب میں 'سیکولر فکر' کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ انیسویں صدی میں مغرب میں 'سیکولرازم' سے یہی مفہوم مراد تھا کہ 'دنیاوی' معاملات میں خاص طور سے سیاسی، معاشی، اور سماجی معاملات میں مذہبی مداخلت نہ ہو۔ نہ ہی حکومت مذہبی احکامات کی پابند ہو، خاص طور سے تعلیم کے میدان میں حکومت کا تعلیمی نظام مذہبی عقائد کو نہ تو مشتہر کرے اور نہ ہی مذہبی تعلیم کو ترقی دینے یا تقویت پہنچانے میں معاون ہو۔ لیکن ہندوستان کے دستور میں 'سیکولرازم' کا تصور مغرب کے تصور سے قدرے مختلف ہے، ہمارے دستور میں مذہب کو ماننے اور اسے مشتہر کرنے کی مکمل آزادی فراہم کی گئی ہے۔ ہمارے دستور کے مطابق، سیکولرازم سے مراد ہے کہ حکومت تمام مذاہب کے ماننے والوں کو مساوی آزادی اور تحفظ مہیا کروائے گی۔ دراصل ہندوستان میں سیکولرازم کے تصور کی بنیاد اس قدیم روحانی فلسفے پر مبنی ہے جس کی رو سے یہ یقین کیا جاتا رہا ہے کہ دراصل حقیقی 'سچائی' ایک ہے جس کو انسان نے مختلف ادوار میں مختلف تعبیرات و مختلف اشکال میں تلاش کرنے کی جستجو کی ہے جس کی وجہ سے مختلف تعبیرات و مختلف اشکال وجود میں آگئی ہیں۔

ہندوستان میں 'سیکولرازم' کا تصور مغرب ہی سے پہنچا تھا لیکن مغرب سے ہندوستان پہنچنے تک اس میں خاصا تغیر واقع ہو چکا تھا۔ آج ہماری ایک 'سیکولر حکومت' سے مراد ایک غیر متعصب حکومت سے ہوتی ہے۔ یعنی ایک ایسی حکومت جو عوام کے درمیان، مذہب، نسل، زبان اور علاقے کی بنیاد پر کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھے۔ ہندوستان میں مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کی جڑیں خاصی گہری تھیں (جو ایک ہزار سال سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک ساتھ رہنے کے وجود میں آئی تھیں) اور جن کا پرتو آج بھی بہت نمایاں طور پر ہندوستانی ثقافت، معاشرت، فنِ تعمیر، موسیقی اور مصوری کے ساتھ روحانیت کے فلسفوں میں رچا بسا نظر آتا ہے لیکن ایک 'سیکولر حکومت' کا تصور ہندوستان کے لیے بالکل ہی نیا تھا (ہندوستان ہی کے لیے کیا یوروپ میں بھی انیسویں صدی تک ایک سیکولر حکومت کا تصور اپنے سن بلوغیت کو نہیں پہنچا تھا) (سرسید کے یہاں 'قوم یکجہتی' اور مذہبی رواداری کے رویوں اور طور طریقوں کی وکالت تو ابتدا سے ہی بدرجہ اتم موجود تھی جو اس دور میں انگریزوں کے ذریعے 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کے نظریہ کے تحت فرقہ واریت کو فروغ دینے کے عمل کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ضروری اور قابل قدر فکر تھی۔ لیکن 'قومی یکجہتی' کی اس قابل قدر فکر کے ساتھ ہی ہمیں سرسید کے یہاں 'سیکولرازم' کا ایک نہایت واضح اور جدید تصور بھی موجود نظر آتا ہے۔

سرسید کا خیال تھا کہ ایک مہذب حکومت کو مذہبی معاملات میں قطعی غیر متعصب ہونا چاہیے۔ حکومت کا یہ تصور سرسید کے یہاں ان کی (1869 میں) انگلینڈ کے سفر سے پہلے سے موجود تھا۔ اس کی واضح مثال 'مسافرانِ لندن' کے صفحات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ 1869 لندن کے سفر کے دوران 'دخانی جہاز میں' سرسید کی ملاقات ناگپور کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (یعنی ایک طرح سے صوبہ کے وزیر تعلیم) میجر ڈاڈ سے ہوئی تھی۔ سرسید کے لکھنے کے مطابق میجر ڈاڈ نہایت ہی بااخلاق اور مہذب شخص تھے۔ سرسید سفر کے دوران میجر ڈاڈ سے مختلف تعلیمی مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے۔ ایک روز میجر ڈاڈ نے ایک شخص کا ذکر کرتے ہوئے سرسید سے کہا تھا کہ ''فلاں صاحب ایک اچھے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن اس لیے ثابت نہ ہو سکے تھے کیونکہ وہ لامذہب تھے یعنی کسی مذہب پر ان کا پختہ یقین نہیں تھا۔'' اس پر سرسید نے جو جواب میجر ڈاڈ کو دیا تھا وہ قابلِ غور ہے اور بڑی حد تک سرسید کے سیکولرازم کے تصور کی وضاحت کرتا ہے۔ سرسید اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

''میں نے کہا کہ ''میری رائے میں ضروری ہے کہ ہندوستان میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ایسے ہی ہوں جو لامذہب ہوں۔''

کہنے لگے کیوں؟

میں نے کہا جب ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں تو مذہبی آدمی کا افسر تعلیم ہونا اکثر دفعہ بے تعصب عام تعلیم کا مانع ہو جاتا ہے۔ یہ بات سن کر متعجب ہو کر خاموش ہو رہے۔ درحقیقت میری رائے یہ ہے کہ جیسا خدا بے تعصب ہے۔ مشرک، بت پرست، خدا پرست، سب کو برابر پرورش کرتا ہے۔ اسی طرح گورنمنٹ کو اور افسرِ تعلیم کو بے تعصب ہونا چاہیے''[1]

ہمارے خیال سے اس زمانے میں ایک سیکولر گورنمنٹ کا اس سے بہتر تصور شاید ہی کسی دوسرے شخص نے پیش کیا ہوگا۔ سرسید اس سلسلے میں ایک مہذب گورنمنٹ کے لیے مندرجہ ذیل امور ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''گورنمنٹ کا فرض یہ ہے کہ جن لوگوں پر وہ حکومت کرتی ہے اُن کے حقوق کا، خواہ وہ حقوق مال و جائیداد سے متعلق ہوں، خواہ کسب و پیشہ و معاش، خواہ آزادی مذہب و آزادی رائے اور آزادی زندگی سے، ان کی محافظ ہو، غیر مساوی قوتوں سے کسی کو نقصان نہ پہنچنے

دے۔ کمزور اور مستحق کو غیر مستحق زور آور سے پناہ میں رکھے۔ ہر شخص اپنی ملکیت سے اپنے ہنر سے پورا متمتع ہو۔''[2]

سرسید کا خیال تھا کہ اس طرح کی مہذب گورنمنٹ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیے مساوی قوانین وضع کرے اور بغیر کسی امتیاز کے سب پر ان کا یکساں اطلاق کرے وہ اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''ان تمام فرائض کو پورا کرنے کو قوانین اس کی (گورنمنٹ کی) سلطنت میں جاری ہوں، ہر شخص ادنیٰ سے اعلیٰ تک یہاں تک کہ خود گورنمنٹ بھی ان قوانین کے تابع ہو۔ اور وہ قوانین ایسے ہوں کہ تمام رعایا کے حقوق اس کی رو سے مساوی ہوں اور اس کے ساتھ وہ قوت بھی ہو جو ہر شخص کو بلا لحاظِ مرتبہ، ان قوانین کو پورا پورا مطیع کرے۔''[3]

سرسید 'گورنمنٹ' کے علاوہ تعلیم اور تدریس کے معاملات میں بھی ہمیشہ اپنا 'سیکولر رخ' واضح کرتے رہے تھے۔ 1886 میں انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانگریس (حالیہ ایجوکیشنل کانفرنس) کے پہلے اجلاس میں اپنی تائید کے ساتھ مولانا شبلی نعمانی کے ذریعے ایک ریزولیوشن پیش کروا کر منظور کرایا تھا۔ جس میں مشرقی علوم کو گورنمنٹ کے اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل کیے جانے کی 'سیکولر' بنیادوں پر مخالفت کی گئی تھی۔ اس ریزولیوشن میں کہا گیا تھا کہ مشرقی علوم جو مسلمانوں میں عرصہ دراز سے رائج ہیں، مذہبی تعلیم اور مذہبی مسائل سے ایسے منسلک ہوگئے ہیں کہ جدا نہیں ہوسکتے ہیں۔ اس لیے گورنمنٹ کو اپنے کالجوں میں ان کا اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس ریزلولیوشن کی عبارت مندرجہ ذیل تھی:

''اس جلسے کی رائے میں مسلمانوں کو یوروپین سائنسز (Sciences) ولٹریچر میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔ قوم اور گورنمنٹ دونوں کو اس پر توجہ چاہیے۔ انگریزی کالجوں میں مشرقی زبان کا بطور سیکنڈ لینگویج کے رہنا کافی ہے۔ خاص مشرقی علوم کی نسبت ہم کو گورنمنٹ کی توجہ درکار نہیں ہے، وہ جس طرح ہمارے قدیم طریقے پر ہماری قوم کے عالموں کے ذریعے ہوتی ہے اس کو اسی پر رہنا چاہیے اور ہماری قوم کو اس کے باقی اور قایم رہنے پر (ایسے لوگوں میں جو اس کی خواہش رکھتے ہیں) توجہ رکھنی لازمی ہے۔ مشرقی علوم جو مسلمانوں میں قدیم سے اب تک رائج ہیں وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی مسائل سے ایسے مخلوط ہیں کہ جدا نہیں ہوسکتے اور اس لیے گورنمنٹ کو اس کا اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔ اور اگر مذہبی مسائل کو اس سے خارج رکھا جاوے تو کوئی شخص جو مشرقی علوم کا خواہاں ہے اس کو پسند نہیں کرنے کا اور (اگر) کسی وجہ سے اسے اختیار کرے گا تو مسلمان کمیونٹی میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی۔''[4]

اس زمانے میں گورنمنٹ کے کالجوں میں مشرقی علوم کی تدریس کی سیکولر بنیادوں پر مخالفت شاید سرسید کے علاوہ کسی اور شخص نے نہیں کی تھی (کم از کم ہم کو اس کا علم نہیں ہے) یوں تو بہت سے جدیدیت کے حامل سرکردہ اشخاص نے مشرقی علوم کے مقابلے میں انگریزی اور مغربی علوم کی تدریس اور تشہیر کی حمایت اور وکالت کی تھی جس کی ابتدا راجہ رام موہن رائے سے ہی کی جاسکتی ہے لیکن ان سب حضرات کے پیش نظر، مشرقی علوم کے مقابلے میں مغربی علوم کی اہمیت اور افادیت ہی موجود رہی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے مغربی علوم کو مشرقی علوم پر ترجیح دینے کی وکالت کی تھی۔ لیکن ان میں سے کسی نے سیکولر بنیادوں پر مشرقی علوم کی تدریس اور تشہیر کی مخالفت نہیں کی تھی۔ سرسید نے اس سلسلے میں گورنمنٹ کی مذہبی تعلیم سے اجتناب کی پالیسی کو ان الفاظ میں سراہا تھا کہ:

> "گورنمنت کا فرض یہ ہے کہ جن لوگوں پر وہ حکومت کرتی ہے اُن کے حقوق کا، خواہ وہ حقوق مال و جائیداد سے متعلق ہوں، خواہ کسب و پیشہ و معاش، خواہ آزادی مذہب و آزادی رائے اور آزادی زندگی سے، ان کی محافظ ہو، غیرمساوی قوتوں سے کسی کو نقصان نہ پہنچنے دے۔ کمزور اور مستحق کو غیرمستحق زور آور سے پناہ میں رکھے۔ ہر شخص اپنی ملکیت سے اپنے ہنر سے پورا متمتع ہو۔"

''گورنمنٹ کی تو یہ نہایت عمدہ پالیسی ہے کہ وہ مذہبی تعلیم سے علیحدہ ہے۔''[5]

سرسید کے علم اور تعلیم و تدریس سے متعلق نظریات بھی کلیتاً سیکولر بنیادوں پر قائم تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

''علم ایسی چیز ہے جو صداقت سکھانے، اخلاق درست کرنے، زندگی کی راہ بتانے، ابنائے جنس کے ساتھ بسر کرنے، اپنے اور دوسروں کے حق پہچاننے میں کارآمد ہے۔ یہ تمام باتیں انسانیت کی ہیں، مگر بغیر علم کے نہیں آتی ہیں۔ بہ حیثیت انسان ہونے کے ہمارا فرض ہے کہ اپنے تئیں انسان بنائیں نہ کہ مثل حیوان کے اپنی زندگی بسر کریں۔''

سرسید کے سیکولر اور قومی یکجہتی کے نظریات کی اس سے اچھی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایم اے او کالج کے دروازے ہمیشہ ہندو اور مسلم طلبا کے لیے یکساں طور پر کھلے رہے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کالج کا پہلا گریجویٹ ایک ہندو طالب علم ہی تھا (یعنی مسٹر ایشوری پرشاد؟ ساکن اگلاس، جو بعد میں تحصیلدار مقرر ہوگئے تھے) ابھی حال میں، انٹرنیٹ پر میں نے پاکستان کے ایک صاحب کی تحریر دیکھی تھی جس میں اس بات کا اقرار تو کیا گیا تھا کہ ایم اے او کالج میں ہندو طلبا بھی تعلیم حاصل کرتے تھے، لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ 'ڈے اسکالر' کے بطور کالج میں تعلیم پاتے تھے (یعنی وہ بورڈروں کے بطور ہوسٹلوں میں نہیں رہتے تھے) حالانکہ یہ مفروضہ بھی قطعی بے بنیاد ہے۔ کالج کے کیمپس کے اندر ہندو اساتذہ کی رہائش اور ہاسٹلوں میں ہندو طلبا کی بورڈروں کے بطور موجودگی کالج کے قیام کے پہلے دن سے جاری تھی۔ سرسید ہندو طلبا کو ان کی ضروریات کے مطابق ہر سہولت مہیا کروانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ہم اپنے مفروضے کی تصدیق کے بطور سرسید کے خط مورخہ 14 ستمبر 1878 (بنام کورٹ آف وارڈس برائے راجہ رام پال سنگھ) کا ایک چیدہ اقتباس قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ وہ اس خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''دو قطعہ عنایت نامجات پہنچے اور مبلغ ایک سو تیس روپیہ کے نوٹ بھی پہنچے۔ راجہ رام پال سنگھ مع اپنے بھائی اور ملازمان ہمراہی جگموہن سنگھ کے پہنچے۔ علاوہ منیجر بورڈینگ ہوس کے منجملہ مدرسان مدرسہ بابو راما شنکر ایم اے پروفیسر بھی بورڈینگ ہاوس کے احاطہ میں ایک خاص بنگلے میں جو ان کے لیے مخصوص ہے رہتے ہیں۔ انھیں کے بنگلہ کے قریب ایک بنگلہ چار کمروں کا ہندو اول درجہ کے بورڈروں کے لیے بنا ہوا ہے۔ اس بنگلے میں سوائے ہندوؤں کے اور کوئی نہیں رہے گا۔ اسی بنگلے کے چاروں کمروں میں سے ایک رام پال سنگھ کو دیا گیا ہے۔ آپ نے ارقام فرمایا ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی بھی ان کے ساتھ رہیں گے۔ اس لیے کرایہ اس کمرے کا بموجب قوانین لیا جاوے گا ... میں اس نیاز نامہ کے ساتھ فہرست اخراجات ماہوار مرسل کرتا ہوں ... تنخواہ ملازمین جو آپ نے لکھی ہے وہی اس فہرست میں درج ہے۔ اس تنخواہ پر یہاں کوئی نوکر نہیں مل سکے گا۔ شاید جو نوکر وہاں سے آئیں وہ اس تنخواہ پر نوکر رہیں۔ سائس جو گھوڑوں کا بھی کام کرے اور گھاس بھی کھود کر لائے تین روپیہ ماہ واری پر دستیاب ہونا ہم تو تعجبات سا تصور کرتے ہیں۔ صرف

گراسکٹ، چار روپیہ مہینے پر یہاں نوکر ہوتا ہے بہرحال جوتنخواہیں آپ نے لکھی ہیں وہی دی جاویں گی اور وہی حساب میں مندرج ہیں جوچھٹی لینگ صاحب کے ذریعہ گئی تھی اس میں لکھا تھا کہ اصطبل کا کرایہ دینا پڑے گا۔ بالفعل وہ حساب میں نہیں لگایا گیا ہے۔ اس وقت میں اپنے مکان میں، جومتصل مدرسہ ہے، جگہ دے دوں گا۔ لیکن جب مجھ کوضرورت ہوگی تو گھوڑا احاطہ مدرسے میں جائے گا جس کا کرایہ کم سے کم دو روپیہ مہینہ ہوگا۔ اس وقت راجہ صاحب کی رسوئی اس مکان میں ہوئی تھی جس میں راماشنکر کی رسوئی ہے۔ لیکن میں نے حکم دے دیا ہے کہ ان کے لیے بھی رسوئی کا مکان علیحدہ بنایا جائے۔

* 1875 میں اسکول قائم ہونے کے ساتھ جن پانچ اساتذہ کا تقرر کیا گیا تھا ان میں ماسٹر بیجناتھ بھی شامل تھے۔ بابو راماشنکر ایم اے کا تقرر 1878 کے اوائل میں ہوا تھا۔

** بابوراماشنکر ایم اے اسکول کے احاطے ہی میں موجود ایک مکان میں رہائش پذیر تھے یہ مکان ظہور وارڈ کے سامنے واقع میدان میں 1960 تک موجود تھا۔

*** یہ پھوس کی چھت کا انگیزی طرز کا بنگلہ ان چھ بنگلوں میں سے ایک تھا جو سرسید نے سب سے پہلے کالج کے احاطے میں طلبا کی رہائش کے لیے تعمیر کروائے تھے۔ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب 'سرسید اور فن تعمیر' (2001) سرسید اکادمی، علی گڑھ ص124 تا126)

سرسید اپنے 'سیکولر' رویوں میں کس قدر فعال تھے اُس کی عمدہ مثال ان کی مندرجہ ذیل تحریر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اخبار 'جریدہ روزگار' مورخہ 8 جولائی 1876 میں ایک خط شائع ہوا تھا جس میں استفسار کیا گیا تھا کہ 'مدرسۃ العلوم' تو خاص مسلمانوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے اس میں ہندوؤں کو پڑھانے کی وجہ؟ سرسید نے اس سوال کے جواب کے بطور ایک تفصیلی تحریر 'تہذیب الاخلاق' یکم رجب 1293 ھ میں شائع کی تھی اس تحریر کے چیدہ اور مختصر اقتباسات درج ذیل ہیں۔ سرسید اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''اس کے جواب میں کوئی فیاض اور نیک دل مسلمان کہہ سکتا ہے کہ ہاں اس مدرسۃ العلوم کے قائم ہونے کی ضرورت خاص مسلمانوں کوتھی جن کے لیے قائم ہوا۔ مگر مسلمانوں کو ایسے بخیل وتنگ دل نہ ہونا چاہیے کہ اگر دوسری قوم اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اسے محروم رکھے بلکہ خوبی اور نیکی اسی میں ہے کہ مسلمانوں کے سبب سے اور لوگ بھی فائدہ اٹھائیں۔ کوئی شیخی خورہ اور خودستا شخص جس نے اپنی آنکھوں کو مسلمانوں کی موجودہ حالت سے بند کرلیا ہے اور ہمیشہ پچھلے زمانے کے خواب دیکھ رہا ہے وہ یہ جواب دے گا کہ ہم ہمیشہ ایسے ہی فیاض رہے ہیں ... 8

پھر اسی تسلسل میں آگے تحریر کرتے ہیں کہ:

''مگر ہاں جب کوئی باغیرت اور قومی ہمدردی کرنے والا ٹھیٹ مسلمان اس سوال کو پڑھے گا تو بے اختیار رو دے گا اور اپنی قوم کی ذلت، اور اپنی قوم کے ادبار، اپنی قوم کے جھوٹے تعصب، اپنی قوم کی خودغرضی، اپنی قوم کی جھوٹی دین داری، اپنی قوم کی ناسمجھی و ناعاقبت اندیشی پر افسوس کرے گا۔''9

"علم ایسی چیز ہے جو صداقت سکھانے، اخلاق درست کرنے، زندگی کی راہ بتانے، ابنائے جنس کے ساتھ بسر کرنے، اپنے اور دوسروں کے حق پہچاننے میں کارآمد ہے۔ یہ تمام باتیں انسانیت کی ہیں، مگر بغیر علم کے نہیں آتی ہیں۔ بہ حیثیت انسان ہونے کے ہمارا فرض ہے کہ اپنے تئیں انسان بنائیں نہ کہ مثل حیوان کے اپنی زندگی بسر کریں۔"

اسی تحریر میں آگے ہندو حضرات کے تعاون کا مشکورانہ اقرار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہندوؤں نے نہایت فیاضی سے روپیہ جاگیر اور انعام دیا اور تمام قوم کو اپنا ممنون اور زیر بار احسان کیا۔ پس ایسی حالت میں یہ سوال کرنا کہ ہندو کیوں پڑھائے جاتے ہیں، کیسی شرم کی بات ہے۔ قومی عزت والے کو ڈوب مرنے کا مقام ہے نہ (کہ) ایسے سوال کرنے کا۔ خدا ہماری قوم کو سچی عزت، سچی غیرت، سچی قومی ہمدردی عنایت کرے۔ آمین۔''10

سرسید ایک کھرے 'سیکولر' انسان تھے۔ وہ کسی بھی طرح کے تعصبات کو انسان کی بدترین خصلت قرار دیتے جو انسان کی تمام نیکیوں اور خوبیوں کو غارت اور برباد کردیتی ہے ان کا کہنا تھا کہ اپنے عقیدے اور اپنے مذہب پر پختہ ہونا ایک عمدہ صفت ہے لیکن سماجی اور مذہبی معاملات میں تعصب ایک نہایت ہی نازیبا عمل ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

''اپنے مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے جو کسی اہل مذہب کے لیے ہوسکتی ہے اور تعصب گو کہ وہ مذہبی باتوں میں (ہی) کیوں نہ ہو نہایت برا اور خود مذہب کو نہایت نقصان پہنچانے والا ہے۔''

سرسید جو ایک جدید، لبرل، سیکولر اور روشن خیال دانشور تھے۔ آج خود ان کے عقیدت مند اور دشنام طرازوں نے ان پر بے جا عقیدت اور بے دلیل دشناموں کا ایک ایسا ملمع چڑھا دیا ہے کہ صرف ڈیڑھ سو سال کے عرصے ہی میں ان کی اصل صورت پہچاننا مشکل ہوگیا ہے۔ ہماری زیرنظر تحریر میں ادنیٰ کوشش یہ تھی کہ عقیدت اور عداوت کے ملمع کی کسی ایک پرت ہی کو صاف کرکے سرسید کی شخصیت کے غیرمتعصب اور سیکولر خد و خال کو قارئین کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ ہم اپنی اس ادنیٰ کوشش میں کس حدتک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے لیکن یہ ہمارا مقصد ہے کہ سابق کی طرح آئندہ بھی اپنی تحریروں کے ذریعے سرسید کے قول و فعل پر چڑھی وقت کی اس دھول کی پرتیں حتی الامکان صاف کرتے رہیں گے۔

حواشی:

1. مسافرانِ لندن مصنفہ سرسید احمد خان، علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، کراچی، ص68
2. نامہذب ملک اور نامہذب گورنمنٹ مصنفہ سرسید احمد خاں، تہذیب الاخلاق، جلد ششم، بابت یکم رمضان 1292، ص145 تا149
3. ایضاً، بحوالہ مقالات سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی (حصہ 7) ص2
4. مرقع کانفرنس، مرتبہ انور احمد مارہروی (طبع اوّل 1935) مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص5
5. اتحاد باہمی اور تعلیم، مصنفہ سرسید احمد خاں، بحوالہ مقالات سرسید (حصہ 12) مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، ص168
6. ایضاً، ص172
7. سرسید کا خط (بنام کورٹ آف وارڈس) مورخہ 14 ستمبر 1878 آرکائیوز سرسید اکادمی، علی گڑھ
8. اخبارات کے اعتراضات اور ان کے جوابات، بحوالہ مقالات سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی (حصہ 13) ص370
9. ایضاً، ص371
10. ایضاً، ص371
11. تعصب مصنفہ سرسید احمد خاں، بحوالہ مقالات سرسید مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی (حصہ 5) ص31

■

Prof. Iftekhar Alam Khan,
Aligarh Muslim University, Aligarh

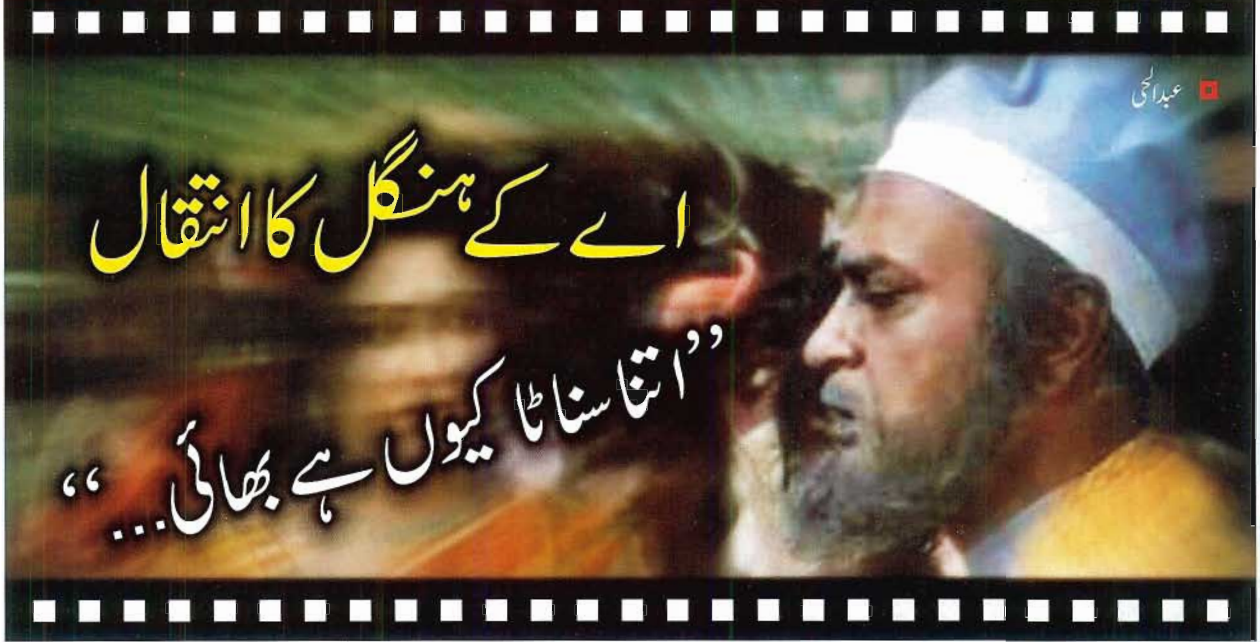

آئندہ سال ہندوستانی سینما کے 100 سال پورے ہونے جا رہے ہیں لیکن ہندی سینما کو نئے مقام اور نئی اونچائیوں سے متعارف کرانے والے اور گزشتہ 100 برسوں میں بالی ووڈ کو پوری دنیا میں عام کرنے والے ایک کے بعد ایک اچھے فنکار ہمیں چھوڑ کر چلے جا رہے ہیں، یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ آخر ہندی سینما کے 100 سال مکمل ہونے پر ہم کیسا جشن منائیں گے اور یہ کیسی خوشی ہوگی، ایک طرف ہمیں یہ احساس ہے کہ ہندی سینما نے 100 سال کا طویل اور کامیاب سفر مکمل کیا ہے اور دوسری طرف ہندوستانی فلموں کے بہترین اداکاروں، گلوکاروں و فنکاروں کے بچھڑنے کا غم ہے۔ شمی کپور، دیوانند، داراسنگھ اور راجیش کھنہ جیسے اپنی اپنی انفرادیت کے لیے پہچانے جانے والے اداکار ایک ایک کر کے ہمیں گزشتہ ایک سال میں چھوڑ گئے ہیں اور اب وہ محترم و مقبول اداکار بھی ہمیں فرقت کا داغ دے گیا ہے، جس کی انفرادیت یہ تھی کہ اس نے پچاس سال کی عمر میں فلمی دنیا میں قدم رکھا اور اداکاری میں بھی اپنی الگ پہچان بنائی۔

اے کے ہنگل صاحب کی موت (26 اگست 2012) کے بعد ایک عجیب بات یہ بھی سامنے آئی ہے کہ کیمرے کے سامنے اداکاری کرنے والے یہ بڑے بڑے اداکار اپنی حقیقی اور اصلی زندگی میں بھی محض ایک اداکار بن کر رہ گئے ہیں۔ لتا پوار، پروین بابی، راجیش کھنہ اور ہنگل صاحب سبھی کو بڑے فنکاروں نے ان کے آخری وقت میں اکیلا چھوڑ دیا تھا، اے کے ہنگل صاحب کے مرنے پر تو کوئی بڑا اداکار ان کی آخری رسوم میں شریک ہونے بھی نہیں آیا۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسا فنکار جس نے اپنی زندگی کے قیمتی 50 سال

> ایک طرف ھمیں یہ احساس ھے کہ ھندی سنیما نے 100 سال کا طویل اور کامیاب سفر مکمل کیا ھے اور دوسری طرف ھندوستانی فلموں کے بھترین اداکاروں، گلوکاروں و فنکاروں کے بچھڑنے کا غم ھے۔ شمی کپور، دیوانند، داراسنگھ اور راجیش کھنہ جیسے اپنی اپنی انفرادیت کے لیے پھچانے جانے والے اداکار ایک ایک کرکے ھمیں گزشتہ ایک سال میں چھوڑ گئے ھیں اور اب وہ محترم و مقبول اداکار بھی ھمیں فرقت کا داغ دے گیا ھے جس کی انفرادیت یہ تھی کہ اس نے پچاس سال کی عمر میں فلمی دنیا میں قدم رکھا اور اداکاری میں بھی اپنی الگ پھچان بنائی۔

ہندی سینما کو دیے لیکن جب اس کی موت ہوتی ہے تو اس کی آخری رسومات میں شامل ہونے والوں میں ہندوستانی سینما کی کوئی بڑی شخصیت موجود نہیں تھی۔ ان کی موت پر معروف اداکار رضا مراد کا کہنا تھا کہ ''طویل پھیلا ہوا ان کا کیریئر ہے، وہ نیچرل سکول آف ایکٹنگ سے تعلق رکھتے تھے یہ بڑی افسوسناک بات ہے بلکہ یہ شرمناک بات ہے کہ ایسا انڈسٹری کا کوئی بڑا فنکار نہیں ہے جس کے ساتھ ہنگل صاحب نے کام نہ کیا ہو لیکن آج ان کے اس آخری سفر میں یہاں ایک بڑا چہرہ نہیں دکھائی دے رہا ہے، جس شخص نے انڈسٹری کو 50 سال دیے اسے سلام کرنے کے لیے آپ کے پاس 50 منٹ نہیں۔ اس دور ترقی میں کیا کس سے ملے کوئی، جب خود سے بھی ملنے کا ایک وقت مقرر ہے، جب ان کی اپنے آپ سے ملاقات نہیں ہو پاتی، تو وہ ہنگل صاحب کو کیا وقت دے سکیں گے۔''

اے کے ہنگل (اوتار کرشن ہنگل) کی پیدائش 1 فروری 1917 کو سیالکوٹ، پنجاب پاکستان میں ہوئی تھی۔ ان کا بچپن پشاور میں گزرا، ان کے والد سلائی کے پیشے سے جڑے ہوئے تھے اور کچھ عرصے تک ہنگل صاحب نے بھی یہ کام کیا تھا۔ اے کے ہنگل کو شروع سے ہی ایکٹنگ سے لگاؤ تھا اس لیے انھوں نے IPTA میں شمولیت اختیار کی اور بھارت کی آزادی اور اس کے بعد کے کئی برسوں تک تھیٹر سے وابستہ رہے۔ کیفی اعظمی، بلراج ساہنی اور اتپل دت کے ساتھ کمیونسٹ نظریے کو عام کرنے میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ انھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا۔ کراچی میں تین سال کا طویل عرصہ قید میں گزارنا پڑا۔ رہائی ملنے کے بعد 1950 میں ہندوستان آ کر ممبئی میں بس گئے اور یہاں IPTA کے مختلف ڈراموں میں حصہ لیتے رہے۔ 1966-67 میں ہنگل صاحب نے فلم 'تیسری قسم' سے ہندی سینما میں قدم رکھا۔ لیکن اس فلم سے ان کے سین ہٹا دیے گئے اور وہ پہلی دفعہ فلم 'شاگرد' سے پردۂ سیمیں پر نظر

آئے۔ یہ بات بھی یہاں بتانا ضروری ہے کہ جس وقت ہنگل صاحب نے کیمرے کا سامنا کیا، ان کی عمر 50 سال تھی، اور شاید اسی لیے ہنگل صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہنگل صاحب ہندی فلموں کے ایسے بزرگ ہیں جو کبھی جوان نہیں رہے۔ اسکاٹش ناول نگار اور ڈرامہ نگار جے ایم بیری کا تخلیق کردہ پیٹر پین ایک ایسا کردار ہے جو کبھی بوڑھا نہیں ہوا کیونکہ ایک معجزے کے ذریعہ اسے ہمیشہ ایک بچہ بنے رہنے کی سعادت حاصل ہوگئی ہے، ٹھیک اسی طرح ہندی فلموں میں ہنگل صاحب ایک ایسے بزرگ ہیں جو ہمیشہ بوڑھے رہے، فلموں میں جس وقت آئے تو بزرگ تھے اور ان کی عمر ایسی تھی کہ انہیں نوجوان ہیرو کا رول تو مل نہیں سکتا تھا اس لیے انہیں ہیرو کے باپ، چچا، ماما، یا بڑی عمر کے کسی کردار کو ادا کرنے کا موقع ملا۔

فلم 'شعلے' میں رحیم چاچا کا کردار آج بھی امر ہے، ان کے ذریعے ادا کیا گیا مکالمہ ''اتنا سناٹا کیوں ہے بھائی'' آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے، اور یہ ڈائیلاگ سن کر آج بھی گبر سنگھ کے جبر و تشدد کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ گرم ہوا میں اجمانی صاحب کا کردار، باورچی کا رام ناتھ شرما، کورا کاغذ کے پرنسپل گپتا، ابھیمان کے سدانند اور سب سے اہم فلم شوقین میں اتپل دت، اشوک کمار اور اے کے ہنگل کی بہترین کامیڈی بھری اداکاری سے سجی فلم کے بزرگوں کو کون بھلا سکتا ہے جو اپنے ڈرائیور کی محبوبہ کو اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یادگار فلموں میں اوتار، آئینہ، ارجن، آندھی، کورا کاغذ، چت چور، نمک حرام، انامیکا، گڈی، پریچئے وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے 200 سے زائد فلموں میں کام کیا ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی ہے کہ ہنگل صاحب نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ 16 فلمز سپر اسٹار راجیش کھنہ کے ساتھ کی ہیں اور راجیش کھنہ کے دنیا چھوڑنے کے محض 36 دنوں بعد ہنگل صاحب بھی ان کے ہم سفر ہو لیے۔ ہندی سنیما اور پوری دنیا ان دو عظیم فنکاروں کو ان کی فلموں آپ کی قسم، امردیپ، نوکری، تھوڑی سی بے وفائی، پھر وہی رات، سوتیلا بھائی، قدرت، باورچی وغیرہ کے لیے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ہنگل صاحب نے عامر خان کے ساتھ فلم لگان میں بزرگ گاؤں والے کا رول کیا تھا اور گیت گھنن گھنن میں عامر خان کے ساتھ جھومتے ہوئے نظر آئے تھے۔ شاہ رخ خان کے ساتھ پہیلی میں بھی وہ دکھائی دیے۔ انھوں نے جیون ریکھا، چندرکانتا اور مدھوبالا جیسے ٹی وی سیریلوں میں بھی کام کیا تھا مدھوبالا تو ابھی کچھ ماہ پہلے ہی شروع ہوا تھا اور اس سیریل کے لیے جب وہ سیٹ پر آئے تو بہت خوش تھے اور کیمرے کے سامنے آکر تو وہ ایسے خوش ہو رہے تھے جیسے کسی بچے کو اس کا پسندیدہ کھلونا مل گیا ہو، پوری رات وہ سیٹ پر ہنستے کھلکھلاتے رہے اور بہت ہی خوشی خوشی اپنا سین شوٹ کروایا۔ گزشتہ سال ان کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی اور عامر خان نے علاج کے لیے عوام کے سامنے ان کی مدد کرنے کی درخواست کی۔ جیہ بچن، سلمان خان اور دوسرے لوگ بھی ہنگل صاحب کے علاج کے لیے آگے آئے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی کمیونسٹ نظریے کے ساتھ گزاری۔ انھیں اس ضعیفی کی عمر میں بھی ملکی و غیر ملکی صورتحال، سوشلزم کی بقا، سماج کے نچلے طبقے کی

بلندحوصلے اور مضبوط قوت ارادی کے مالک ہنگل صاحب نے اپنی پوری زندگی میں مایوسی، ناامیدی کو اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیا۔ ان کی زندگی کے طویل سفر میں ان کی بیماری بھی کبھی ان کے مستحکم ارادوں کو ہلا نہیں سکی۔ 97-96 برس کی عمر میں فیشن شو میں شرکت کرنا اور ٹی وی سیریل کے لیے شوٹ کرنا ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ اگر مضبوط قوت ارادی ہو تو آپ ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتے ہیں۔

آزادی اور ان کے حقوق کا احساس رہتا تھا۔ ہنگل صاحب نے جب ہوش سنبھالا اس وقت جلیانوالہ باغ سانحے کو کچھ ہی برس گزرے تھے اور پورے ملک میں انگریز حکومت کے خلاف غصہ ابل رہا تھا، ہنگل صاحب نے بہت کم عمر میں ہی ملک کی آزادی کے لیے جلسے جلوسوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور اپنے ڈراموں میں بھی آزادی کی حمایت میں کئی اہم رول ادا کیے تھے۔ بلندحوصلے اور مضبوط قوت ارادی کے مالک ہنگل صاحب نے اپنی پوری زندگی میں مایوسی، ناامیدی کو اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیا۔ ان کی زندگی کے طویل سفر میں ان کی بیماری بھی کبھی ان کے مستحکم ارادوں کو ہلا نہیں سکی۔ 97-96 برس کی عمر میں فیشن شو میں شرکت کرنا اور ٹی وی سیریل کے لیے شوٹ کرنا ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ اگر مضبوط قوت ارادی ہو تو آپ ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتے ہیں۔ انھیں حکومت ہند نے 2006 میں پدم بھوشن سے نوازا تھا۔ ہندی فلموں کا یہ سدابہار بزرگ اداکار ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہے گا اور ان کے جانے پر فلمی دنیا اور پردۂ سیمیں پر ایسا سناٹا چھایا کہ بے ساختہ ان کا بولا ہوا ڈائیلاگ ''اتنا سناٹا کیوں ہے بھائی...'' یاد آتا ہے۔

منظر حسین

فیض احمد فیض
کی معنویت اکیسویں صدی میں

قبل اس کے کہ اکیسویں صدی میں فیض احمد فیض کی شخصیت اور کارناموں کی معنویت کا تعین کیا جائے اس نکتے پر بھی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کہ فیض نے ایک خاص عہد میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں آج کا دور اس عہد سے کتنا مماثل و مشابہ ہے؟ پھر یہ کہ کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقی نگارشات میں ماقبل ادبی رویوں اور معاصر تحریکات، رجحانات و میلانات کے غیر معمولی اثرات ہوتے ہیں۔ فنکار جہاں روایت کے صالح عناصر کا انجذاب کرتا ہے تو دوسری طرف اپنی تخلیق کو روح عصر کا ترجمان بناتا ہے۔ فیض کی شخصیت اور شاعری اور ان کی مجموعی فکر اور کارناموں میں پوشیدہ جذبوں کا تجزیہ اسی حوالے سے کرنا چاہیے تاکہ عہد حاضر میں فیض کی معنویت، اہمیت وعظمت کا اندازہ ہو سکے۔ فیض خود اپنے دوسرے شعری مجموعہ 'دست صبا' کے ابتدائیہ میں رقم طراز ہیں:

''حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا تقاضا بھی ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو ہے اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔''

فیض احمد فیض کی پیدائش 13 فروری 1911 کو قصبہ قادر ضلع سیالکوٹ میں ہوئی اور وفات 20 نومبر 1984 کو لاہور میں۔ تقریباً 73 برس کی مدت میں فیض نے اپنی زندگی میں کئی انقلابات دیکھے۔ جب انھوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو اس وقت پوری دنیا انقلاب، جنگ و جدل اور مختلف تحریکات و نظریات کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ پہلی جنگ عظیم نے عالمی زندگی کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ صدیوں سے ایک نہج پر چلے آرہے معاشرے کی اپنی روایتی شناخت مدھم ہونے لگی تھی۔ ابھی یہ جنگ ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ روس میں 1917 کا انقلاب برپا ہوا اور ایک نئی حکومت عالم وجود میں آئی۔ کارل مارکس کے سیاسی نظریے نے بڑی سرعت کے ساتھ اپنا اثر دکھانا شروع کردیا تھا۔ قدیم اقتصادی ڈھانچے ڈھائے جارہے تھے۔

ماحول کا اثر ذہنی طور پر فنکاروں پر زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا نرم گداز دل زمانے کی آہٹ پر دھڑکتا ہے اور حساس ذہن خارجی محرکات و کوائف سے اثرات قبول کرتا ہے۔ اس طرح فن کار کی تخلیق اپنے عہد اور ماحول کی ترجمان بن جاتی ہے۔ فیض احمد فیض بھی ایک ذہین اور حساس فنکار کی طرح اپنی شاعری کا مواد اپنے عہد کے ماحول اور معاشرے سے اخذ کرتے ہیں اور اپنے عہد کے سچے ترجمان بن جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے تخلیقی تانے بانے عوامی حالات اور اجتماعی زندگی کے رہین منت ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ نہ تو فکری وابستگی کو فن کی راہوں پہ قربان کیا اور نہ ہی فن کو فکری پابندیوں میں مقید رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری محض اشتراکیت کا پرچار نہیں بلکہ فن اور جمالیات کا ایک حسین و خوشگوار امتزاج پیش کرتی ہے جس کا احساس ان کے کلام کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں سماجی، معاشی اور سیاسی تناؤ کی جو فضا ہے وہ استحصالی قوتوں کے خلاف صدائے احتجاج کا اشاریہ بن گئی ہے۔ انھوں نے عوام کے سلگتے مسائل کی ترجمانی بھی کی ہے اور انسانی دل کو اس کے منصب کا احساس بھی دلایا ہے۔ پہلے شعری مجموعہ 'نقش فریادی' (1941) کی اشاعت سے لے کر ساتویں مجموعہ 'مرے دل مرے مسافر' (1981) تک فیض کے ذہنی شعور میں خوشگوار تبدیلی آتی رہتی ہے۔ نقش فریادی کا رومانی جذبہ آگے چل کر انقلابی جوش میں ڈھلنے لگتا ہے۔ اس سلسلے میں فیض کی نظم 'کتے'، 'لہو کا سراغ'، 'تنہائی'، 'دریچہ'، 'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے' وغیرہ ایسی تخلیقات ہیں جن میں فنکار کے تیور دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان نظموں میں حالات کی المناکی بھی ہے اور استحصالی قوتوں کے جبر و استبداد کا اظہار بھی اور محکوم و مظلوم عوام کی پریشانیوں، تباہیوں، ذلت و رسوائی کا نوحہ بھی۔ یہاں چند نظموں کی معنویت کی طرف بھی اشارہ کرتا چلوں۔

نظم 'کتے' میں محکوم و مظلوم عوام کی ذلت و پسپائی کو کمال ہنرمندی سے شعر کی زبان علامتی طور پر ادا کیا گیا ہے۔ یہاں کتے مظلوم گروہ کا استعارہ ہے جو ظلم و استحصال کی چکی میں پس رہا ہے۔ دوسری طرف یہ نظم عوام کی زبردست خفیہ قوتوں کا اظہار بھی ہے اور ان امکانات کا اشاریہ بھی کہ اگر عوام متحد ہوکر بغاوت پر آمادہ ہوجائیں تو بڑی سے بڑی جابر اور ظالم حکومتوں کے مضبوط ستون میں بھی تزلزل پیدا ہوجائے دیکھیے یہ اشعار:

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلادے

فیض کی اس نظم کی معنویت آج بھی مسلم ہے۔ اگر افغانستان، عراق اور دیگر مسلم ممالک کے سلسلے میں امریکہ کے شیطانی منصوبوں کے تناظر میں اس نظم کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ فیض نے کس خوبصورتی سے احساس بیداری کا صور پھونکتے ہوئے مسلم ممالک کو للکارا ہے۔ نظم کے آخری شعر:

کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

میں جو کرب ہے، احساس کی جو شدت ہے، جذبات کی جو جولانی ہے وہ ایک دردمند انسان کے دل کی چیخ کی طرح گونجتی ہے۔ علامتی شاعری میں جو تہہ در تہہ معنویت ہوتی ہے نظم 'کتے' اس کی بہترین مثال ہے۔

فیض کی ایک نظم 'نثار میں تری گلیوں...' کے عنوان سے جس میں شاعر کی وطن دوستی اور وطن پرستی کے علاوہ وطن کے ہر ذرے سے محبت، خلوص اور ایثار کا جذبہ نمایاں ہے۔ پوری نظم فنی اعتبار سے فیض کی خداداد صلاحیت، بلندیِ فکر، رفعتِ تخیل کے علاوہ تخلیقی انفرادیت اور فنی

ندرت کی ضامن ہے۔اس نظم کے متعلق پروفیسر قمر رئیس یوں رقم طراز ہیں:

''یہ مختصر سی نظم جدید اردو شاعری میں وطن پرستی کا ایسا رجز ہے جو شعری ضرب المثل بن گیا۔''

(بحوالہ 'فیض کی قید و بند کی شاعری' مشمولہ 'تعبیر و تحلیل' ص 201)

نظم میں وطن کے تئیں شاعر کی عقیدت کے اظہار میں عاشقانہ انداز کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔نظم کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

نظم کے پہلے بند میں ہی شاعر اپنی شعری گفتار کے ذریعے قاری کی توجہ اپنی جانب مرکوز کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔شاعر وطن سے مخاطب ہے۔اس کی گلیوں میں اپنی متاع زیست کو لٹانا چاہتا ہے لیکن جابر اور ظالم حکمراں نے یہ پابندی عائد کردی ہے کہ کوئی بھی محبِّ وطن سر اٹھا کر نہیں چل سکتا۔لہٰذا شاعر یہ نصیحت کرتا ہے کہ وطن کا کوئی دیوانہ ان گلیوں کا طواف کرنا چاہے تو وہ اپنی نظر کو چرا کر اور جسم و جان کو بچا کر نکلے۔ نظم میں جو کرب اور احساس ہے، اربابِ اقتدار کی سیاسی شعبدہ بازی اور ظلم و ناانصافی پر مبنی حکومت کے جبر و استعداد کا استعارہ بن گیا ہے۔گجرات میں وہاں کی فاشسٹ حکومت کے ذریعے انسانوں پر بہیمانہ مظالم ڈھائے گئے۔سینکڑوں نوجوانوں کو زنداں کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا ہے لیکن وہ نوجوان مصائب و ظلم و جبر اور قید کی صعوبتوں کو برداشت کر کے بھی وطن سے اپنی محبت و عقیدت اور وابستگی کا ثبوت پیش کررہے ہیں۔مذکورہ نظم انھیں نوجوان نسل کے احساسات و جذبات کی ترجمان ہے۔ ہر مصرعہ موجودہ عہد کی بے اطمینانی بے یقینی، سیاسی شعبدہ بازوں کی بے ضمیری اور انصاف شکنی کی مکمل دستاویز ہے۔دیکھیے یہ بند:

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں

فیض نے اپنے وطن کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر بھی آزادی، امن اور انصاف کے لیے شاعری کی ہے جس کی گونج ہند و پاک کی سرحدوں سے گزر کر ایران، افریقہ، فلسطین، بیروت تک سنائی دیتی ہے۔عالمی اخوت اور انسانی ہمدردی کے جذبوں سے سرشار اس فنکار نے ظلم و استبداد کے خلاف جو صدائے احتجاج بلند کیا ہے اس کی معنویت اور افادیت آج بھی مسلم ہے۔اس سلسلے میں ان کی نظم 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'، 'ایرانی طلبا کے نام' 'Came back Africa'، 'فلسطینی بچے کے لیے لوری'، 'ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لیے' وغیرہ ایسی تخلیقات ہیں جن میں شاعر کے ذہن کی تمام تر کیفیتوں کو محسوس اور دلوں کی دھڑکنوں کو سنا جاسکتا ہے۔ان نظموں میں فیض جبر و استبداد کے خلاف احتجاج ہی نہیں کرتے بلکہ ایرانی طلبا افریقی جانباز، کینیا کے عوام کی حمایت اور ہمدردی میں خود کو اس قدر ملوث کرلیتے ہیں کہ وہ ان کی شخصیت، عزم و استقامت کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' جو اتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہوکر لکھی گئی نظم ہے میں فیض نے اپنے محسوسات کی ساری تلخی، احساسِ الم کی شدت، جذبۂ محبت کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ ہر شعر میں انسانیت کی دردمندی کا عنصر غالب ہے۔ لہجے کی رجائیت میں غضب کی توانائی ہے۔دیکھیے یہ اشعار:

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

اسی طرح اپنی نظم "Africa came back" میں افریقی جانباز سے اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں:

میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرے روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیرے ببر کی چال
آجاؤ ایفریقا
آؤ ببر کی چال
''آجاؤ ایفریقا''

فیض صحیح معنوں میں عالمی اخوت اور انسانی ہمدردی کے علمبردار انسان دوست شاعر تھے۔انھیں زندگی کی شکست و ذلت برداشت نہیں تھی۔فیض نے ایک خواب دیکھا تھا اور جس کا زندگی بھر انتظار کیا۔آزادی کی جدوجہد کے دوران مستقبل کے جو خواب دیکھے گئے تھے وہ آج تک شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے۔آزادی تو ملی لیکن خون میں لت پت صبح کے ساتھ۔فیض نے اپنی نظم 'صبح آزادی' میں اسی جذبے کا اظہار کیا ہے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

اس نظم کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آزادی کے بعد جو توقعات و تصورات وابستہ تھے، منہدم ہوگئے حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ملک میں انگریزی سامراجیت کی جگہ سرمایہ داری نے لے لی اور اپنی حکومتیں قائم کرلی۔عوام کو نفسیاتی کشمکش کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔اس سلسلے میں بھی فیض کی شاعری سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔مذکورہ نظم میں 'داغ داغ اجالا' اور 'شب گزیدہ سحر' کا نظارہ شاعر کو ملول ضرور کرتا ہے مگر مایوس نہیں کرتا بلکہ نظم کی رجائیت خوداعتمادی پیدا کرتی ہے اور اس کے کئی مصرعے ہمیں حوصلہ بخشتے رہیں گے اور زندگی کے مختلف مرحلوں میں کام آسکتے ہیں فیض کو بھی اس کا یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں کہ یہ مصیبت بھی ٹل جائے۔ ماسکو میں بین الاقوامی لینن امن عالم کی تقریب کے موقعے پر فیض نے اپنی اردو تقریر ان لفظوں پر ختم کی:

''مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہوکر رہے گی اور آخرکار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

(دست تہِ سنگ)

Globlisaton کے اس دور میں جہاں پوری انسانیت داخلی انتشار کا شکار ہے، جہاں ملک و معاشرہ، افراد، ادب اور سیاست کے حالات و تقاضے بدل رہے ہیں ایسی صورت میں ہم فیض احمد فیض کے افکار و نظریات سے inspiration حاصل کرسکتے ہیں۔فیض کی شاعری آج بھی اکیسویں صدی میں پژمردہ دلوں کو شگفتگی، جادۂ حیات کے تھکے مسافروں کو سایۂ عافیت اور خوداعتمادی بخش رہی ہے۔

□

Dr. Manzar Husain, Dept. of Urdu, Ranchi University, Ranchi (Bihar)

نشاط فاطمہ

کیفی کی شاعری

انسان دوستی اور حق پسندی کی آواز

کیفی اعظمی کی پیدائش انقلاب روس کے ایک سال بعد 1918 میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک غیر معروف گاؤں مجواں میں ہوئی۔ وہ اپنے وقت کے ایک معزز مسلم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا گھرانہ اپنے گرد و نواح میں ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ مجلس و محرم کا ماحول اعلیٰ اخلاقی قدروں کا درس دیتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے لیے ان کو اپنے شہر سے دور لکھنؤ کے دینی مدرسہ 'سلطان المدارس' میں داخل کرایا گیا۔ مگر کیفی کا باغی ذہن وہاں کی تعلیم کو اپنے اندر نہ اتار سکا۔ انھوں نے اس وقت کے لکھنؤ کی بدلتی فضا اور سماجی اقدار کو اپنے لیے مناسب راہ تصور کیا اور اشتراکی فکر و نظر کا رویہ اپنایا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ترقی پسند ادبی تحریک کی داغ بیل 1936 میں لکھنؤ میں پڑ چکی تھی۔ لکھنؤ کی فضا اس سے معطر تھی۔

ترقی پسند ادبی تحریک کی پہلی تاریخ ساز کانفرنس پریم چند کی صدارت میں ہو چکی تھی اور سجاد ظہیر، ڈاکٹر ملک راج آنند اور ڈاکٹر رشید جہاں کے ساتھ ترقی پسند فکر و نظر کی ہوا لکھنؤ کی فضا میں گھول چکے تھے۔ لکھنؤ میں ترقی پسند تحریک کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ 'سلطان المدارس' کے باہر کی اس فضا نے کیفی کو زیادہ متاثر کیا۔ ان کو زندگی کے نئے خوابوں کی تعبیر ترقی پسند تحریک کی فضاؤں میں نظر آئی۔ وہ سلطان المدارس کو چھوڑ کر اشتراکی فکر و نظر سے قریب ہو گئے اور سلطان المدارس کو ہی نہیں جلد ہی لکھنؤ کو چھوڑ کر ممبئی کا رخ اختیار کیا۔ جہاں اشتراکیت کا بول بالا تھا۔ ممبئی جانے کا موقع کیفی کو ایسے ہاتھ لگا کہ وہ لکھنؤ

> **ترقی پسند تحریک نے پورے ملک میں نئی نسل کے شاعروں اور ادیبوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ شعر و ادب میں روایت سے بغاوت اور نئی دنیا کی تلاش کا رویہ پوری فضا پر چھا گیا۔ ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں ترقی پسند تحریک کے اثرات شاعری میں زیادہ نمایاں ہوئے۔ جن میں مخدوم، سردار، مجاز، مجروح، وامق، فیض کے نام کا سکہ رواں ہوا۔ اسی صف میں 1943 کے بعد سے کیفی اعظمی کا نام بھی ابھرتا ہے اور جلد ہی وہ اپنا ایک منفرد مقام بناتے ہیں۔**

میں قیام کے دوران چپکے چپکے روس کی حمایت میں نظمیں لکھ کر 'قومی جنگ' میں بلا نام کے بھیجا کرتے تھے۔ اس وقت سجاد ظہیر اور سردار جعفری پارٹی کے اہم لیڈران میں تھے۔ ان کو یہ کلام بیحد پسند آتا اور وہ اسے بلا نام کے ہی شائع کرتے رہتے۔ مگر اس کے تخلیق کار کی تلاش میں تھے کہ اچانک لکھنؤ آنے پر ان دونوں لوگوں کو کیفی دستیاب ہو گئے اور پھر وہ لوگ انھیں 1943 میں اپنے ساتھ بمبئی لے کر چلے گئے۔ (شوکت کیفی: میرے ہمسفر، نیا دور، لکھنؤ، جولائی-اگست 2002، ص103-104)

جہاں وہ کمیونسٹ پارٹی کے فل ٹائمر ہو گئے اور مشہور شاعر ہو گئے۔ اسی دوران ان کا پہلا شعری مجموعہ 'جھنکار' منظر عام پر آیا۔ کیفی اعظمی کی پوری شاعری اس بات کی شاہد ہے کہ وہ کمیٹڈ اشتراکی نظریات کے شاعر تھے۔ اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ اشتراکی فکر و نظر کا شاعر کبھی بڑا فنکار بن ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اشتراکی فلسفے میں اخلاق اور انسان دوستی کے تصورات محض اضافی ہیں۔ کیفی اعظمی نے اپنی زندگی کے رویوں سے اس قول کی نفی کر دی۔ وہ زندگی بھر اس اشتراکی نظریات کے پیرو کار رہے اور ساری زندگی انسان دوستی اور غریبوں و ناداروں کی مدد اور ان کے حق کے لیے لڑتے رہے۔ بے گھر لوگوں کے ساتھ وہ فٹ پاتھ پر سو کر زندگی گزارتے رہے اور اپنے انھیں تصورات کو اپنے اشعار میں ڈھالتے رہے۔ ان کی نظم 'مکان' کا ایک بند ملاحظہ ہو جو انسان دوستی کی نمایاں مثال ہے:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے

آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

ہماری سماجی زندگی میں عورت کی مظلومی کی بھی ایک داستان ہے۔ اس کچلی ہوئی عورت کے ساتھ کیفی کا انسان دوستی کا رویہ ملاحظہ ہو:

اٹھ میری جان میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
قدر اب تک تیری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے، دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے ایک چیز جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ میری جان، میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

کیفی کی شاعری کا پہلا مجموعہ 'جھنکار' 1944 میں جب شائع ہوا تو اس کا پیش لفظ سید سجاد ظہیر صاحب نے تحریر فرمایا اس میں وہ لکھتے ہیں:

''جدید اردو شاعری کے باغ میں ایک نیا پھول کھلا ہے۔ اس سرخ پھول ... کیفی کی شاعری قدیم اور جدید دونوں قسم کی غلاظتوں سے پاک ہے۔ اس میں سچی ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے ... کیفی اپنے ہم وطنوں کو جہد و عمل کا پر جوش پیام دیتا ہے۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب اردو شاعری پر ترقی پسند شعرا کے اثرات کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اردو شاعری کے آسمان پر مخدوم، سردار، مجاز، مجروح، وامق کا ستارہ روشن تھا۔ فیض کا پہلا مجموعہ کلام 'نقش فریادی' 1941 میں شائع ہو چکا تھا۔ ساحر کی 'تلخیاں' 1944 میں انقلابی اور احتجاجی آہنگ کے ساتھ اپنا جادو جگا رہی تھی۔ ایسے میں کیفی کا پہلا مجموعہ 'جھنکار' 1944 میں سامنے آتا ہے تو یقیناً سجاد ظہیر کا پیش لفظ بڑا وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے مدبرانہ گفتگو سے کیفی کی شاعری کے افکار و نظریات کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور کیفی کی شاعری کا سیدھا اور براہ راست طرز بیان اپنے نئے دلکش انداز کے سبب لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگا۔ جلد ہی وہ بڑے مقبول شاعروں میں شمار ہو گئے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''وہ ایک حساس، انسان دوست اور حق پسند انسان اور شاعر زیادہ تھے۔ ان کا کمٹمنٹ انسان اور انسانیت سے پہلے تھا... اشتراکیت میں انھیں یہ سب کچھ ایک منصوبہ فکر کے ساتھ نظر آیا اس لیے وہ اس پر یقین کر بیٹھے اور ساری زندگی یقین کیے رہے۔'' (علی احمد فاطمی: عوام اور انقلاب کا شاعر کیفی اعظمی، کیفی: مرتبہ ڈاکٹر شباب الدین 2006)

ترقی پسند تحریک نے پورے ملک میں نئی نسل کے شاعروں اور ادیبوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ شعر و ادب میں روایت سے بغاوت اور نئی دنیا کی تلاش کا رویہ پوری فضا پر چھا گیا۔ ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں ترقی پسند تحریک کے اثرات شاعری میں زیادہ نمایاں ہوئے۔ جن میں مخدوم، سردار، مجاز، مجروح، وامق، فیض کے نام کا سکہ رواں ہوا۔ اسی صف میں 1943 کے بعد سے کیفی اعظمی کا نام بھی ابھرتا ہے اور جلد ہی وہ اپنا ایک منفرد مقام بناتے ہیں۔ ان کے ابتدائی کلام میں رومان پرور فضا ملتی ہے۔ جس کی لطیف کیفیت دل کی دھڑکنوں کو تیز کرتی ہے اور لوگوں کے دلوں کو مسحور کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

دیوانہ وار چاند سے آگے نکل گئے
ٹھہرا نہ دل کہیں بھی تیری انجمن کے بعد
جرم ہے تیری گلی سے سر جھکا کر لوٹنا
کفر ہے پتھراؤ سے گھبرانا تیرے شہر میں

نظم 'اندیشے' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوز محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہو گا

ایک دو نہیں ایسی ان کی بے شمار نظمیں ہیں مثلاً عورت، پشیمانی، حوصلہ، تبسم، معذور، کہرے کا کھیت، برسات کی رات، جو بہت ہی خوبصورت تراشی ہوئی نظمیں ہیں۔ جہاں ان کے جدّت طبع کا احساس ہوتا ہے اور ان کے ایک بڑے فنکار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

ان رومان پرور رویوں کے ساتھ ہی کیفی کی شاعری انسانی درد کے اظہار کا منظر نامہ ہے۔ کیفی نے اشتراکیت کا جو خواب دیکھا تھا اس خواب کے حوالے سے کیفی کی شاعری کا منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ جس میں وہ انسانیت کے درد کو پوری زندگی محسوس کرتے رہے اور بقول فیض:

''کیفی کی شاعری ایک متوازن ٹھہرے ہوئے درد مند، فکر انگیز اور حساس نظریہ حیات و فن کا بلیغ اشارہ ہے۔''

اور بقول پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی:

''سردار جعفری اور کیفی میں ایک فرق یہ محسوس ہوتا ہے کہ کیفی کی نظموں میں خطابت کا عنصر بہت ہے، لیکن اس میں درشتی اور کرختگی نہیں ... ان کی آواز جعفری کی طرح پھٹ کر بکھر نہیں جاتی بلکہ فصاحت اور روانی باقی رہتی ہے۔'' (خلیل الرحمٰن اعظمی: اردو میں ترقی پسند تحریک، ص 148)

کیفی کی شاعری ترقی پسندیت کا ایک جیتا جاگتا شعری منظر نامہ ہے جہاں حقیقت پسندی کے ساتھ ظلم کے خلاف آواز ہے۔ جو اپنے عہد ہی کو نہیں نئی نسلوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ کیفی کا یہی وصف انھیں ترقی پسند شعرا میں نمایاں اور معروف مقام عطا کرتا ہے اور وہ آنے والی نسلوں کے درمیان بڑے شوق و احترام سے یاد کیے جاتے رہیں گے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے جب بھی جلسے ہوں گے اشتراکی نظریات کے کمٹمنٹ کی بات ہوگی تو کیفی اعظمی کی یاد ہوگی۔ اس لیے وہ انسانی زندگی کو ایک نئے اور بہتر نظام کے قالب میں ڈھالنے کے تاحیات خواہاں اور کوشاں رہے اور یہی درس اپنی شاعری سے عوام کو دیتے رہے۔ ان کی آواز آج بھی اور آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کرتی رہے گی۔

■

Dr. Nishat Fatima, 2/C, Abubakarpur, Dhoomanganj, Allahabad - 211011, (UP)

علامہ اقبال اور رومانیت

مشابہتیں اور تضادات

ابراراحمد اجراوی

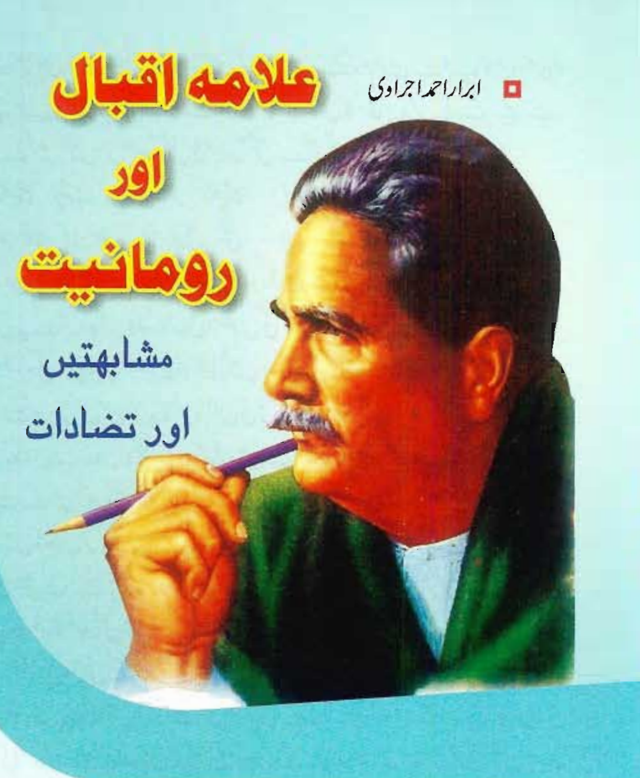

رومانیت یورپ میں کلاسیکیت کے خلاف ایک طاقت وراور زوردار باغیانہ تحریک کے روپ میں نمودار ہوئی تھی۔ اس نے نہ صرف یہ کہ قصر کلاسیکیت کی عقلیت، اصول پرستی، تقلید، روایت پروری اور میانہ روی کی دیواروں کو منہدم کرکے پورے کلاسیکی محل کو ہی زمیں بوس کر دیا بلکہ اس کے ملبے پر انسانوں کی آزادی، محبت، تخیل، حسن وعشق اور جذبہ ووجدان کا عالی شان محل بھی تعمیر کر دیا۔ انیسویں صدی میں دنیا کے نقشے پر تیزی سے ابھرنے والا رومانی نظام کسی بھی طرح اور کسی بھی قیمت پر ان قدیم، از کار رفتہ اور جامد اصولوں پر کار بند رہنے کو تیار نہ تھا، جو تغیر دشمن اور جمود دوست سماج کی پیداوار تھا۔ فرانسیسی مفکر روسو نے جو یہ کہا تھا: ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے؛ مگر جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔'' اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ انسانوں کی تخلیق انسانوں کے ذریعے بنائے گئے قواعد وضوابط اور اصولوں کی پابندی کے لیے نہیں؛ بلکہ یہ کائنات خود انسانوں کے لیے وجود میں آئی ہے یعنی انسان اصولوں کا غلام نہیں؛ بلکہ ایسا شہنشاہ ہے، جو ضابطوں اوراصولوں کے قافلوں کو شکست دیتا، ہر دم نئے شعور کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے رومانی طرز فکر کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

''رومانویت ایک طرز فکر کی طرح ابھری، جس کا سارا زور عقل کے وضع کردہ ضابطے پر نہ تھا، انسان کے اندرونی تڑپ پر تھا اور جو اس تڑپ کو آسودگی نہ دے سکے، اس کے توڑ ڈالنے، بکھرا دینے پر تھا، خواہ اس کوشش میں انسان خود ہی کیوں نہ ٹوٹ اور بکھر کر رہ جائے۔''[1]

روسو کے مذکورہ نعرے سے جنم لینے والے رجحانات نے، رومان پسند اذہان کو کلاسیکی عقل پرستی سے سرتابی کا ہنر سکھایا، ان کے اندر کلاسیکیت پر مبنی اصولوں کے حوالے سے تشکیک کا مادہ پیدا کیا، ان کے اندر یہ احساس بیدار کیا کہ جذبات پر خارجی عناصر کا استیصالی قبضہ اور تخیل ووجدان پر احتساب کے پہرے بٹھانا کسی طور درست نہیں۔ رومانی ادیبوں کے ہاں جذبات کی شدت، بے باک عشق اور تخیل و وجدان کی آزادی کا تصور ملتا ہے۔ یہ لوگ زمانے کے مقرر کردہ اصولوں سے بے پرواہ ہر پرانی اور فرسودہ روایات کو قصۂ پارینہ بنا ڈالنا چاہتے تھے۔

اردو ادب میں مغربی رومانیت کا ہو بہو تصور تو نہیں ملتا مگر اس میں بھی رومانی عناصر بدرجۂ اتم موجود رہے ہیں۔ اردو ادب میں کلاسیکی اصول پسندی کا رجحان بہت دنوں تک عام رہا ہے۔ اس وقت اردو ادب عروض وقوافی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، شعر اور نثر دونوں پر قومی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کا وظیفہ مخصوص تھا۔ یہاں نجی اظہار اور انفرادیت کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ غم دوراں غم جاناں کے سامنے بونا تھا۔ اردو ادب روایات کا کتنا پرستار اور سکہ بند اصولوں کا کتنا پابند تھا کہ پروفیسر محمد حسن کو یہ لکھنا پڑا کہ:

''اردو ادب روایت زدہ رہا ہے۔ صدیوں تک اس پر نجی اظہار کا سایہ بھی نہیں پڑا۔ بلکہ روایتی مضامین، متعینہ محاکات اور امیجری لہجے اور مزاج کے مطابق حکمرانی کرتے رہے۔ خواہ نثر ہو یا نظم، دونوں کا مزاج سکہ بند اور متعین اور ایسے روایت زدہ معاشرے میں رومانویت کا ظہور گویا کسی رنگ برنگے شیش محل کی خلوت میں اچانک کسی دیوانے کے گھس آنے سے کم نہ تھا۔''[2]

اس نری مقصدیت اور روایت پرستی کے خلاف جدید شعرا نے بھی آواز اٹھائی تھی۔ مولانا حالی سنجیدہ عقلیت، اخلاقی اقدار اور سماجی اصلاح کے حامی ہونے کے ساتھ قدیم اسالیب اور اصولوں کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں بھی ہیں۔ اسی کام کو رومانیت نے وسیع پیمانے پر انجام دیا۔ اردو میں رومانی تحریک علی گڑھ تحریک کی عقلیت پسندی، مقصدیت اور اجتماعیت کے فلسفے کے خلاف رد عمل کے طور پر وجود میں آئی تھی۔

مذکورہ تعریف میں رومانیت اپنے تمام بنیادی امتیازات کے ساتھ جلوہ گر ہے، مزید تشریح کے لیے رومانیت کی بنیادی خصوصیات شمار کراتے ہوئے پروفیسر ظہورالدین رقم طراز ہیں:

''اس رجحان (رومانیت) کی بنیادی خصوصیات تخلیق کی آزادی، آمد، آہنگ، خلوص، خیال کی آزادی، ابہام پرستی، قسمت اور خدا سے بغاوت، معنی خیزی، علامت نگاری اور پیکر تراشی وغیرہ ہیں؛ لیکن وہ خصوصیت، جسے اس تحریک کا طرۂ امتیاز کہا جاتا ہے، وہ اس کی داخلیت یا جذبہ ووجدان کی ترجمانی ہے''۔[3]

مجنوں گورکھ پوری کا یہ قول بجا ہے کہ رومانیت کے عناصر، اردو شاعری کی گھٹی میں موجود تھے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یہ عناصر عرصے تک تنظیم وتشکیل سے محرومی کا شکار رہے۔ یوں بھی بیسویں صدی سے پہلے کی شعری دنیا میں غزل کی حاکمیت رہی ہے۔ سب سے پہلے علامہ اقبال نے ہی اردو شاعری کو رومانیت کی راہ پر لگایا۔ ان سے متاثر ہو کر دوسرے معاصر شعرا نے بھی فطرت کے حسن اور خارجیت کے بجائے داخلیت کو اپنے کلام میں جگہ دی۔ بقول منظر اعظمی:

''اقبال نے نظموں میں فکر اور فن کے حوالے سے جو تبدیلیاں پیدا کیں، ان میں جوش وجذبے، فکر وعمل اور تیزی وتندی کی جو کیفیت تھی، اس نے رومانوی شاعروں کو حوصلہ بخشا۔''[4]

رومانی شعرا میں حفیظ جالندھری نے زندگی کے مادی چہرے سے نقاب الٹا ہے، ان کے ہاں فطرت کی جمالیات کا حسین نغمہ ملتا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی رسم ورواج اور یہاں کے فطری مناظر کی خوب صورت تصویر کھینچی ہے۔ عظمت اللہ خاں کے یہاں تو عبادت بریلوی کے مطابق، رومان کے علاوہ کچھ اور ملتا ہی نہیں، تاہم ان کی رومانیت کا دائرہ محدود ہے۔ انھوں نے عورت کے محبت آمیز جذبات کا ذکر کرکے، مردوں کے جذبات کی انفعالیت کو ہوا دی ہے۔ البتہ جوش ملیح آبادی کے یہاں رومانیت بڑے آب وتاب اور سارے رنگ وآہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ انھوں نے حسن کی ترجمانی کے ساتھ فطرت کی جلوہ آرائے عالم نیرنگیوں کو بھی خوب صورت پیرایے میں بیان کیا ہے؛ لیکن صرف ظاہری جمالیاتی عناصر کو نظم کرنے کی وجہ سے ان کی شاعری میں سطحیت کی بو آگئی ہے۔ اختر شیرانی نے تخیل کی آزادانہ روش سے کام لے کر، زندگی کو ایک ماورائی خواب بنا ڈالا ہے۔

جوش، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کی جادو صفت رومانیت سے جن شعرا نے اثر قبول کیا اور رومانیت کی بساط پر ابھر کر سامنے آئے، ان میں اہم نام یہ ہیں۔ علی اختر، اختر انصاری، حامد اللہ افسر، روش صدیقی، ساغر نظامی، احسان دانش اور الطاف مشہدی وغیرہ۔

شیخ عبدالقادر کے رسالے مخزن نے جن رومان پسند ادیبوں کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا، ان میں علامہ اقبال کو اولیت حاصل ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ہی، رومانی شعرا سے ان کو اچھی خاصی واقفیت تھی۔ مغربی شاعری کو مشرقی طرز اظہار میں پیش کرنے کی کوشش، اقبال کا اولین رومانی اظہار ہے۔ ورڈز ورتھ کی شاعری کے مطالعے سے، ان کے اندر مناظر فطرت کے حسن و جمال کو سمجھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ مغرب کے رومان پسند شعرا کے مطالعے اور ان سے استفادے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال اپنے کلام میں تخیلی اور ماورائے حقیقت تشبیہوں کے بجائے حسی اور حقیقی تشبیہوں کو محوری حیثیت دینے لگے۔ حالاں کہ وہ بھی ابتدا میں دوسرے مشرقی شعرا کی طرح خیالی اور فرضی تشبیہوں کے شیدائی رہے تھے۔

اقبال فطرت میں پوشیدہ اسرار و رموز سے پردہ اٹھانے کو اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے مناظر فطرت کی عکاسی، حسن ازل کی تلاش اور فطرت میں پوشیدہ معانی کو منکشف کرنے کے لیے اپنے فن کا خوب استعمال کیا ہے اور خارجی حسن کے بجائے، داخلی حسن میں جھانک کر، پوشیدہ جہان معنی کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ اقبال کی رومانیت ماضی کی عظمتوں سے بھی اپنا رشتہ استوار کرتی ہے۔ مسجد قرطبہ اور ذوق وشوق جیسی نظموں میں ماضی کی انھی عظمتوں کے اعتراف کے ساتھ، حال کی زوال آمادہ صورت کی عکاسی ملتی ہے۔

1. رومانیت کے دو عنصر جذبہ اور وجدان کی علامہ اقبال کی شاعری میں اتنی جلوہ گری ہے کہ اگر ان بنیادوں پر انھیں صرف رومانی شاعر کا لقب دیا جائے، تو بھی کوئی حرج نہیں۔ انھوں نے دنیا کی تعمیر میں جذبے اور وجدان کو بڑی اہمیت دی ہے، البتہ وہ ان کے تکملے کے طور پر اطاعت اور اجتماعیت پر بھی زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

''اقبال جس طرح عقل کو خدا نہیں بناتا، اسی طرح جذبے کو بھی خدا نہیں بناتا؛ بلکہ زندگی میں دونوں کا مقام تسلیم کرتا ہے۔ آرٹ میں موحد کا یہی نقطۂ نظر ہوسکتا ہے۔''5

اقبال نے جذبے اور وجدان کے مقابلے میں مصائب کے سنگ گراں کے اٹھانے میں کسی پس وپیش یا دائیں بائیں کی منطق سے کام نہیں لیا ہے۔ وہ عشق کو عقل پر اسی لیے ترجیح دیتے ہیں کہ عقل عیار اور مصلحت جو ہے، جب کہ عشق ایک جذبۂ بے کراں اور داخلی انتہا پسندی کا نام ہے، جو مصائب و آلام سے خوف نہیں کھاتا، بلکہ ان سے ان سے نبرد آزمائی اس کی ترجیحات میں شامل ہے۔ تاہم اقبال خرد کے مقام سے بھی یکسر انکاری نہیں:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اور یہاں تک کہہ جاتے ہیں:

عقل تمام بولہب عشق تمام مصطفیٰ

علامہ اقبال تو تخلیقی کیفیت کو الہام اور وجدانی آمد سے تعبیر کرتے تھے۔ جب تخلیق کار وفور وجدان اور شوق و مستی کی انتہا پر ہوتا ہے تب اس پر تخلیقی تصورات نازل ہوتے ہیں۔ مغربی رومان پسندوں ہی کی طرح اقبال کے نزدیک فن کا محرک اور طاقت ور عامل کوئی اور نہیں، بلکہ یہی جذب و وجدان ہے اور عشق و مستی کا بہاؤ ہے:

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ　　سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

2. علامہ اقبال کی رومانیت خطرات سے راہ فرار اختیار نہیں کرتی؛ بلکہ بے باکی سے انھیں گلے لگاتے ہوئے طوفانی جذبوں سے محبت کا علانیہ ثبوت دیتی ہے۔ ان کا مشہور استعارہ شاہین، کبوتر پر اس لیے حملہ نہیں کرتا کہ اس کے گرم خون سے اپنے کام ودہن کو سیراب کرے؛ بلکہ یہ حملہ اور جست صرف حرکت وعمل کا مظاہرہ کرنے کے لیے ہے۔ اقبال نے کہیں کہیں اس عنصر کو عمل پیہم اور عشق سے بھی تعبیر کیا ہے:

جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا　　لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
ہر لحظہ نیا طور، نیا برق تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ان اشعار میں رومانیت کا بنیادی عنصر، آرزومندی، شوق اور تخیل ملتا ہے؛ مگر علامہ کا کمال یہ ہے کہ وہ آرزو اور انسانی امنگوں کی تکمیل کے مصائب آمیز اور دشوار گزار سفر میں، افسردگی، مایوسی یا قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے؛ بلکہ مصائب وآلام اور خطرات کے تعلق سے ہر دم ''ہل من مزید کا نعرہ'' ان کی زبان پر رہتا ہے۔

3. رومانیت پسندوں کا نظریہ ہے کہ فرد میں بے انتہا امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ اقبال نے رومانیت کے اس عنصر یعنی فرد یا ذات کو، اپنے عظیم فلسفۂ خودی اور مرد مومن کے تصور کے قالب میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے جذبہ، آرزومندی اور عشق بنیادی لوازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرد کی اہمیت اس لیے ہے کہ ہزاروں سال نرگس کے رونے کے بعد، دیدہ ور فرد کا ظہور عمل میں آتا ہے۔ اقبال کے ہاں خودی کیا ہے، ڈاکٹر سرور احمد لکھتے ہیں:

''خودی اقبال کے ہاں کسی قسم کے تکبر اور غرور کا اشاریہ نہیں؛ بلکہ انسان میں سعی وعمل کی قوت ہے، جو اس کی ذات میں نمو پاتی ہے۔ انسان خودی کے ذریعے جہاں اپنی ذات کی تشکیل کرتا ہے، وہاں بنی نوع انسانی کے لیے ارتقا کے منازل کا اور کشش جہت امکانات کے دریچے کھولتا ہے''۔6

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلمان　　مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش　　خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

خودی کے اس جوہر کو علامہ اقبال نے علامتوں سے بھی ظاہر کیا ہے:

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا ہے، جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

علامہ نے لفظ 'میں' استعمال کر کے، فرد کی آزادی کا کھل کر اظہار کیا ہے:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　کہ میں ہوں محرم راز درون مے خانہ

4. اقبال کے ہاں رومانیت، ماضی پسندی کے تصور میں بھی نمو پاتی ہے۔ ماضی کی ان مٹ یادوں، اسلاف کے ناقابل فراموش کارناموں اور عرب وعجم کی عظیم شخصیتوں نے ان کے دل ودماغ پر اسی طرح اپنے دوررس اثرات مرتب کیے ہیں، جس طرح عہد وسطی کے یورپ اور وہاں کی شخصیات نے رومانی ادیبوں پر۔ ان کے ہاں مختلف المزاج اور مختلف الخیال ہستیاں ملتی ہیں، جو اپنی طاقت، جذبۂ آرزومندی اور حرکت وعمل کے اعتبار سے تاریخ میں عظیم کہلانے کی مستحق ہیں۔ جیسے نپولین، لینن اور طارق بن زیاد وغیرہ۔ اقبال اتنے ماضی پسند کیوں تھے، پروفیسر ظہورالدین نے تعمیمیت کے ساتھ لکھا ہے:

''ان (رومانی ادیبوں) کے ہاں قرون وسطی سے بھی پیار اور دل چسپی ملتی ہے۔ یہ ان کے لیے روحانی مسکن کا کام دیتی ہے اور انھی کی مدد سے وہ جدید دنیا کی تعمیر بھی کرتا ہے۔''7

اقبال کی بہت سی تلمیحات اور تشبیہات سے قرون وسطی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور بہت سے ماورائی اعتقادات کی پرتیں بھی ہٹنے لگتی ہیں:

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا　　روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد
کشتی مسکین و جان پاک و دیوار یتیم　　علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

لگی نہ میری طبیعت ریاض جنت میں پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے
کبھی میں ذوق تکلم میں طور پر پہنچا چھپایا نور ازل زیر آستیں میں نے

پروفیسر محمد حسن کا یہ قول بجا ہے:

''ان کی تشبیہوں میں جبین جبریل کی تابنا کی ہے، خضر کی خجستہ گامی اور ضرب کلیم کی داستانیں ہیں۔ مذہبی ماورائی اعتقادات کی وہی فضا ہے، جو ہمیں رومانیت کی یاد دلاتی ہے''۔ [8]

علامہ کو اپنے آباواجداد کی اولوالعزمی اور ان کے فلسفۂ وحکمت میں مہارت پر بھی فخر ہے۔ وہ سپرو برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس نے سب سے پہلے اسلامی فلسفے کی طرف توجہ دی تھی:

میں اصل کا خاص سومناتی آبا میرے لاتی ومناتی
ہے فلسفہ میرے آب وگل میں پوشیدہ ہے ریشۂ دل میں
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ

5. رومانی شعرا جب اصول وضابطوں کے شکنجوں سے تنگ آجاتے ہیں، تو وہ فطرت کی پوجا کرنے لگتے ہیں اور سادگی ومعصومیت کا گیت گانے لگتے ہیں۔ انھیں بناوٹ اور تصنع سے انس نہیں رہتا؛ اسی لیے وہ کائنات کے نقشے پر بکھرے مناظر فطرت کی عکاسی کرنے لگتے ہیں۔ اقبال کے ہاں بھی مناظر فطرت کا خوب صورت بیان ملتا ہے۔ لیکن فطرت نگاری ان کا مقصد نہیں؛ بلکہ اس کا استعمال صرف وسیلے اور ذریعے کے طور پر ہوا ہے۔ اصل مقصد کچھ اور ہے، جو ان کے شاعرانہ فلسفے سے عبارت ہے۔ سچا فن کار فطرت اور سماج دونوں کے درمیان پل کا کام کرتا ہے اور دونوں کے آمیختے پر مبنی ایک نئی انسانی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے بجا لکھا ہے: ''ایک سچا فن کار فطرت اور سماج دونوں سے متاثر ہوتا ہے اور دونوں سے پیار کرتا ہے۔ وہ محض فطرت کا نقال اور سماجی اقدار ومقاصد کا ڈھنڈورچی نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی تخلیقی قوتوں سے کام لے کر فطرت اور سماج دونوں کو ایک نیا حسن اور نئی زندگی عطا کرتا ہے۔'' [9]

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی کوثر وتسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ دریا نرم سیر تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب

6. رومانی شعرا نے وطن کی آزادی کے نغمے بھی گائے ہیں۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے وطن پرستی کا ثبوت دیا ہے وہ چاہتے تھے کہ ان کا وطن ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد رہے۔ اقبال کے ہاں بھی وسیع تناظر میں وطن پرستی پر مبنی جذبات کا اظہار ملتا ہے:

رلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
جلاتا ہے مجھ کو ہر شمع دل سوز پنہاں سے تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

7. رومانیت نے کلاسیکیت کے متعینہ سانچوں پر بھی وار کیا، کلاسیکی شاعری کے اوزان وبحور پر بھی کاری ضرب لگائی، اٹھارہویں صدی کی پر تکلف زبان کو بھی خیر باد کہہ دیا اور علامیت و پیکر تراشی اور معنی خیزی کو اہمیت دی۔ پرانی ہیئتوں اور قدیم تکنیک کو بھی رومانیت نے ہوا میں اچھال دیا۔ رومانی شاعر ہونے کے ناطے، علامہ اقبال نے نئے معیار ضرور ڈھالے، مواد اور موضوع کے اعتبار سے بھی بغاوت کا علم بلند کیا؛ تاہم انھوں نے پابندی عروض کی کبھی خلاف ورزی نہ کی اور قوافی کے مسلمات پر ان کے مضبوط اعتقاد میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی، اقبال تو فن سے گہری وابستگی کو لازمی شے قرار دیتے تھے اور ان کے نزدیک تو معجزۂ فن کی نمود کا سارا مدار خون جگر پر تھا۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ ایک ہی نظم میں مختلف اوزان کے مصرعے ترتیب دیے، یا ایک ہی نظم میں دو زبانوں فارسی اور اردو کا استعمال کیا۔ ایسی ترکیب بند نظمیں ایجاد کیں، جن کے اشعار کی تعداد عام روایات سے متصادم تھے۔ تغزل کی روح برقرار رکھتے ہوئے، غزل کی مسلمہ ہیئت میں بھی انھوں نے تبدیلی گوارا کی اور کئی بے مقطع اور بے مطلع غزلیں کہیں۔ بقول نورالحسن نقوی:

''نہ انھوں نے قافیے کو ترک کیا اور نہ مروجہ بحروں کو رد کیا۔ البتہ مروجہ شعری شکلوں میں معمولی رد و بدل کر کے، انھوں نے جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً ایک ہی نظم میں مختلف وزن کے مصرعوں کا اہتمام یا ایک نظم میں مختلف زبانوں کا استعمال'' [10]

مرید ہندی اردو میں سوال کرتا ہے اور پیر رومی فارسی میں جواب دیتا ہے۔

مرید ہندی:

چشم بینا سے جاری ہے جوخوں علم حاضر سے ہے دین زارو .بوں

پیر رومی:

علم را برتن زنی مارے بود علم را بردل زنی یارے بود

8. اقبال کے یہاں آزادی، مستی اور جذب ووجدان اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ انسان ان کا کلام سن کر وجد کرنے لگتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس کے لیے لفظ قلندر کا استعمال کیا ہے، جس سے بڑھ کر رومانیت کا کوئی اور ثبوت نہیں ہوسکتا۔ اقبال اپنی قلندری کو شاعری سے بھی بڑا سمجھتے ہیں:

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری وگر نہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے
مہرو مہ وانجم کا محاسب ہے قلندر ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

اقبال کی شاعری میں رومانی عناصر کی بازگشت ضرور سنائی دیتی ہے، لیکن جس طرح بعض رومانی شعرا بے راہ روی اور بے قاعدگی کی حدوں کو بھی پھلانگ گئے ہیں، اقبال نے ان انتہا پسندیوں سے اپنی شاعری کو دور ہی رکھا ہے۔ ان کا شعری آرٹ اتنا ہمہ گیر ہے کہ انھیں کلاسیک یا رومان میں سے کسی ایک خانے میں رکھ دینا اور کوئی خاص لیبل لگا دینا، ادبی ناانصافی ہوگی۔ پروفیسر محمد حسن بجا فرماتے ہیں:

''اقبال کو محض رومانی شاعر نہیں کہا جا سکتا؛ کیونکہ وہ حالی کی طرح ادب کی مقصدیت کے بھی قائل ہیں اور جذبے کے ساتھ فکر کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اقبال بہرنوع رومانی فکر سے کافی متاثر ہیں اور ان کے کلام نے جذب وجنوں کو مذاق عام بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔'' [11]

حوالے:

1. محمد حسن (پروفیسر) طرز خیال، ص:197، اردو اکادمی دہلی، 2005 2. ایضا، ص: 199 3. ظہورالدین (پروفیسر) جدید ادبی وتنقیدی نظریات، ص:59، ادارہ فکر جدید، نئی دہلی، 2005 4. منظر اعظمی، اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ص:325، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1966 5. یوسف حسین خان (ڈاکٹر) روح اقبال، ص:70، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی، 1966 6. سرور احمد (ڈاکٹر) اردو اور ہندی رومانی شاعری میں علامتوں کا مطالعہ، ص:74، معیار پبلی کیشنز نئی دہلی، 1992 7. جدید ادبی وتنقیدی نظریات، ص:60 8. محمد حسن (پروفیسر)، اردو ادب میں رومانوی تحریک، ص:31، کاروان ادب ملتان، پاکستان، 1986 9. رفیع الدین ہاشمی، اقبال بحیثیت شاعر، ص:114، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1996 10. نورالحسن نقوی، اقبال: مفکرو شاعر، ص:68، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 2006 11. اردو ادب میں رومانوی تحریک، ص:32

■

Abrar Ahmad, Room No 21, Lohit Hostel, Jawaharlal Nehru University, New Delhi - 25

امرتا پانڈے

کنھیا لال کپور
طنز و مزاح

طنز و مزاح اورظرافت ہماری زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ اس کے بغیر ہماری زندگی ویران سی معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح ادب اورزندگی کا بہت گہرا تعلق ہے۔ اسی طرح طنز ومزاح کا ہنسی سے بہت گہرا تعلق ہے۔آج کے اس مشینی اور تیز رفتار دور میں طنز ومزاح کی اہمیت و معنویت زیادہ بڑھ گئی ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے صرف بیجا مشغلے اور دلجوئی کے طور پر استعمال کرتے ہیں بلکہ یہ ایک ایسی مفید صنفِ ادب ہے جو ہمارے معاشرے اور سماج کی برائیوں اور کوتاہیوں سے ہمیں آگاہ کراتی ہے۔مزاح نگاران باتوں کوظرافت کی چاشنی میں ڈبوکر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ہر چند کہ ایسی تحریریں ہمیں قہقہے لگانے پر مجبور کرتی ہیں لیکن اس کے پس پردہ قاری یا سامع کوسماج کی ناہمواریوں سے باخبر کرنے کا مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر مزاح نگار لفظوں کے نشتر چبھونے کا کام کرتا ہے کہ قاری یا سامع تلملا اٹھتا ہے۔

اردوطنز ومزاح کی روایت کوجن ادیبوں نے وقار عطا کیا اوراس کے فروغ میں خصوصی دلچسپی لی ان میں کنہیالال کپور کا نام بے حد اہم ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اردو نثری ادب کو انھوں نے اپنی شگفتہ تحریروں سے مالامال کیا۔ وہ ان مزاح نگاروں میں سے تھے جن کے ہنسنے ہنسانے کا بھی ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ان کے نزدیک طنز ایک قسم کی شگفتہ تنقید ہے اورطنز نگاری ایک طرح کا مقدس مشغلہ۔کنہیالال کی تخلیقات کے جادو میں انسان خود کو فراموش کردیتا ہے۔ اپنی پریشانیوں اور مجبوریوں کو

> کنھیا لال کپور اپنے مضمون 'کاٹھ کا الو' میں یہ بتانے کی کوشش کرتے ھیں کہ کچھ ایسے بھی لوگ ھیں جو نااھل ھونے کے باوجود بھی کرسیوں پر براجمان ھیں۔ انھیں کرداروں میں ایک 'سیٹھ کچو مرلال' بھی ھے جو نااھل ھونے کے باوجود الیکشن جیت جاتا ھے اور کرسی کا حقدار قرار پاتا ھے جب کہ باصلاحیت شخص اپنی شکست سے مایوس ھوکر بیٹھ جاتا ھے، اور نااھل سیاست داں دوسروں کے ھاتھوں کٹھ پتلی کا ناچ ناچتا رھتا ھے۔ کپور نے ایسے ھی لوگوں کو اپنے مضمون کا نشانہ بنایا ھے۔

بھول جاتا ہے۔ ہم ان تحریروں میں صرف ظرافت اور مزاح کے بیل بوٹے نہیں پاتے بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو اعلیٰ اورمعیاری طنز کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ان کا طنز کسی خاص فرد یا جماعت یا قوم وملک کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ ان میں ہر جگہ اصلاحی رنگ کی آمیزش پائی جاتی ہے۔وہ تعمیری طنز کوظرافت کے پردے میں چھپا کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور ہم مزاح میں چھپی ہوئی کڑواہٹ کو محسوس کرلیتے ہیں۔ وہ کسی کی دل آزاری اور دل شکنی نہیں کرتے۔ ان کا مقصد سماج میں پھیلی ہوئی خودغرضی اور جہالت کودور کرنا ہے۔وہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کوختم کرنا چاہتے تھے۔وہ ایک صاف ستھرے ماحول میں زندگی گزارنے کے خواب کی تعبیر پیش کرنا چاہتے تھے۔ان کی ان خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے عزیزاحمد رقم طراز ہیں:

''ترقی پسند تحریک نے صرف ایک اچھا ظریف اور مضحکہ نگار پیدا کیا ہے وہ کنہیالال کپور ہیں۔ان کی مضحکہ نگاری میں جوقوت ہے وہ سنجیدہ تنقید اور سخت سے سخت تنقید میں نہیں۔''

(ترقی پسندادب میں ترقی پسندظرافت،ص163)

یہ امرمسلم ہے کہ سماج اورزندگی کی ناہمواریاں ان کے طنز کا خاص موضوع رہے ہیں لیکن ان کے طنز کا دائرہ یہیں تک محدود نہیں ہے۔علم و ادب کی طرف فطری رجحان ہونے کے باعث بیشتر موقعوں پرانھوں نے ادبی شخصیات،شعراوادبا کواپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''غالب: بھئی یہ کیا مذاق ہے۔نظم پڑھیے مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟ ڈاکٹر خالص: (جھنجھلا کر) تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔

غالب: میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔نہ ترنم نہ قافیہ نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص: مرزا صاحب! یہی جو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کررکھا ہے۔ ہم نے

اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا اور اس میں وہ اوصاف پیدا کیے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعت تخیل تازگی افکار اور مذاتِ فکر سے ہے۔''

دوسری طرف بعض مضامین میں کردار کے وسیلے سے کوتاہی اور کجروی کو بے نقاب کرتے ہیں ایسے کرداروں میں ادیب، لیڈر، عورت، سنیما کا ڈائریکٹر بہ طورِ خاص ہیں ان کے کرداروں سے جو بھی حماقتیں واقع ہوتی ہیں، انھیں نہایت سنجیدگی کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کردیتے ہیں اور واقعات اور حالات کو بالکل نئے انداز میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کنہیا لال کپور اپنے مضمون 'کاٹھ کا الو' میں یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو نااہل ہونے کے باوجود بھی کرسیوں پر براجمان ہیں۔ انھیں کرداروں میں ایک 'سیٹھ کچومرلال' بھی ہے جو نااہل ہونے کے باوجود الیکشن جیت جاتا ہے اور کرسی کا حقدار قرار پاتا ہے جب کہ باصلاحیت شخص اپنی شکست سے مایوس ہوکر بیٹھ جاتا ہے، اور نااہل سیاست داں دوسروں کے ہاتھوں کٹھ پتلی کا ناچ ناچتا رہتا ہے۔ کپور نے ایسے ہی لوگوں کو اپنے مضمون کا نشانہ بنایا ہے۔ اس مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اشتہار پر دائیں طرف سیٹھ صاحب کی تصویر تھی بائیں طرف کاٹھ کے الو کی، لیکن ذہین سے ذہین آدمی بھی تمیز نہیں کرسکتا تھا کہ سیٹھ صاحب اور کاٹھ کے الو میں کیا فرق ہے۔'' (بال و پر، ص49)

کپور کا یہ مضمون نااہل سیاست دانوں کے منھ پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔ یہ لوگ اپنی دولت اور جھوٹی شہرت کے بل پر الیکشن جیت جیتے جاتے ہیں اور ان کا کوئی مقابلہ کرتا ہے تو شکست کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں ایک ایسے شخص کی تصویر ہے جو مقابلے پر آخری دم تک قائم رہتا ہے لیکن نتیجہ اس کی امیدوں کے برخلاف نکلتا ہے:

''اس کو سیٹھ صاحب کے مقابلے میں صرف پانچ فیصد ووٹ ملے اور بے چارے کی ضمانت بھی ضبط ہوگئی۔ صحیح ہے کہ وہ تعلیم یافتہ تھا۔ سیاست کو سمجھتا تھا۔ شاید عوام کی خدمت بھی کرسکتا تھا مگر اس کم بخت نے غلطی یہ کی کہ اپنا نشان 'ہما' منتخب کرلیا اور آپ جانتے ہیں 'کاٹھ کا الو' کے مقابلے میں 'ہما' کو کون پوچھتا ہے۔'' (بال و پر، ص50)

اسی طرح آزادی کی قسم، نیا شکنجہ، وزیر ٹیلس، جانشیں، گرفتاری، پیغام، چوپٹ راجہ، پریس کانفرنس وغیرہ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں جن میں حکومت کی نااہلی، مکاری، کوتاہی اس کی کمزوری کی طرف بہ طورِ خاص اشارے کیے گئے ہیں۔ کپور کے مضمون 'آزادی کی قسم کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں کپور نے ناعاقبت اندیشی اور حاکمانہ سوچ رکھنے والے

اردو طنز و مزاح کی روایت کو جن ادیبوں نے وقار عطا کیا اور اس کے فروغ میں خصوصی دلچسپی لی ان میں کنھیا لال کپور کا نام بے حد اہم ھے۔ واقعه یه ھے که اردو نثری ادب کو انھوں نے اپنی شگفته تحریروں سے مالا مال کیا۔ وہ ان مزاح نگاروں میں سے تھے جن کے ھنسنے ھنسانے کا بھی ایك نقطۂ نظر ھوتا ھے۔ ان کے نزدیك طنز ایك قسم کی شگفته تنقید ھے اور طنز نگاری ایك طرح کا مقدس مشغله۔ کنھیا لال کی تخلیقات کے جادو میں انسان خود کو فراموش کردیتا ھے۔ اپنی پریشانیوں اور مجبوریوں کو بھول جاتا ھے۔ ھم ان تحریروں میں صرف ظرافت اور مزاح کے بیل بوٹے نھیں پاتے بلکه اس کے پھلو به پھلو اعلیٰ اور معیاری طنز کے نمونے بھی ملتے ھیں۔

رہنماؤں کو چیلنج کیا گیا ہے۔ گاندھی جی کی تحریک آزادی کے نتیجے میں ملی آزادی سے خاطر خواہ فائدہ ہوا لیکن ان کے اصلاحی اور تعمیری تصور کو عملاً برتنے سے گریز کیا جارہا ہے:

''میں ترنگے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ باپو کے بلیدان کو نہ بھولوں گا۔ لیکن باپو کے بتائے ہوئے اصولوں پر کبھی عمل نہیں کروں گا۔'' (بال و پر، ص147)

اس مضمون کے آخری حصے میں جو جملے تحریر کیے گئے ہیں وہ عہدِ رواں کے سیاست دانوں پہ گہرا طنز ہے:

''آزادی کے دن میں عزم کرتا ہوں کہ میں دیش کو تباہ کر کے دم لوں گا۔ پرماتما مجھے اور توفیق دے کہ میں اپنے عزم کو پورا کروں۔'' (بال و پر، ص151)

اسی طرح کپور کا ایک مضمون 'مس چنبیلی' ہے۔ اس مضمون میں کپور نے اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک ادیب ساری عمر دماغ کھپا کر اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین لکھنے میں گزار دیتا ہے۔ لیکن نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں چند گنے چنے لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یعنی وہ شہرتِ دوام حاصل نہیں کرپاتے۔ ان کی محنت کا معاوضہ بھی انھیں نہیں مل پاتا۔ لیکن جو لوگ گھٹیا مضامین لکھتے ہیں وہ پلک جھپکتے شہرت حاصل کرلیتے ہیں اور بھرپور معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔ چنانچہ جب 'مرزا از بک'، 'مس چنبیلی' سے ملتے ہیں جو فلم ایکٹریس ہے اُس کا حال لکھا 'موحولدار صاحب'، 'پان والا' جیسے لوگ اُس کے گرویدہ ہوگئے۔ اس کے بعد جب ایک ادبی پرچے نے فرمائش کی کہ فانی کی شاعری پر شوپن ہار کا اثر پر لکھیں تو انھوں نے جواب دیا۔ جواب ملاحظہ ہو:

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں صرف فلمی مضامین ہی لکھا کروگا۔ پچاس روپیہ ملتا ہے۔ کھانے کو پان، پینے کو شربت بنفشہ مفت مل جاتا ہے۔ تیز، ہمسائے سمجھتے ہیں کہ ہم واقعی بڑے ادیب ہیں۔''

محسوس کیا جاسکتا ہے کہ کنہیا لال کپور کی تخلیقات میں طنز و مزاح کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ کپور ایک شریف اور حساس فن کار تھے۔ وہ سماج کے درد اور اس کی تکلیف کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم کبھی بچھو کا ڈنک بھی بن جاتا ہے اور کبھی ہمیں گدگدی کا احساس قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے گویا وہ اپنے قلم سے دوطرفہ کام لیتے ہیں، اس لحاظ سے وہ ایک باشعور اور منفرد فنکار ہیں جن کے مرنے کے اتنے عرصے بعد بھی طنز و مزاح اور ظرافت کا جادو اردو نثری ادب میں جاری وساری ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ کپور اردو طنز و مزاح کی تاریخ کا ایک ایسا فن کار ہیں جن کی تخلیقات کی تابناکی وقت گزرنے کے ساتھ ماند نہیں پڑی بلکہ اس کی حلاوت، چاشنی اور ندرت کا رنگ اور معنویت عہد حاضر میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

□

Amirta Panday,Dept. of Urdu, Banaras Hindu University, Varanasi (U.P)

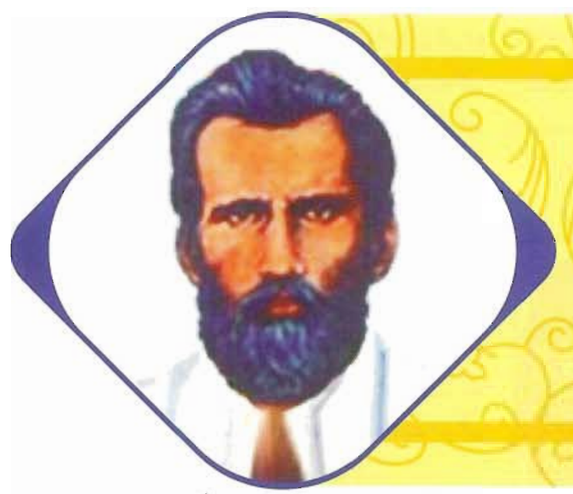

محمد مطیع اللہ نازش

اتکل منی گوپ بندھو داس

بھارت میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی۔ اس میں ملک کے کونے کونے سے ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے حصہ لیا۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، راجندر پرشاد، سبھاش چندر بوس، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر جیسے قومی رہنماؤں کے علاوہ ملک کے ہر حصے سے کئی قابل ذکر رہنماؤں نے تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ اڑیسہ سے مدھوسودن داس اور مدھوسودن راؤ کے علاوہ گوپ بندھو داس بھی ایک اہم مجاہد آزادی تھے۔

گوپ بندھو داس نہ صرف ایک مخلص، محنتی اور سادگی پسند انسان تھے بلکہ اڑیا زبان کے اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے۔ تحریک آزادی میں وہ اڑیسہ کی طرف سے ایک سپہ سالار اور سیناپتی تھے۔ وہ بے لوث قومی خدمت گار تھے۔ ستیہ بادی اسکول کے بانی اور روزنامہ سماج کے بھی بانی تھے۔ وہ ایک نہایت بااخلاق، علم دوست اور ارادے کے پکے انسان تھے۔ ان کی قربانی، پوری زندگی کے حالات اور کارنامے اڑیسہ کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان کی زندگی بہت ہی مختصر یعنی کل پچاس برس نو مہینے تھی۔ ان کی زندگی کا 30 سال تعلیم حاصل کرنے میں گزرا اور 20 سال دیش کی خدمت میں گزار دیے۔ اسی لیے اڑیسہ کا ہر باشندہ بلا امتیاز مذہب و ملت انھیں اتکل منی یعنی (اڑیسہ کا گوہر) کے لقب سے یاد کرتا ہے۔

گوپ بندھو داس کی پیدائش 9 اکتوبر 1877 کو پوری ضلع کے سوآنڈو گاؤں میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام پنڈت شری دیئی تاری داس اور والدہ کا سورنو دیئی تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں سے ہی شروع ہوئی۔ وہ بہت ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ مڈل اسکول امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کی وجہ سے انھیں وظیفہ بھی ملا۔ گیارہویں پوری ضلع اسکول سے پاس کیا۔ 1904 کو راونشا کالج کٹک سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1906 کو کلکتہ کالج سے قانون کی ڈگری بی ایل حاصل کی۔ گاؤں کی روایت کے مطابق گوپ بندھو داس کی شادی موتی دیوی سے طالب علمی کے زمانے میں ہی ہوگئی تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی کا نام سارنگی دیوی اور چھوٹی کا نام کیتکی دیوی تھا۔ بیوی کا انتقال ان کی وکالت کی پڑھائی کے دوران ہی ہوگیا۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد پورے

اڑیسہ کا دورہ کر کے انگریزوں کے خلاف گاندھی جی کی سودیسی تحریک کو پروان چڑھایا۔

1905 میں بنگال تقسیم ہونے کے بعد گوپ بندھو داس نے آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اڑیسہ سے باہر بھی انھیں کافی شہرت ملی۔

1906 کو ضلع جاجپور میں زبردست سیلاب آیا تھا۔ برہمنی اور کھرسواں ندی کے آس پاس کے علاقوں میں سیلاب زدہ، مصیبت زدہ، بے سروسامان لوگوں کو بہم امداد پہنچائی۔ 1908 کو انھوں نے پوری میں 'اتکل سمیلن' کی بنیاد ڈالی اور ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اسی سال وہ نیلی گری اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور چھ ماہ تک تدریسی خدمت انجام دی۔

اڑیسہ کی جہالت اور غربت سے وہ رنجیدہ رہتے تھے۔ اسے دور کرنے کے لیے وہ تعلیم ہی کو واحد ذریعہ تسلیم کرتے تھے۔ اسی خیال سے انھوں نے 12 اگست 1909 کو پوری ضلع کے ساکھی گوپال میں ستیہ بادی ایم ای اسکول کی بنیاد ڈالی۔ 1912 میں اس اسکول کو ہائی اسکول کا درجہ حاصل ہوگیا۔

1911 میں گوپ بندھو داس نے باری پدا، میور بھنج مہاراجا کے وکیل کی حیثیت سے ان کے مقدمات کی پیروی کرتے رہے۔

1917 کو گوپ بندھو داس بہار، اڑیسہ اسمبلی میں چار سال کے لیے ممبر نامزد کیے گئے۔ بڑے لگن اور خلوص کے ساتھ کام کرتے رہے اور اڑیسہ کی ترقی کے لیے بہترین کارنامہ انجام دیا۔ 1917 میں گوپ بندھو داس کو لالہ لاجپت رائے کے قائم کیے ہوئے لوک سیوا منڈل کے صدر کی حیثیت سے اڑیسہ کے لیے نامزد کیا گیا۔ چونکہ لالہ لاجپت رائے ان کی قابلیت، وطن پرستی، اور بے مثال قومی خدمات سے بے حد متاثر تھے۔ گوپ بندھو داس نے بھی لوک سیوا منڈل کے صدر کی حیثیت سے ان گنت کارنامے انجام دیے۔ یاں تک کہ انھوں نے لوک سیوا منڈل کے نام سے لوگوں کی بھلائی کے لیے اپنی ساری جائیداد وقف کردی جس کی مثال بخشی بازار کٹک میں روزنامہ 'سماج' کا دفتر اور 'گوپ بندھو بھون' آج بھی موجود ہے۔

وہ بخوبی یہ جانتے تھے کہ اخبار کے ذریعے عوام و

خواص بلکہ ہر طبقے کے لوگوں تک اپنی بات، دیش بدیش کی اہم خبریں بآسانی پہنچائی جاسکتی ہیں۔ اس لیے انھوں نے 1918 میں کٹک میں ستیہ بادی پریس قائم کیا۔

4 اکتوبر 1919 کو ستیہ بادی پریس کٹک سے گوپ بندھو داس نے روزنامہ 'سماج' شائع کیا۔ 'سماج' کے ذریعے اڑیا زبان و ادب اور اڑیا تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا جو باشندگانِ اڑیسہ کی شناخت اور ترجمان ہے۔ آئے دن 'سماج' میں تحریک آزادی کے جوشیلے مضامین لکھتے رہے۔ اڑیسہ میں آزادی کی تحریک کو پروان چڑھانے میں 'سماج' کا اہم رول ہے اور یہ پہلا روزنامہ ہے۔ یہ اخبار گاؤں گاؤں تک میں اس قدر مشہور ہو چکا ہے یہ لوگ ہر اخبار کو 'سماج' کہنے لگے ہیں۔ اسی سال وہ اتکل سمیلن کے جلسۂ عام میں صدر چنے گئے۔ اسی سال کے اواخر میں شہر پوری میں انکل سمیلن کے پنج سالہ اجلاسِ عام میں انھوں نے اڑیسہ کے لوگوں کی زبوں حالی پر، پرجوش تقریر کی، اور سارے شرکائے اجلاس کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ اس اجلاس کا مقصد اڑیا سماج اور اڑیسہ کے لوگوں کو گاندھی جی کی تحریک آزادی کے لیے متحد کرنا، اڑیا لوگوں کے مفاد کا تحفظ وغیرہ تھا، جس میں انھیں بڑی حد تک کامیابی ملی۔

1920 کے چکر دھرپور کے جلسۂ عام میں انھوں نے اڑیسہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی اور ریاست میں ملانے کی بجائے پہلی بار ایک آزاد ریاست بنانے کی مانگ کی۔ اسی سال گوپ بندھو داس پوری ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر چنے گئے اور اگلے آٹھ سالوں تک بلکہ زندگی کا آخری سانس لینے تک وہ کانگریس کے لیے کام کرتے رہے۔ چنانچہ ستمبر 1920 کو کلکتہ میں منعقد کانگریس کے اجلاسِ عام میں شرکت کے بعد تحریک آزادی کو اڑیسہ میں زوردار طریقے سے چلایا۔

27 ستمبر 1921 میں انھوں نے کلکتہ میں کپڑا کے مل مزدوروں کو اکٹھا کر کے خطاب کیا، ''کپاس اور سوت کا کارخانہ دونوں ہمارے دیس کا۔ ہمارا تیار کیا ہوا کپڑا انگلینڈ نہیں بھیجا جائے گا'' چونکہ اڑیسہ کے بہت سارے لوگ اس مل میں کام کرتے تھے اور یہ تحریک اتنی بڑی شکل اختیار کرگئی کہ انگریزوں کو آخرکار ماننا پڑا، اور یہاں کا تیار کیا ہوا کپڑا انگلینڈ بھیجنا بند کر دیا۔ اس واقعے کے ذریعے اڑیا مزدوروں کی کلکتہ میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ 1921 کے آخر میں گوپ بندھوداس کی دعوت پر مہاتما گاندھی اڑیسہ تشریف لائے۔ کٹک میں کاٹھ جوڑی ندی کے کنارے تحریکِ آزادی کا ایک بڑا تاریخی جلسہ منعقد ہوا۔

> گوپ بندھو داس ایک عظیم مجاھد آزادی تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی عوام کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ اسی لیے انھیں 'اتکل منی' یعنی 'اڑیسہ کا گوھر' کا لقب دیا گیا۔ ان کا نام تاریخ اور ھمارے ذھن میں ھمیشہ زندہ رھے گا اور ان کے خدمات اور جدوجھد کو رھتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

گاندھی جی نے گوپ بندھوداس کے ہمراہ ستیہ بادی اسکول کا بھی معائنہ کیا۔ اگلے دو سالوں تک وہ گاندھی جی کے دوش بدوش ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے رہے۔ ملک کے کئی جگہوں پر انگریز سرکار نے گوپ بندھو داس کے پروگراموں پر دفعہ 144 نافذ کر دیا۔ 28 اکتوبر 1921 کو انھیں خردہ جیل میں قید کیا گیا لیکن 21 نومبر 1921 کو وہ باعزت رہا بھی کر دیے گئے۔

21 مئی 1922 کو انھیں اڑیسہ کے ساحلی شہر پوری میں پھر گرفتار کیا گیا، اور 26 جون 1922 کو کٹک میں 6 سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی اور 24 ستمبر 1923 کی آدھی رات کو کٹک سے ہزاری باغ (جھارکھنڈ) کے جیل میں منتقل کیا گیا۔ بعد ازاں انھیں ڈھائی سال میں پھر رہا کر دیا گیا مگر اس مرد مجاہد کے قدموں میں ذرا بھی لڑکھڑاہٹ نہیں آئی، اپنی ہمت نہیں ہاری انگریزوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ جس قدر ظالموں نے سختیاں کیں اسی قدر گوپ بندھوداس کے حوصلے بلند اور ارادے مضبوط ہوتے گئے۔

1925 میں پوری ضلع میں اور 1927 میں کیندراپاڑہ، جاج پور، بھدرک اور بالیسر اضلاع میں زبردست سیلاب آیا جس نے بھاری جانی، مالی تباہی مچائی۔ گوپ بندھوداس نے جی جان سے سیلاب سے متاثر لوگوں کی خدمت کی اور انھیں ہر ممکن مدد پہنچائی۔ 1927 میں کٹک کے ٹاون ہال میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں سیلاب زدگان کی امداد کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا ناظم گوپ بندھوداس کو مقرر کیا گیا۔ پھر ضلعی سطح پر بھی تحفظ سیلاب کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ گوپ بندھوداس کی درخواست پر گاندھی جی نے سیلاب کے روک تھام کے ماہر وشویشوریا (M Vishwesharayya) کو اڑیسہ کے دورے پر بھیجا، جن کی رہنمائی میں سیلاب سے تحظ کے لیے ایک اسکیم بنائی گئی۔ اس اسکیم کے تحت سیلاب سے حفاظت کی خاطر خواہ اقدامات کیے گئے۔

اپریل 1928 کو وہ لوک سیوا منڈل کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لے گئے۔ وہاں انھیں ٹائی فائیڈ ہوگیا اور وہ کٹک لوٹ آئے اور ستیہ بادی پریس کٹک میں 17 جولائی 1928 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

گوپ بندھو داس ایک عظیم مجاہد آزادی تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی عوام کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ اسی لیے انھیں 'اتکل منی' یعنی 'اڑیسہ کا گوہر' کا لقب دیا گیا۔ ان کا نام تاریخ اور ہمارے ذہن میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور ان کے خدمات اور جدوجہد کو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

ہر سال ان کے یوم پیدائش کے موقعے پر نہ صرف گوپ بندھو بھون کٹک میں بلکہ اڑیسہ کے مختلف مقامات پر بڑے اہتمام سے سرکاری اور عوامی طور پر جلسے منعقد کیے جاتے ہیں، اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

■

Maulana Mohammad Mutiullah Nazish,
D/203, Sector-6, CDA Cuttack-14 (Orissa)
Mob.: 9861437715

شاد عارفی: ایک منفرد فنکار

مظفر حنفی

اردو غزل کی صدیوں پر محیط، بے کراں روایت میں یہ سعادت گنتی کے تین چار شاعروں کو ہی نصیب ہوئی ہے کہ ان کا ہر شعر اپنے لہجے کی بنا پر دور سے پہچانا جاتا ہے۔ شاد عارفی نے غلط نہیں کہا۔

اور پھر کہتے ہیں کس کو ندرتِ طرزِ ادا
میرے شعروں میں مری آواز پہچانی گئی

عام طور پر شاد عارفی کو ایک عظیم طنز نگار غزل گو کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن وہ عشقیہ غزل کے بھی اتنے ہی اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے منظریہ، طنزیہ اور رومانی نظمیں اتنی اچھی اور ایسی کثیر تعداد میں کہی ہیں کہ تا حال تنقید یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ شاد کی غزل اور نظم میں سے کس کا پلہ بھاری ہے۔ نثر میں بھی شاد عارفی نے تنقیدی مضامین اور مکتوبات کی شکل میں قابلِ لحاظ ادبی سرمائے کا اضافہ کیا ہے۔

شاد عارفی رامپور میں پیدا ہوئے وہیں عمر بسر کی اور وہیں وفات پائی۔ ان کا سالِ پیدائش 1900 ہے اور سنہ وفات 1964 شاعری وہ نوعمری میں ہی کرنے لگے تھے، ان کی چھکتی کاوشیں کم و بیش پچاس برسوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس دوران ان کی شاعری میں کئی موڑ آئے، ایک جگہ خود کہا ہے:

وہ رنگیں نوائی، یہ شعلہ بیانی
کئی موڑ آئے مری شاعری میں

بڑی بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جسے شاد عارفی رنگیں نوائی سے تعبیر کرتے ہیں، انھوں نے لب و رخسار والی روایتی شاعری نہیں کی بلکہ اپنے سچے اور پرجوش واقعاتِ عشق کو ایسے نادر لہجے میں اس ندرتِ ادا کے ساتھ پیش کیا کہ ان کی عشقیہ غزل کا ذائقہ اردو کی عام عاشقانہ اور روایتی غزل سے منفرد ہو گیا۔ بقول شاد:

دوسروں کے واقعاتِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

انھوں نے دو بار محبت کی اور جواب میں انھیں دوسری طرف سے بھی محبت ملی۔ ان کی عشقیہ غزلوں میں اس دو طرفہ محبت کے جیتے جاگتے، سچے اور تابناک مناظر دیکھے جا سکتے ہیں:

کام کی شے ہیں کروٹن کے یہ گملے اے شاد
وہ نہ دیکھے مجھے، میں اس کا نظارہ کرلوں

لائے ہیں تشریف تکیوں پر دُلائی ڈال کر
حسن اور اس درجہ بے خوف وخطر میرے لیے

چھپائی ہیں جس نے میری آنکھیں میں انگلیاں اس کی جانتا ہوں
مگر غلط نام لے کے دانستہ لطف اندوز ہو رہا ہوں

اس سے جب پوچھا گیا چھپ چھپ کے رونے کا سبب
دردِ دل کا کام اس نے دردِ سر سے لے لیا

دل نوازی جو بھرے گھر میں نہیں بن پڑتی
رُخِ محبوب پہ گیسو ہی بکھر پڑتا ہے

آج ہم نئی غزل کے عہدِ شباب میں غالباً اس نئے پن، نادرہ کاری اور غیر روایتی آہنگ کو اتنا محسوس نہ کر سکیں جتنا کہ آج سے نصف صدی پیشتر کے نقادوں نے شاد کو غزلوں میں محسوس کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یگانہ اور فراق سے زیادہ شاد عارفی کو نئی غزل کے بنیاد کاروں میں شمار کیا جاتا ہے اس دور میں شاد کی عشقیہ نظمیں 'سماج'، 'ایک تصویر'، فسانۂ ناتمام'، 'بسنت'، 'پھول کی پتی سے'، 'وفا سے وعدہ'، 'وعدہ اشنان' وغیرہ بھی بے حد مقبول ہوئی تھیں۔ شاد عارفی کی رنگیں نوائی کے بارے میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے سچ کہا ہے:

''شاد کی عشقیہ شاعری کا پلڑا زمین کی طرف جھکتا ہے۔ غالباً ایسی ہندوستانی فضا اور گھریلو محبت، حسرت کی غزل اور فراق کی رباعی کے علاوہ اُردو شاعری میں صرف شاد کی عشقیہ نظم و غزل ہی پیش کر سکی ہے۔ ان کی محبت کے یہ گیت اتنے مقدس اور گھریلو ہیں کہ حسرت موہانی کے علاوہ کوئی اور شاعر عشق کی اس سادگی اور پاکیزگی کی منزل پر نظر آتا۔''

ہمارے عظیم اور قابلِ ذکر شاعروں میں میر، فانی اور یگانہ کی تنگ دستی اور پریشان حالی کے تذکرے عام ہیں لیکن شاد عارفی کے حالاتِ زندگی ان سب سے زیادہ تلخ ہیں۔ کچھ ابتدائی برسوں کو چھوڑ کر انھوں نے تمام عمر انتہائی مفلسی، بیروزگاری اور پریشانی میں بسر کی۔ چالیس برس کی عمر میں شادی کی تو اہلیہ ڈیڑھ برس میں ہی انتقال کر گئیں۔ اعزا و اقارب نے انھیں فریب دیے اور صحت بھی جواب دے گئی۔ طرہ یہ کہ طبعاً بے حد غیور اور خود دار تھے اس لیے کسی کی مدد قبول کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ان سب باتوں کے زیر اثر ان کا مزاج شعر طنز کی طرف مائل ہو گیا اور انھوں نے زمانے کی ناانصافیوں اور خام کاریوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے اپنے قلم کو تلوار بنا لیا:

میں دنیا پر طنز کروں گا
دنیا میرے کیوں در پے ہو

اور:

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

علامہ نیاز فتح پوری نے ان کی بابت لکھا ہے:

''شاد عارفی زمانۂ حال کے شاعروں میں ایک خاص رنگ کے نقاد و طنز نگار ہیں جن کی غزلیں اور نظمیں جارحانہ انتقاد سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں کہیں کہیں مزاحی رنگ بھی آجاتا ہے۔ اس رنگ کی شاعری میں ایک خاص لب و لہجہ کی ضرورت ہوتی ہے جس میں قطعیت بہت زیادہ ہو۔ اس کوشش میں بہت سے حضرات آرٹ سے ہٹ کر خشک واعظ بن کر رہ جاتے ہیں لیکن شاد عارفی شاعرانہ زہر قند یا تبسم زیرلب کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔''

حق تو یہ ہے کہ اردو شاعری میں خالص طنز کی روایت، جو انگریزی کے زیر اثر اور مزاح کے غلبے کی وجہ سے ادب میں دوسرے درجے کی چیز بن گئی تھی، شاد عارفی کی تخلیقات میں دوبارہ زندہ ہو گئیں اور اس رنگ میں شاد عارفی نے وہ خاص طرز اختیار کی جس کے موجد بھی وہی تھے اور خاتم بھی وہی ٹھہرے، ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

آشیاں پھول نہیں تھے کہ خزاں لے اُڑتی
آپ اس بحث میں جانے کی اجازت دیں گے

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

دل میں لہو کہاں تھا کہ اک تیر آ لگا
فاقے سے تھا غریب کہ مہمان آ گیا

اسے جس حال میں سجدہ کیا ہے
اسے اللہ بہتر جانتا ہے

بلاشبہ شاد عارفی نے تغزل کے معنی تبدیل کر دیے، غزل میں ایسی کاٹ پیدا کر دی، اس میں وہ معنویت اور مقصدیت شامل کی جس نے اُسے زمانۂ حال کی چیز بنا دیا اور اپنے معاشرے کی تمام خامیوں پر نشتر زنی کرنا سکھا دیا:

نقدِ ماحول کو فن ہے میرا
ہر طرف روئے سخن ہے میرا

بقول حفیظ جالندھری:

''شاد عارفی اپنے اردگرد کے سیاسی اور ادبی دور سے مکمل باخبر ہی نہیں بلکہ مجاہدانہ اور سخت گیرانہ طریق پر اس پرآشوبی کے نقاد صادق ہیں، شاد نے اپنے دور کے حالات سے جو احساسات اخذ کیے ان کا اظہار محبت اور واضح طور پر ندرتِ ادا کے ساتھ کیا ہے۔''

شاد نے طویل و مختصر سوطنزیہ نظمیں بھی کہیں ہیں جن میں اپنے عہد کی برائیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سماج کی دکھتی رگوں پر نشتر چلائے گئے ہیں یہ نظمیں ایسی نئی نئی اور دلچسپ ہیئتوں میں ہیں کہ شاد عارفی کی فنکاری پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ان کی نظم نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی رقم طراز ہیں:

''شاد عارفی نے اپنی نظموں میں بیانیہ پیرایہ اختیار کرنے کے بجائے ڈرامائی مکالماتی اور تمثیلی انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے یہ کمال کیا ہے کہ ایک ہی مصرع کے اندر دو دو اور تین تین کرداروں کے مکالمے ادا کرنے کی کوشش کی ہے ... ٹی ایس ایلیٹ نے شاعری کی تین آوازوں کا ذکر کیا ہے۔ ان تینوں آوازوں کا ایک ہی نظم میں اجتماع بہت ہی مشکل کام ہے۔ شاد نے اردو نظم میں یہ کام بھی کر دکھایا ہے۔''

ان کی نظموں میں 'شوفر'، 'پران قلعہ'، 'ان اونچے اونچے محلوں میں'، 'رنگیلے راجا کی موت'، 'نمائش'، 'ان سے ملیے'، 'ٹکڑ گدے' اور 'ابھی جبلپور جل رہا ہے' وغیرہ اُردو نظم کے سخت سے سخت انتخاب میں جگہ پانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے:

''مجھے ذاتی طور پر شاد عارفی کی شاعری نے متاثر کیا۔ وہ جو تھے وہی ان کی شاعری ہے، زندگی نے انھیں جو دیا وہ ان کے کلام میں کبھی غصہ بن کر، کبھی طنز اور زہرخند بن کر اور کبھی دکھے دل کی پکار بن کر محفوظ ہوگیا۔

اپنی عشقیہ اور طنزیہ غزل نیز منظریہ، عاشقانہ اور طنزیہ نظموں میں شاد عارفی نے جس مجتہدانہ شان کے ساتھ زبان کا تخلیقی استعمال کیا ہے جس طرح عام بول چال کے غریب اور ٹاٹ باہر الفاظ کو اپنے جادو نگار قلم کے لمس سے ادبی شان عطا کر دی ہے اس کی مثال اردو شاعری میں نایاب ہے اور یہ صفت انھیں سچے معنوں میں ایک عوامی شاعر بناتی ہے، پروفیسر آل احمد سرور نے غلط نہیں کہا:

''جو لوگ شاعری کی زبان اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں، انھیں شاد کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاد نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اجاگر کیا اور جس طرح بقول ایذرا پاؤنڈ، حقیقی نفسیات کو زبان دی ہے اُسے جدید اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔''

کچھ اپنے کھرے مزاج کی وجہ سے اور کچھ اپنی شاعری کے بالکل ہی نئے رنگ کی وجہ سے اردو تنقید نے ان کی زندگی میں اس عظیم فنکار کو وہ اہمیت نہ دی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے لیکن ان کی وفات کے تین سال کے اندر ہی ایک مجموعہ مضامین 'ایک تھا شاعر' منظر عام پر آیا جس میں ہر اہم تخلیق کار اور ہر مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے نقادوں نے شاد عارفی پر مضامین لکھ کر ان کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کیا، اس کے چند برس بعد ہی ان کی شخصیت اور فن پر ایک تحقیقی مقالہ بھی شائع ہوگیا۔ اسی طرح ان کی حیات میں انجمن ترقی اردو کے ایک مختصر سے انتخاب کے علاوہ کوئی ڈھنگ کا شعری مجموعہ تک نہیں شائع ہوسکا تھا لیکن انتقال کے بعد مرحوم کا تمام کلام 'شاد عارفی کی غزلیں'، 'سفینہ چاہیے'، 'اندھیر نگری'، 'شوخیِ تحریر'، 'دکھتی رگیں'، 'کلیات شاد عارفی' میں محفوظ ہوگیا ہے۔ ان کے مکاتیب اور مضامین 'ایک مختلف اسلوب نگارش کے حامل ہیں اور اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔

(شاد عارفی ایک مطالعہ-مطبوعہ 1992ء)

□

Muzaffar Hanfi, D-40, Batla House,
Okhla, New Delhi - 110025

شاد عارفی: سوانحی اشاریہ

نام: احمد علی خاں، **عرفیت:** لڈن خاں

تخلص: شاد، والد کی رعایت سے عارفی لکھتے تھے

والد: عارف اللہ خاں، **والدہ:** خورشید بیگم

وطن: رامپور (اسٹیٹ)، **جائے پیدائش:** لوہارو

سالِ ولادت: 1900

ذریعۂ معاش: مختلف فیکٹریوں کی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں، ایڈیٹری، ٹیوشن، پروف ریڈر، لائبریرین صولت لائبریری، بجٹ اکاؤنٹنٹ، نائب ناظم تحصیل سوار اور شاگردوں کی اصلاح کا معاوضہ وغیرہ

تعلیم: دسیوں جماعت،

تلمذ: شفق رام پوری، جلیل مانکپوری،

شادی: 1939، **اہلیہ:** پری بیگم، **اولاد:** کوئی نہیں

پہلا شعر: نو برس کی عمر میں، **پہلی غزل:** 1917

آخری غزل: 'آج کل' دہلی، بابت مارچ 1964 میں شائع ہوئی اس کے تین چار شعر 13 اکتوبر 1963 کو کہے گئے۔ اس کا مطلع ہے:

فن پر قدرت رکھنے والا جب محوِ شعریت ہوگا
جو رحجان تاثر دے گا مطلع اس کی بابت ہوگا

پہلی نظم: اضطرار (مطبوعہ 'ہمایوں' لاہور، ستمبر 1930)

اولین مطبوعہ نظم: ہلالِ عید (خاتونِ مشرق، میرٹھ 30 مارچ 1930)

آخری نظم: وصی اقبال کا سہرا (نومبر 1963)

پہلا مجموعۂ کلام: 'سماج' کے نام سے 1946 میں رشید احمد خاں مخمور نے چھاپا لیکن باقاعدہ اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

دیگر مطبوعات: انتخاب شاد عارفی (انجمن ترقی اردو 1956) شاد (عابد رضا بیدار کا مرتب کردہ کتابچہ 1962) سفینہ چاہیے (مرتبہ سلطان اشرف 1965) نثر و غزل دستہ (مرتبہ مظفر حنفی: 1967) اندھیر نگری (نیا ادارہ، لاہور 1967) شوخیِ تحریر (مرتبہ مظفر حنفی 1971) شاد عارفی کی غزلیں (مرتبہ مظفر حنفی 1974)، کلیات شاد عارفی (مرتبہ مظفر حنفی: 1975) دُکھتی رگیں (مرتبہ سلطان اشرف 1982)

وفات: 8 فروری 1964

تدفین: احاطہ مزار شاہ ولی اللہ صاحب، رامپور

کتابیات

(1) ایک تھا شاعر: مرتب مظفر حنفی (1967)

(2) شاد عارفی: شخصیت اور فن: مظفر حنفی (1977 اس تحقیقی مقالے پر مصنف کو 1974 میں بھوپال یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی)

(3) شاد عارفی: حیات اور شاعری: دور آفریدی (1987)

(4) شاد عارفی: ایک مطالعہ: مظفر حنفی

(5) مندرجہ ذیل کتابوں میں شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر مستقل مضامین شامل ہیں:

• ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی • مضامین نو: خلیل الرحمٰن اعظمی • شخصیتیں: دور آفریدی • آتی جاتی لہریں: مظہر امام • نقدریزے: مظفر حنفی • زندہ کہتے: عروج زیدی • ادب کی تلاش: بلراج کومل • شاخِ آگہی: حرمت الاکرام • مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے: محبوب راہی • اس نظم میں: میراجی

(6) روزنامہ ناظم رامپور کے ادبی ایڈیشن ہفت روزہ اطہر رام پور، رام پور رپورٹر 1978 اور 1979 کی فائلوں میں شاد عارفی سے متعلق طویل مباحثے شائع ہوئے۔

(شاد عارفی ایک مطالعہ-مطبوعہ 1992ء)

شمع افروز زیدی

شاد عارفی

انتخاب کلام شاد عارفی

نظمیں

رسمی قید خانے

وہ بھولی لڑکیاں جو بند رہتی ہیں مکانوں میں
'مکانوں سے' یہ مطلب ہے کہ رسمی قید خانوں میں
'صدائے حکم پردہ' گونجتی رہتی ہے کانوں میں
انھیں 'ذہنیت آزاد' کے معنیٰ نہ سوجھیں گے
جسے وہ خود نہ بوجھیں ان کے بچے خاک بوجھیں گے

انھیں تعلیم دی جائے امورِ خانہ داری تک
گھریلو خانہ جنگی سے رواجِ ہرزہ کاری تک
نظر کی وسعتیں محدود ہوں گوٹے کناری تک
اگر ماحول کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے خو بیشک
تو ان کی گود کے پھولوں میں آزادی کی بو بیشک

نظامِ اقتصادیات سے یہ بے تعلق ہیں
امورِ حریت آیات سے یہ بے تعلق ہیں
تمیزِ نبضِ احساسات سے یہ بے تعلق ہیں
قیامت ہے کہ 'تہذیبِ وطن' حصہ نہیں ان کا
سیاست کی کتابوں میں کوئی قصہ نہیں ان کا

گِنی جاتی ہی تنقیضِ تمدن ان کی تدبیریں
انھیں زیبا نہیں منھ کھول کر جلسوں میں تقریریں
تو کیا دلچسپ ایوانوں کی رونق ہیں یہ 'تصویریں'
نہیں یہ مردِ خود اندیش کی مطلب پرستی ہے
نسائیت عروجِ قوم کے حق میں ترستی ہے

انھیں اسلام نے جو مرتبہ بخشا وہ ظاہر ہے
عطا کی جو 'مساواتِ چمن آرا' وہ ظاہر ہے
معین تھا جو ان کے واسطے پردا وہ ظاہر ہے
'گماں' نے 'اعتمادِ پاک دامانی' بدل ڈالا
'شریکِ زندگی' کے 'حسنِ معنیٰ' کو کچل ڈالا

انھیں پابند 'خِشت و گِل' بنانے سے نتیجہ کیا؟
حفاظت کے لیے محمل سجانے سے نتیجہ کیا؟
فروغِ جوہرِ کامل چھپانے سے نتیجہ کیا؟
دکھائے گا انھیں رستہ 'چراغِ نور ایمانی'
اگر ہم سب انھیں کو سونپ دیں ان کی نگہ بانی

ہلالِ علم سے ان کی جبینیں جگمگا دیں ہم
تفکر کے پروں میں شہپرِ جودت بڑھا دیں ہم
دلوں سے تیرگی آنکھوں سے کم بینی مٹا دیں ہم
جہیزوں میں انھیں ملبوس رنگیں دیں، نہ گہنا دیں
مگر 'آزادیٔ برحق' کے 'چندرہار' پہنا دیں

وہ مائیں جن کے بچے قوم کی زینت کہاتے ہیں
وہ بہنیں جن کے بھائی دیش کی قسمت جگاتے ہیں
'حقوقِ واقعی' سے ہم جنھیں محروم پاتے ہیں
نہ روکیں ان کو پیکارِ عمل میں ساتھ آنے سے
نہ ٹوکیں شوق میں آزادیوں کے گیت گانے سے

اندھیر نگری

شوہر

کھٹ... کھٹ... کون؟ صبیحہ! کیسے؟ یوں ہی کوئی کام نہیں
پچھلی رات- بھیانک گیرج- کیا کچھ ہوا انجام -نہیں
میرا ذمہ - میں بھگتوں گی- تم پر کچھ الزام نہیں

ہم ہیں اس اخلاق کے پیرو، ہم ہیں اس تہذیب کے لوگ
جس میں عفت 'اک مفروضہ' عصمت جس میں 'ذہنی روگ'
جذبوں پر پہرے بٹھلاتا کیا 'سودائے خام' نہیں؟

دو بچوں کے باپ- تو کیا ہے؟ 'دل کا ہو انسان جوان'
تم بھی ایسے بن جاؤ نا جیسے 'منجھلے بھائی جان':
سالی اور سلج پر لٹو، بیوی سے 'حمام نہیں'

ان سے... وہ.. تہذیب میں اونچی، چھوٹے بھائی سے 'وقتی چاہ'
شوہر آئے نہ آئے لیکن دیور کی 'تکتی میں-راہ'
خواہش کی تکمیل بھی جاری، 'شادی بھی ناکام نہیں'

نوکر اور نمک اور مشقت ان تاویلوں سے باز آؤ
مردوں کی اس بیجا نیکی پر مجھ کو آتا ہے تاؤ
عورت کے ہونٹوں پر ٹھپہ اب مقبول عام نہیں

ہفتہ بھر میں اک دن 'ایسی لغزش' کوئی عیب کہاں
ظاہر ہے پاپا، ممی کو حاصل 'علمِ غیب' کہاں
کالی راتوں کی باتوں سے واقف 'صبح و شام' نہیں

جاتی ہوں، گھبراتے کیوں ہو؟ کیا اندھیاری 'گھور نہیں'
دو دل راضی کے بارے میں قاضی کا کچھ زور نہیں
تو- یہ دس کا نوٹ- تمھاری 'اجرت ہے، انعام نہیں'

غزلیں

اگر ہم آپ کو ظالم کہیں انکار مت کیجے
مثالیں سیکڑوں مل جائیں گی اصرار مت کیجے

جو ہموارِ وفا ہیں ان کو ناہموار مت کیجے
غلط رستے سے منزل کی طلب سرکار مت کیجے

مبادا اختیاراتِ جہاں بانی پہ حرف آئے
جو کرنا چاہتے ہیں کیجے اظہار مت کیجے

کہیں ایسا نہ ہو یہ بات جا پہنچے بتنگڑ تک
جو جتنا مانگتی ہے دیجیے تکرار مت کیجے

شعوروں کے لیے شعلہ ہیں طنزِ ناوفاداری
وفاداروں کی غیرت پر یہ اوچھا وار مت کیجے

ارادے بھانپ کر اقدام کی تہمت بجا لیکن
دماغوں کو بغاوت کے لیے تیار مت کیجے

بیانِ ماجرا پر بھول کر دستور کی شرطیں
ہمیں دار و رسن کے عہد سے دوچار مت کیجے

غلط سنجانِ فنِ شعر سے اے شاد پھر کہہ دوں
مرے 'شیروں' کو پتھر مار کر بیدار مت کیجے

جب گھٹا اٹھتی ہے برق جب چمکتی ہے
آشیاں کے تنکوں سے بے کسی ٹپکتی ہے

ضبط ناوکِ غم سے بات بن تو سکتی ہے
آدمی کی انگلی میں پھانس بھی کھٹکتی ہے

کیا کسی نوازش کی پول کھول دی میں نے
آنکھ جھینپتی کیوں ہے کیوں زباں بہکتی ہے

ہم قفس نصیبوں کا گلستاں سے کیا رشتہ
جس طرح کوئی ڈالی ٹوٹ کر لٹکتی ہے

ساتھیو! تھکے ماندہ ہارتے ہو ہمت کیوں
دور سے کوئی منزل دن میں کب چمکتی ہے

کام عزم و ہمت سے انصرام پاتے ہیں
کاہلی کی مت سنیے، کاہلی تو بکتی ہے

کیوں مزاجِ والا کو روشنی نہیں بھاتی
کیوں حضورِ والا کو آگہی کھٹکتی ہے

جس کو نکہتِ گل سے واسطہ نہیں ہوتا
خوش لباس پھولوں میں وہ نظر بہکتی ہے

شاد ان اندھیروں میں کہکشاں کی منزل سے
رات کے گزرنے کی صبح راہ تکتی ہے

سو گریباں پھاڑ ڈالے دو گریباں سی دیے
یہ نوازش کم نہیں لیکن تناسب سیکھیے

مسکرا کر آپ نے جتنے غلط وعدے کیے
ذہن میں جگنو سے چمکے چند لمحوں کے لیے

شہہ سوارانِ سیاست سے یہ پوچھا چاہیے
زین لادے پھر رہے ہیں آپ گھوڑے کیا کیے

اپنے سر الزام کیوں لیتے ہو پھونکیں مار کر
آپ ہی بجھ جائیں گے بے نور مٹی کے دیے

یوں نظر آتے ہیں مستقبل میں ٹوٹے آسرے
جیسے کجلاتے ستارے، جیسے منزل کے دیے

مانگ لیں ہم سے ہماری بے کسی کا ایک دن
عیش کی راتیں نہیں کٹتی ہیں جن سے بن پیے

ہم سے تنظیمِ وطن میں فرق پڑتا ہے تو پھر
چھوڑ دیجے سب کو، جیلوں میں ہمیں بھر دیجے

تم نے فطرت کو سمجھنے میں بڑی تاخیر کی
تم کو فطر نے سنبھلنے کے بڑے موقعے دیے

دیکھیے نا حال مستقبل سے کھاتا ہے شکست
کل جو تھے 'ظلِ الٰہی' آج ہیں بہروپیے

شاد مجھ سے تجربے کوئی کہاں سے لائے گا
میں نہیں کہتا یہ 'طرزِ فکر' ہے میرے لیے

خود بینی کا حق ہے لیکن ہٹ دھرمی سے کام نہ لے
اے کترا کر جانے والے کوئی دامن تھام نہ لے

کیا کچھ آنکھیں تاڑ رہی تھیں کیا کچھ خطرہ تھا موجود
ورنہ اے نادان پیامی وہ میرا پیغام نہ لے

خواہش کی تعمیل میں الفت کھوتی ہے تکمیل کا لطف
آنکھ ملائے جا ساقی سے ہاتھ بڑھا دے جام نہ لے

بھیگی پلکیں بکھری زلفیں اترا چہرہ چھلکے ہونٹ
ان حالات میں کب تک محفل سوئے ظن سے کام نہ لے

دنیا والے ہمدردی کے معنیٰ لیتے ہیں کچھ اور
مجھ سے ہمدردی جتلا کر اپنے سر الزام نہ لے

اچھا آج بھری محفل میں الفت کی تصدیق سہی
اچھا آج بھری محفل میں وہ جس کا بھی نام نہ لے

نظریں جیسے خالی ساغر جلوے جیسے دور کے پھول
رکھے وہ انداز کہ گھر بھر کج فہمی سے کام نہ لے

بے باکانہ دل چسپی کا ہوتا ہے انجام برا
اپنی صبحِ عمر کے بدلے میرے غم کی شام نہ لے

شاد مگر افشا تھا اس پر میری خالی جیب کا حال
ورنہ یہ ممکن تھا ساقی جام پلا دے دام نہ لے

جنھیں بھی خواہِ موسمِ گل پیامِ سیرِ بہار دیں گے
جلے ہوئے آشیاں انھیں ہر قدم پہ اک اشتہار دیں گے

غریب و بے کس ہر اک ستم پر نہ کیوں دعائیں ہزار دیں گے
اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو آپ گردن نہ مار دیں گے

عمل کو لازم ہے استواری نہ یہ کہ اظہار بے قراری
جو تیز گامی پہ فخر کرتے چلے ہیں ہمت بھی ہار دیں گے

گزر چکا عہدِ بربریت قریب ہے دورِ آدمیت
جو ناپتے ہیں ہماری گردن ہم ان کے احساس اتار دیں گے

چمن کو لو کا لگانے والے ہیں جانے کس خوش گمانیوں میں
جلے اگر سیکڑوں نشیمن تو ایک مشتِ غبار دیں گے

یہ من کے میلے یہ تن کے اُجلے رہے جو ظاہر فریب اب تک
کہاں تک آشوبِ عہدِ نو ان کو روپ دیں گے نکھار دیں گے

جو آپ ایسے یتیم عقلوں کو مان لیں گے چمن کا مالی
تو کیوں نہ از راہِ بے وقوفی گلوں کے طالب کو خار دیں گے

غزل برائے غزل کے حامی پڑھا رہے ہیں یہ شاد ان کو
اگر سنواریں گے آپ گیسو تو نظم عالم سنوار دیں گے

بلبل اگر قفس میں بقیدِ حیات ہے
نیرنگیِ اصولِ سیاست کی بات ہے

وہ بھی ہے اک گروہ جو رہزن کے ساتھ ہے
یہ میرِ کارواں کو جتانے کی بات ہے

کہتی ہے صاف صاف یہ مہندی رچی ہوئی
بربادیِ چمن میں تمھارا بھی ہات ہے

مخدوش ہوچکی رہِ منزل کچھ اس قدر
ترکِ رہِ نجات کے اندر نجات ہے

اس عہد میں کہ سہل نہیں رقصِ جامِ مے
ساغر کا ٹوٹنا بھی پیامِ حیات ہے

لعنت ہے شاطرانِ سیاست کی جہت پر
محسوس کررہے ہیں کہ بازی ہی مات ہے

محسوس ہورہی ہے جو دل کو نمودِ صبح
وہ بادی النظر میں نہ دن ہے نہ رات ہے

اے شاد جن کو فن کا اجارہ نہ مل سکا
کہنے لگے کہ 'صنفِ غزل' واہیات ہے

قطعات

معصیت کو نجات کہنے والے
توہین کو ذاتیات کہنے والے
شاد! آئینۂ حلب کی صورت
ڈرتے نہیں منہ پہ بات کہنے والے

ظلم سے دھاک بٹھانے کا نتیجہ معلوم
کم اساسوں کو ستانے کا نتیجہ معلوم
کیا کہا جائے، جہاں عقل پہ پتھر پڑجائیں
تیل سے آگ بجھانے کا نتیجہ معلوم

رہروِ گم کردہَ منزل کو جیسے خضرِ راہ
وہ مشیت جس کو دلچسپی ہے میری ذات میں
مرحبا! تاریک مستقبل کے ٹوٹے آسرو
دور تک جگنو چمکتے ہیں اندھیری رات میں

شاد! جو چیز فطرتاً عالی ہے
عفتِ حسن کی وہ رکھوالی ہے
جلوے ہیں گرفتِ ماسوا سے باہر
سایہ پھولوں کے رنگ سے خالی ہے

متفرق اشعار

دیکھ کر مجھ کو مسکرا دیں آپ
اس قدر احتیاط کافی ہے

مجھ پہ اس حیا خو کی ہر نظر ادھوری ہے
پھر بھی مدعا کامل، پھر بھی بات پوری

عقاب کی نگاہ سے جھلک رہی ہیں شوخیاں
کسی بھی فن میں ہو مگر کمال بھی تو چاہیے

نقاب کی یہ جنبشیں، حجاب کے یہ زاویے
جو اُس سے چاہتا ہوں میں اسے سمجھ رہا ہوں وہ

کام کی شے ہیں کروٹن کے یہ گملے اے شاد
وہ نہ دیکھے مجھے، میں اس کا نظارا کرلوں

بہ پاسِ احتیاط آرزو یہ بارہا ہوا
نکل گیا فریب سے وہ حال پوچھتا ہوا

خط غلط تقسیم ہوجاتے ہیں اکثر، تم نے بھی
کہہ دیا ہوتا یہ کس کا خط مرے نام آگیا

کیا لکھ رہے ہو میری طرف دیکھ دیکھ کر
میں نے دیا جواب غزل کہہ رہا ہوں میں

لکھ کر میرا نام اے شاد
اس نے بھیجا ہے رومال

جھولی سی ہم مکتب کوئی کوئی سہیلی خالہ زاد
ان کے ہاتھوں خط بھجواتے میں ڈرتا ہوں لیکن وہ

مسکرا دیں گے مرا نام کوئی لے دیکھے
وہ کسی فکر میں بیٹھے ہوں، کسی کام میں ہوں

ابھی انگڑائیاں لی جارہی ہیں
سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں

اُسے نسیم چمن کہہ رہا ہوں میں لیکن
کہیں نسیمِ چمن مڑ کے دیکھتی بھی ہے

گیسو بدوش، محوِ تماشائے آئینہ
اس کی نگاہ روزنِ دیوار نہیں

کہنے والوں نے کہا ظلِ الٰہی جن کو
ہم انھیں سایۂ دیوار نہیں کہہ سکتے

لاکھوں ہیں ہم سب بے چارے
اے شہزادو! تم سب کے ہو

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

کاروبارِ قفس اب یہاں آگیا
وہ فلاں چل بسا، وہ فلاں آگیا

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

کہیں رہ نہ جائے مشینوں کی دنیا
کہیں آدمی آ نہ جائے کمی میں

ناجائز پیسے کی اجلی تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب فضل باری ہے

جہاں تک ہماری غزل جائے گی
تغزل کے معنی بدل جائے گی

ماخذ: کلیات شاد عارفی

افصح ظفر

اختر اورینوی ۔ ایک تعارف

فکر وفن کے لحاظ سے بھی اور شخصیت کی وجہ سے بھی اختر اورینوی ہمہ جہت شخصیت کی ایک مثال ہیں یہ افسانہ نگار بھی ہیں، ڈرامہ نگار بھی اور ناول نگار بھی۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت میں ان کا فن بھی ساتھ دیتا ہے اور ان کی ذات بھی۔ بنیادی طور پر انھوں نے سب سے زیادہ افسانے لکھے اور نام کمایا۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے ہیں (1) منظر وپس منظر (2) کلیاں اور کانٹے (3) انارکلی اور بھول بھلیاں (4) سمنٹ اور ڈائنامائٹ (5) سپنوں کے دیس میں۔ ایک ڈرامہ بھی انھوں نے لکھا ہے جس کا نام 'شہنشاہ حبشہ' ہے۔ ان کی تنقیدی کتابیں تین ہیں (1) اقبال (2) کسوٹی (3) تنقید جدید۔ کچھ علمی مقالے بھی 'گذارشات' کے عنوان سے سامنے آئے ہیں۔ ان کی تحقیقی کتاب 'بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا' 1857 تک تحقیق کی دنیا میں کافی مشہور ہے۔

'اختر اورینوی' قلمی نام ہے اور تعلیمی دنیا میں ان کا نام سید اختر احمد ہے۔ ان کی پیدائش 19 اگست 1910 کو جہان آباد کاکو میں ہوئی اس میں اختلاف رائے ہے، پروفیسر سید حسن صاحب کہتے ہیں کہ یہ نانیہال یعنی کاکو میں نہیں پیدا ہوئے بلکہ اپنے دادیہال یعنی اورین ان کی جائے پیدائش ہے۔ پروفیسر سید محمد حسنین کہتے ہیں کہ وہ یقینی طور پر کاکو میں پیدا ہوئے۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی جہاں انھوں نے اردو، فارسی، عربی پڑھی اور پھر باضابطہ انگریزی اسکول میں ان کا داخلہ ہوا جہاں انھوں نے امتیازی کامیابی حاصل کی اسکول اور کالج میں سائنس کی طرف رجوع کیا اور وہاں بھی امتیاز حاصل کیا بعد میں انھوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا لیکن تعلیم مکمل نہیں کر سکے کیونکہ انھیں اس زمانے میں ٹی بی کے مہلک مرض نے تعلیم ترک کرنے پر مجبور کر دیا یہ مرض ایسے اسٹیج میں تھا کہ انھیں رانچی کے سینی ٹوریم میں کچھ عرصے تک علاج کی خاطر رہنا پڑا اور ان کی میڈیکل تعلیم کا خواب ادھورا رہ گیا۔ کالج کے ابتدائی دنوں میں ہی ان کی شادی ہو گئی تھی۔ غالباً 1933 میں اور جن سے شادی ہوئی وہ مشہور افسانہ نگار شکیلہ اختر تھیں۔ علاج معالجہ کے بعد انھوں نے پھر تعلیمی زندگی کا آغاز کیا اور انگریزی آنرس کے ساتھ گولڈ میڈل بھی حاصل کیا لیکن ایم اے انھوں نے انگریزی کے بجائے اردو میں کیا اور 1938 میں پٹنہ کالج میں اردو کے لیکچرر مقرر ہو گئے اور وہیں 1952 میں شعبہ اردو کے صدر بھی ہوئے۔ ان کا انتقال 19 مارچ 1973 میں پٹنہ میں ہوا۔

اس عہد سے میری مراد 1935 کے بعد جب انھوں نے افسانہ نگاری شروع کی ایک جگہ اختر اورینوی نے اپنی کہانی کاری کے بارے میں انتہائی اختصار کے ساتھ ایک دو جملے لکھے ہیں اس میں انھوں نے اپنی کہانی کے فن کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ کہتے ہیں:

''میرے دل و دماغ اور شخصیت کی تعمیر میں چند چیزوں نے بہت حصہ لیا ہے۔ احمدیت، اقبال کی شاعری، نیاز فتح پوری کی افسانہ نگاری، سائنس کا مطالعہ، گھر کی فضا، اشتراکیت کا تفصیلی مطالعہ اور میری مسلسل علالت ...''

اس مختصر ترین ذاتی تجربوں نے اختر اورینوی کے فکر وفن کو بے حد صاف ستھرا کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ احمدیت یعنی مذہبیت ان کے افسانے اور ناول میں جھلکیاں دکھاتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا ڈرامہ 'شہنشاہ حبشہ' میں بھی اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اقبال اور نیاز دونوں کے لب و لہجے، اظہار وادا میں وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان دونوں سے مدد لے کر کوئی تیسرا راستہ نکالیں اس سلسلے میں ان کو سائنس اور فلسفہ اشتراکیت بھی تعاون دیتے ہیں اور پھر ہمیں ان کی کہانیوں میں ان کے ڈراموں میں اور ان کے ناول میں جو درد کی گھلاوٹ ملتی ہے وہ نتیجہ ہے ان کی مسلسل بیماری کا 1935 سے لے کر لگ بھگ 1970 تک جس طرح ادبی دنیا میں متحرک نظر آئے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک ایسا بالغ ذہن رکھتے تھے جو فکر وفن کو تنقید کی جدید کسوٹی پر کستا ہے اور اس سلسلے میں وہ کسی فکر کے پابند نہیں اسے مذہب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے اسے اشتراکیت بھی پسند آتی ہے اور اقبال کی علمی، فکری اور شعری خوبیاں بھی انھیں اپنی طرف کھینچتی ہیں اور دوسری طرف نیاز فتح پوری کی رومان پرور زبان اور گلابی تیور بھی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور ان سب کے نتیجے میں ہوتا یہ ہے کہ جب وہ سپنوں کے دیس میں محو گل گشت ہوتے ہیں تو سانپوں کی کیچلیاں اور آسمانی جبریل ایک ایسی ماورا یا مابعد الطبعیاتی فضا قائم کرتی ہیں کہ جس کو پڑھ کر قاری ماضی اور حال میں لپٹ کر رہ جاتا ہے اور ان کی کہانیاں فنی طریقے پر اپنا کام کر جاتی ہیں۔

اختر اورینوی نے اپنی سوچی سمجھی اسکیم بنا کر ایک ناول 'حسرت تعمیر' کے لحاظ سے بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے ابتدائی حصے میں لکھا تھا کہ جب ساری دنیا دوسری جنگ عظیم کے تھپیڑے کھا رہی تھی اور یہ سرکار انگلشیا کا آخری دور تھا۔ اختر اورینوی کا فنکار چھوٹا ناگپور کے معدنیاتی علاقے کے پس منظر میں نیا ہندوستان بنانے کی کہانی گڑھتا ہے اور اس کے سارے تانے بانے کو برطانوی استحصال سے پیدا شدہ نئی ہندوستانی سرمایہ داری کا نمونہ پیش کرنا چاہتا ہے اسی لیے یہ ناول یعنی 'حسرت تعمیر' نہ صرف اس ناول کے اہم کردار 'بوس محبوب' کی حسرتوں کا جنازہ ہے بلکہ خود ناول نگار کی حسرت کا اشاریہ بھی ہے اس ناول کا تھیم بھی ہمیں یہ سمجھاتا ہے کہ سائنسی جدت کے سہارے جب انسان اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتا تو اس کی سائنسی تلاش جب معدنیات کی شکل میں اسے نصیب ہوجاتی ہے تو اس کا اخلاقی توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ قدرت کے وسائل کو سنبھال کر نہیں رکھ پاتا ہے اسی لیے تعمیر کی حسرت طرح طرح سے اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہے۔

اختر اورینوی تنقیدی لحاظ سے بہت سوچ فکر کے بعد اپنی رائے یوں دیتے ہیں کہ تنقید اور تخلیق میں جب توازن پیدا ہوتا ہے تو نقاد سنبھلا سنبھلا نظر آتا ہے اور وہ تخلیق کے عمل کو ایمانداری سے جانچ اور پرکھ سکتا ہے اچھا نقاد اپنی حدیں پہچانتا ہے۔ آخر میں ان کی شاعری کے بارے میں مختصراً یہ عرض ہے کہ اختر اورینوی اپنی شاعری میں اتنی ہی دور جاتے ہیں جتنی دور احتشام حسین، کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور پہنچتے ہیں۔ میں نے اختر اورینوی کو کوٹ کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ بے حد مذہبی تھے مگر ان کا مذہبی رویہ صوفیوں جیسا تھا وہ بنیادی طور پر عشق حقیقی کے قائل تھے اور اس سلسلے میں ان کی ایک بے حد مشہور نظم 'انکار جنت' ہے جس کا ایک شعر میں بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں اور اختر اورینوی کے بارے میں میرے خیالات کی آخری کڑی ہے:

قدسیوں کو ہی مبارک رہے جنت تیری
مرے مولا، مجھے کافی ہے محبت تیری

Dr. Afsah Zafar, (Retd.) Professor Road No-1A, White House Compound Gaya - 823001 (Bihar)

اختر اورینوی

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے

وندھیاچل اور سنپوڑا پہاڑوں کے سلسلے پورب کی طرف پھیلے ہوئے بہار کے دکھنی علاقوں تک چلے آئے ہیں۔ ہزاری باغ، رانچی، کوڈرما اور ڈالٹین گنج کا پہاڑی خطہ ہرے بھرے جنگلوں، شاندار اونچے نیچے پربتوں، بل کھاتی ہوئی سندر ندیوں اور پھیلے ہوئے شاداب میدانوں سے سجا ہوا ہے۔ دل والوں کے لیے راج گدی چھوڑ کر ایسی جگہ بارہ برس بن باس لینا آسان ہے، اور اگر اس بن باس کے لطف کے ساتھ راج گدی کے بھی مزے ہوں تو آپ کیا کہیں گے— بھگوان کی دیا سے میں اس چھوٹا ناگپور کے جنگل میں منگل منا رہا تھا۔ میرے چچا سیٹھ روکڑمل کلکتے کے لکھ پتیوں میں سے تھے، وہاں ان کی کئی دوکانیں تھیں، اور کئی ملوں میں ان کے حصے تھے۔ میرے بابو جی سیٹھ لکھامل میرے چھٹپن ہی میں سورگ باس ہو چکے تھے اور چچا کو اب تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ میں ہی چچا کا پوس پتر تھا۔ میرے پتا جی کا کاروبار آگرہ، میرٹھ، اور کانپور میں تھا۔ مجھ سے دو بڑے بھائی ان جگہوں کے بیوپار کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ میں نے دلی میں تعلیم حاصل کی۔ میرے خاندان کے لیے یہ انوکھی بات تھی۔ مگر میں لاڈلا تھا، مجھے بی اے تک تعلیم دلوائی گئی۔

بی اے کے بعد میں چچا کی مدد کرنے کوڈرما چلا آیا۔ چچا نے حال ہی میں چھوٹا ناگپور کے جنگلوں میں لاہ اور ابرک کے ٹیکے لیے تھے۔

کوڈرما سے قریب ہی ہماری بہت بڑی ابرک کی کانیں تھیں۔ اور وہیں پر ورکشاپ اور گودام میرے چچا سیٹھ روکڑمل نے کئی پہاڑیوں میں کھدائی کا کام شروع کروایا تھا۔ انھیں میں دولت چھپی رکھی تھی۔ ہمارے مزدوروں نے چوہوں کی طرح ان پہاڑیوں میں کانیں کھود ڈالی تھی۔ ان کے اندر سے ابرک کی چمکتی ہوئی سلیں نکلتیں۔ کھاجوں کی طرح تہہ بہ تہہ۔ سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں مزدوروں، کارندوں اور بابوؤں کی خاصی نوآبادی بس گئی۔ چچا نے وہاں سے کچھ دور ہٹ کر دامودر ندی کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر اپنی کوٹھی بنوائی تھی۔ نئی وضع کی خوبصورت کوٹھی اس حلقے میں نگ کی مثال جڑی ہوئی دکھائی دیتی۔ ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک کوٹھی سے نکل کر سب کانوں تک جاتی تھی۔ ان سڑکوں پر سرخ مورم کے سنگ ریزے بچھائے گئے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خون کی رگیں قلب سے نکل کر تمام جسموں میں پھیل گئی ہیں۔ اور پھر ہر حصے سے خون کھینچ کھینچ کر قلب میں چلا آتا ہے۔ کوٹھی میں ابرک کی کانوں کی دولت کھنچی چلی آتی تھی اور یہیں سے زندگی بٹتی تھی۔

جفاکش مزدوروں نے پتھروں میں جونک لگا ڈالی تھی اور سیٹھ روکڑمل سفید ابرک کو سورج مکھی سونے میں تبدیل کر رہے تھے۔ ہمارا اپنا بجلی کا ڈائمنو بھی تھا۔ رات کو بتوں کے جھرمٹ میں دیوالی کی بہار ہو جاتی تھی۔ کوٹھی کے بڑے احاطے میں نارنگی، پپیتے، امرود، شریفے اور دوسرے پھلوں کا ایک وسیع باغ تھا۔ ہم لوگوں نے قلمی آم کے ساٹے بھی لگوائے۔ ہمارا نفیس ٹینس لاؤنس دور دور تک مشہور تھا۔ افسران گرانڈ ٹرنک روڈ اور رانچی روڈ پر فراٹے بھرتے ہوئے اپنی شاندار موٹروں سے ٹینس کھیلنے کے وقت میں ہماری کوٹھی تک ندیاں اور پہاڑ پار کرتے ہوئے پہنچ جاتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ میں کلکتے سے یہاں بلایا ہی اس لیے گیا تھا کہ افسروں اور ان کی بیویوں سے انگریزی میں باتیں کروں اور ان کی خاطرداریاں اور دعوتیں۔ ہم لوگ ہر ہفتے سینما دیکھنے کار کے ذریعہ چلے جایا کرتے تھے۔

سب کچھ تھا مگر پہلے پہل کلکتہ سے علیحدگی بہت کھلی۔ یوں تو کلکتے میں بھی اب کیا رہ گیا تھا۔ میں وہاں

اکثر سوچتا تھا کہ تفریح اور دل بہلاوے کی اتنی انی گنی قسمیں اس شہر میں ہیں کہ ایک بھلے مانس کا دم گھٹ کر رہ جائے۔ کلکتے سے دل بھر چکا تھا۔ پھر بھی اس جنگل میں بھائیں بھائیں کرتے ہوئے دن کاٹے کھاتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں نے دل لگی کی سبیل نکال ہی لی۔ سیر و شکار کے علاوہ جوانی کی ساری رنگین تمناؤں کے پورا ہونے کی ایسی ایسی البیلی صورتیں نکل آئیں، کہ میرا جی چاہنے لگا تھا کہ اسی جنگل میں دھونی رما کر بیٹھ جاؤں۔

اس پتھریلے جنگلستانی علاقے میں کاشتکاری قاعدے کی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ یہاں اردگرد، بکھری بکھری ہوئی جو بستیاں آباد تھیں، ان میں رہنے والوں کی اکثریت نرالے رنگ کا پیشہ کیا کرتی تھی۔ کھیتی باڑی تو نام کی تھی۔ مرد گرد و نواح کی پہاڑیوں میں قدیمی سادہ طریقوں سے ابرک نکالا کرتے تھے اور کاروباری گماشتوں کے ہاتھوں بیچ دیا کرتے تھے۔ برائے نام قیمتیں ملتی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں بکریاں پالتیں۔ جنگلوں سے پھل پھلار توڑ کر لاتیں، شریفے، فالسے، کیند، پیار، ان پھلوں کو وہ دور دراز قصباتی بازاروں میں جا کر بیچتی تھیں۔ یہ عورتیں گانے اور ناچنے میں بڑی مشاق ہوتی تھیں۔ پشت پشت سے یہی پیشہ تھا۔ صدیوں کے رقص و نغمہ کی روح ان کی حسین آنکھوں کے دریچے سے جھانکتی تھی۔ کھلی صحرائی ہوا، نیلے آسمان سے سورج اور چاند کی برستی ہوئی سنہری رپہلی کرنوں اور آزاد جنگل کی ہری بھری رُت نے ان کھیلٹن عورتوں کے شاداب، موزوں، امنڈتے ہوئے جسموں کی پرورش کی تھی۔

اردگرد کے زمینداروں، راجوں، راجواڑوں کے یہاں یہ کھلٹین شادی بیاہ، پرب تہوار اور دوسری تقریبات میں ناچنے گانے کے لیے بلوائی جاتی تھیں۔ افسروں کے تبادلے کی دعوت یا بڑے صاحبوں کی پارٹیوں کے موقعے پر تبدیلِ ذائقہ کے طور پر بھی۔ کھیلٹن ڈانس سے لطف لیا جاتا تھا۔ کھیلٹن بلا کی حسین ہوتی ہیں، کوئی گوری دیپک کی طرح اور کوئی سانولی بشت کی شاموں کی مانند۔ ان کا ناک نقشہ اتنے کھلے طور پر اعلیٰ ذاتوں کی طرح ہوتا ہے کہ ہر شخص یہ یقین کرنے پر مجبور ہے کہ ان کی رگوں میں کئی پیڑھی اوپر سے شریفوں کا خون ملتا آیا ہے ان کے مردوں کا رنگ روپ بھی خاصا ہوتا ہے۔ لیکن ابرک نکالنے کی وجہ سے اور مہوے کی شراب بہ کثرت پینے کے سبب جلد ہی جل جاتا ہے۔

جب سے میرے چچا نے ابرک کی پہاڑیوں کا ٹھیکہ لیا تھا، انھوں نے نئے طریقے سے بڑے پیمانے پر کان کنی شروع کی تھی۔ مشینوں نے انسانوں کی مدد کی تو مہینوں کا کام ہفتوں میں ہونے لگا۔ مکمل انتظام تھا۔ مزدور، ہیٹ، فورمین، انجینئر، موٹر ٹرک، بجلی، لفٹ، بنگلے، گودام، ہری بھری اچھوتی وادیوں کی گود میں سیاہ دھوئیں بل کھانے اور بڑے بڑے ٹرک دوڑنے لگے۔ کھلٹی مرد جو پہلے اپنے طور پر ابرک نکالا کرتے تھے، اب چچا کی کانوں میں مزدوری کرنے لگے۔ نجی طور پر کام کرنے سے زیادہ انھیں نفع ہونے لگا۔ کھلٹیوں کے علاوہ دیس دیس کے مزدور کھاد میں کام کیا کرتے تھے۔ ان مزدوروں کو ہر ہفتہ پر اجرت ملا کرتی تھی۔ مزدوری ابرک نکالنے کی مقدار پر منحصر ہوتی ہے۔ صبح سویرے کوک پڑتے ہی مزدور اپنے اپنے گاؤں کی جھونپڑیوں، اور اپنے اپنے شڈ سے نکل نکل کر پہاڑی پگڈنڈیوں پر یوں گزرتے دکھائی دیتے تھے، جیسے چیونٹیوں کی قطاریں۔ یہ مشغول کامی چیونٹیاں اپنے اپنے بلوں میں داخل ہو جاتی تھیں۔ دن دن بھر اس کے اندر رہتیں، اپنا رزق کماتیں اور دنیا کو محبت کا سبق اور ابرک دیتیں ایک دو کانوں میں لفٹ لگائی گئی تھی۔ لیکن بہت سی کانوں میں لوہے کی سیڑھیوں کے ذریعے ہی اترا جاتا تھا۔ بہت ہی تنگ و تاریک راستے، منزل بہ منزل، بھول بھلیوں کی طرح ہر طرف پہاڑیوں کا جگر چیرتے ہوئے پھیل گئے تھے۔ سائنس اور سرمایہ نے مل کر فطرت کے خزانوں میں بہت گہری نقبیں لگائی تھیں۔ زمین کا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا۔ دھرتی دولت اُگل رہی تھی۔ کھلٹی لوگوں کی فارغ البالی وقتی ثابت ہوئی۔ آمدنی تو بڑھ گئی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ غلے کے خرچ کی زیادتی کے سبب صنعتی نوآبادی کے حلقے میں گرانی بڑھ گئی۔ باہر سے بھی مزدور بہ کثرت آنے لگے۔ اب تک کھاد میں کام مل جانا مشکل تو نہیں تھا، پر اجرت روز بروز گھٹنے لگی۔ میٹ اور فورمین اپنی مٹھائیاں گرم کرنے لگے۔ کل کا ٹٹ پنجیا مگر آزاد، ابرک نکالنے والا کھلٹی تاجر آج کا بندھا غلام تھا۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ کھلٹن عورتوں کو بھی کانوں میں کام کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہرنیاں چھکڑوں میں جوت دی گئیں اور مورچکی پینے لگے۔

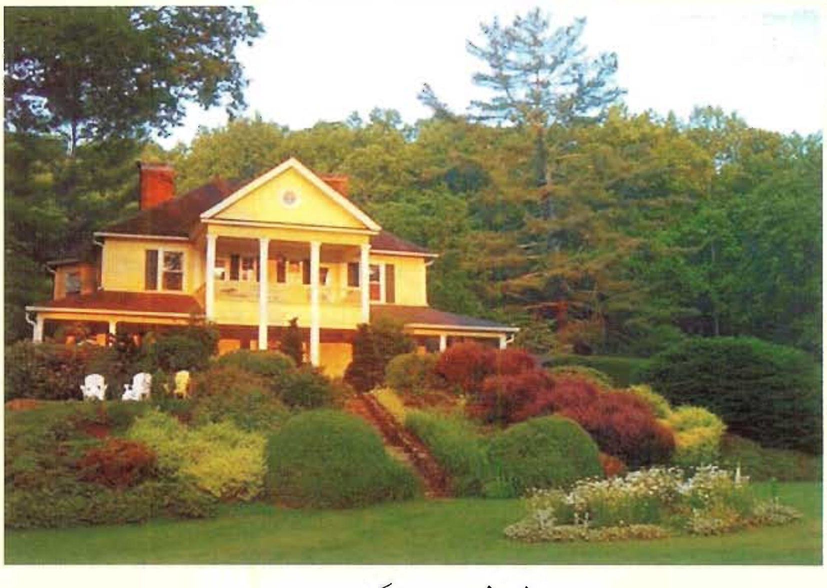

وہ بھی ایک کھلٹن تھی۔ اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ رتنا! ہاں وہ انمول رتن تھی۔ ابرک کے کانوں میں چمکنے والا ایک نایاب ہیرا۔ وہ کوڈرما کی گھاٹی میں چمکنے والا سورج تھی۔ اُس کا چہرہ کسم کے چمپئی پھول کی طرح تھا۔ اس کی آنکھیں کہستانی جھیلوں میں پھولنے والے گنول کی کلیوں کی مانند اور اس کے ستار کے تاروں کی مثال نازک، نغمہ ریز اب جنگلی چنار کی سرخی لیے ہوئے تھے۔ اس کا سڈول گدرایا ہوا بدن، اجنتا اور ایلورا کی دیویوں کے جلوے دکھاتا تھا۔ اس کی چال پہاڑی جھرنوں کی موسیقی تھی اور اس کا شباب چیت کی سنکتی ہوئی پچھوائی، ساون کے برستے ہوئے بادل اور بھادوں کی اُمڈتی ہوئی ندیوں کی طرح سرمست، رسیلا اور رواں تھا۔

میں اپنے چچا کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ آج میں انھیں کی بدولت دیس دیس مارا مارا پھر رہا ہوں۔ رتنا کا خیال میری حیات ہے۔ مگر میں کتنا بے بس ہوں۔ میں اپنے سپنوں کو کیسے حقیقت بنالوں، جب سب سے بڑی حقیقت بھی سپنا بن گئی۔

رتنا ابرک کی کانوں میں کام کیا کرتی تھی۔ مجھے جیتن میٹ نے اس کی اطلاع دی، اُسے دکھلانے کا وعدہ

کیا اور دکھلا بھی دیا۔ میں نے بہت سی حسین البیلی صورتیں دیکھی تھیں، اور بہت سے سندر روپوں کی پوجا کی تھی، پر رتنا کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ اس سے پہلے میں نے جگ بھر میں کوئی سندر روپ دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں نے اس علاقے کی کھلنٹوں کو بھی دیکھا تھا اور آپ جانیے محرومی و نارسائی کی خلش میرے دل میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں کیوں رتنا کو دیکھتے ہی میرے دل نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دیوی ہے اور میری پرارتھنا کی پہنچ سے بہت اونچی۔ دھیرے دھیرے رتنا میرے خوابوں کی دنیا اور خیالوں کی بستی میں بس گئی اور مجھ پر ایک پاک جذبہ تاری ہوگیا۔ دیوی کے درشن نے میرے ہردے کو نرمل بنا دیا اور میری جان کو کندن، موہ کپٹ اور گناہوں کو جیسے کسی نے بالکل دھو کر رکھ دیا۔

جس روز مزدوروں کو ہفتہ بٹتا تھا، اس روز ساری نوآبادی میں مہوے کی شراب، چاول کا ٹھرا دیسی دارو کی بوتلیں خوب اڑتی تھیں ساری ساری رات شڈوں میں تھا تھیا مچی رہتی تھی اور فورمینوں کے حلقے میں کھلنٹوں کا ناچ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک فورمین نے رتنا کو ناچنے کے لیے بلوایا، مگر وہ نہ گئی۔ کئی بلاوے آئے اور وہ انکار ہی کرتی رہی۔ شمبھو فورمین کے لیے یہ رسوائی کب برداشت کے قابل تھی۔ اُس نے رتنا کا نام لسٹ سے کاٹ دیا۔ فورمین کے درباریوں میں سے چند نے اُس کے یوں کان بھرے، کہ رتنا کا غرور اس سبب سے ہے کہ وہ اُتری دیس کے فلاں مزدور پر مرتی ہے۔ یہ پردیسی مزدور بھی شمبھو بابو کی نظروں پر چڑھ گیا۔ جیتن میٹ مجھ سے شوخ تھا اور وہ کوٹھی کی تعمیرات، باغبانی و چمن اندازی کے سلسلے میں مزدوروں پر نگہبان مقرر تھا۔ اس کے ذریعے مجھے ساری خبریں مل جایا کرتی تھیں۔ میں نے رتنا کو کوٹھی کے نجی کاموں پر لگوالیا وہ بہت دنوں تک نئے ٹینس کورٹ پر سرخ مورم بچھانے اور مورم کوٹنے کا کام کرتی رہی، مگر مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ رتنا سے دو باتیں ہی کرسکوں۔ وہ میرا سورج تھی اور میں اسے آنکھیں بھر کر دیکھ نہ پاتا تھا۔ اس درمیان میں اس پردیسی مزدور کو بھی شمبھو بابو نے نکال دیا۔ ان ہی دنوں جنگلوں میں ملیریا کی سخت وبا پھیلی۔ مزدور بہ کثرت بیمار پڑنے لگے۔ پردیسی مزدور بنواری کام سے برطرف ہوتے ہی سخت بیمار پڑا۔ نوآبادی کے ڈاکٹر نے اس کا علاج مفت کرنے سے انکار کردیا کیونکہ اب وہ کھاد میں کام کرنے والا آدمی نہ تھا، سچ پوچھیے تو بنواری کے نکالے جانے اور اس کے بیمار پڑجانے سے میرے دل کے چور دروازے سے خوشی داخل ہوئی تھی۔ بنواری کی حالت دن بدن ردّی ہوتی گئی۔ کیا بتاؤں رتنا کتنی اداس اور بے قرار رہنے لگی۔ اس نے اپنی ساری مزدوری کی اجرت بنواری کے علاج معالجے میں صرف کردی۔ بنواری اپنے ایک دوست کے شڈ میں رہتا تھا۔ شام کو رتنا سیدھی وہاں جاتی اور رات بھر اس کی تیمارداری کیا کرتی تھی۔ رتنا کی محبت بھی حسین تھی۔ اس نے بنواری کے لیے اپنے پرایوں کے طعنے سہے اور ان کے انتقام کا نشانہ بنی۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں، میں رتنا کی وفاشعاری سے اتنا متاثر ہوا کہ ایک دن میں نے اُسے بلا کر ہمت کر کے یہ کہہ ہی دیا ''رتنا بنواری

> رتنا ابرک کی کانوں میں کام کیا کرتی تھی۔ مجھے جیتن میٹ نے اس کی اطلاع دی، اُسے دکھلانے کا وعدہ کیا اور دکھلا بھی دیا۔ میں نے بہت سی حسین البیلی صورتیں دیکھی تھیں، اور بہت سے سندر روپوں کی پوجا کی تھی، پر رتنا کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ اس سے پہلے میں نے جگ بھر میں کوئی سندر روپ دیکھا ھی نہیں تھا۔ میں نے اس علاقے کی کھلنٹو ںکو بھی دیکھا تھا اور آپ جانیے محرومی و نارسائی کی خلش میرے دل میں کبھی پیدا ھی نہیں ھوئی۔ معلوم نہیں کیوں رتنا کو دیکھتے ھی میرے دل نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دیوی ھے اور میری پرارتھنا کی پہنچ سے بہت اونچی۔ دھیرے دھیرے رتنا میرے خوابوں کی دنیا اور خیالوں کی بستی میں بس گئی اور مجھ پر ایک پاک جذبہ تاری ھوگیا۔ دیوی کے درشن نے میرے ھردے کو نرمل بنا دیا اور میری جان کو کندن، موہ کپٹ اور گناھوں کو جیسے کسی نے بالکل دھو کر رکھ دیا۔

اچھا ہوجائے تو میں اُسے کام پر لگوادوں گا۔'' رتنا بجھی ہوئی شمع کی طرح پگھل پڑی انمول موتی اس کی غمگین آنکھوں سے برس رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں سخت دکھ محسوس کیا۔ مجھے پھر بنواری سے نفرت سی ہونے لگی۔ میرے چچا کی ساری دولت پر بنواری حقارت کی ہنسی ہنستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جلن سی پیدا ہوئی، کاش بنواری اچھا نہ ہو۔ لیکن جب وہ اچھا ہوہی گیا تو میں نے رتنا کی خاطر، یا شاید اپنی ہی خاطر کہ رتنا کی نگاہوں میں سبک نہ ہوجاؤں۔ بنواری کو کان میں کام دلوا کر مزدوروں کا میٹ بنوادیا۔ رتنا چچا کی کوٹھی پر باغ میں کام کرتی رہی۔ ایک روز اس نے بڑے ناز سے مسکرا کر اور کچھ شرماتے ہوئے کہا ''سرکار کی ہم پر کتنی دیا ہے۔'' اس کی نشیلی آنکھوں میں حسن کی تاثیر کا نازاں احساس جھلک رہا تھا۔ مجھے ساری دنیا کی بادشاہت مل گئی۔

کیا عرض کروں، میری زندگی کی بڑی تکلیف دہ گھڑی وہ تھی، جب جیتن میٹ نے مجھے اطلاع دی کہ بڑے سرکار یعنی چچا روکڑمل رتنا کی تاک میں ہیں۔ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ مجھے یقین نہ آتا، مگر جب دوسرے روز خود رتنا مجھ سے روتے ہوئے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ ادھر شمبھو فورمین نے ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ وہ منیجر صاحب کی منڈلی کا ایک فرد تھا۔ اس نے چچا تک میری شکایتیں پہنچوائیں۔ ادھر کچھ دنوں سے چچا بھی مجھ سے برہم برہم سے تھے۔ آخر ایک روز انھوں نے میرے کلکتہ چلے جانے کا حکم صادر فرمایا۔ کہنے لگے ابرک کے انٹرنیشنل مارکٹ پر قبضہ کرنے کی ضرورت ہے۔ امریکن اور جاپانی ایجنٹوں سے جاکر ملو اور ہڈ آفس کا چارج لے لو۔ میں نے کتنی بڑی غلطی کی۔ چچا کی دولت مجھے رتنا سے زیادہ پیاری ہوگئی۔ میں کلکتہ چلا گیا اور اب میں اسی دولت پر لات مار کر شہر شہر کی خاک چھان رہا ہوں۔ میں چچا کا منہ تک دیکھنا نہیں چاہتا۔ جب میں کام سے واپس آیا تو کوڑرما کی نوآبادی بھر میں یہ خبر کانوں کان مشہور تھی، کہ سیٹھ روکڑمل نے خود بنواری کو مروادیا۔

فورمین شمبھو اس کھاد کا معائنہ کرنے گیا، جس میں بنواری کام کرتا تھا۔ شام کے وقت سب سے آخری شفٹ میں شمبھو نے دو گنڈوں کے ساتھ لفٹ پر بنواری کو اس غرض کے لیے اندر بھیجا کہ وہ رپورٹ کرے کہ نئی بورنگ پر کام کرنے کے لیے کل کتنے مزدور کی ضرورت ہوگی۔ کسی طرح دھوکے یا زور زبردستی سے بنواری کو کان کے اندر ہی چھوڑ کر لفٹ کا بٹن دبا دیا گیا۔ لفٹ اوپر آگیا، اور بنواری، زندہ درگور ہوکر رہ گیا۔ کئی گھنٹوں کے بعد نقلی طور پر خطرے کا سائرن بجایا گیا اور بنواری کی کھوج شروع ہوئی۔ رات کو بنواری کی لاش، دم گھٹ جانے سے نیلی پڑی ہوئی ملی۔ دوسرے روز دامودر ندی اس کی راکھ بہا کرلے گئی۔ اس واقعے سے ایک ماہ بعد رتنا سیٹھ روکڑمل کی کوٹھی سے پاگلوں کی طرح ہذیان بکتی ہوئی تقریباً عریاں نکلی اور دوڑتی ہوئی جاکر ایک گہری کھاد میں کود پڑی۔

□

الفاظ کیونکر پیدا ہوئے؟

محمد حسین آزاد

دنیا ہمیشہ ترقی کے رستہ میں رواں ہے، کیسی ہی ابتدائی حالت ہو، شائستگی پھیلے جائے گی۔ علوم اور فنون کی دستکاری نئی چیزیں پیدا کرے گی۔ لین دین جسے ترقی نے تجارت کا خطاب دیا ہے ایک جگہ کی چیزیں دوسری جگہ پہنچائیں گے۔ اس سبب سے بھی نئے الفاظ ہر جگہ پیدا ہوں گے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچیں گے کیونکہ چیزیں اور کام نئے ہیں۔ دیکھ لو! یہی سبب ہے کہ دیہات میں الفاظ کم ہوتے ہیں، شہروں میں بہت اور شہری الفاظ کی خوش آوازی، خوش ادائی اور لطافت گاؤں والوں کو اپنی شاگردی پر مجبور اور مشتاق کرتی ہے۔ اسی کو خاص و عام کا اتفاق کہتے ہیں اور اس سے الفاظ اور اصطلاحیں پیدا ہوتی ہیں۔

اب کوئی پوچھے کہ تقریر کیونکر پیدا ہوئی؟ تم صاف کہہ دو گے کہ انسان میں جو چیخنے یا چلانے کی خاصیت ہے، وہ باہمی ضرورتوں اور آپس کے برتاؤ سے اصلاح اور ترقی کرتے کرتے تقریر ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ رتبہ پیدا کیا کہ جس طرح ایک مصور کامل کسی انسان یا باغ یا محل کا نقشہ کھینچ کر اس کی کیفیت آنکھوں کے رستے سمجھاتا ہے۔ صاحب زبان اپنے مافی الضمیر اور حرکت اعضا کے مجموعہ کو آواز کے رنگ میں کانوں کے رستے سمجھاتا ہے۔ پس گویائی گویا ایک عمدہ آلہ ادائے خیال کا ہے۔ لیکن نامکمل، کیونکہ کون سا قادر الکلام ہے جو دل کے خیال کو جوں کا توں پورا پورا اپنے لفظوں میں ادا کردے۔ عمدہ سے عمدہ کلام دل کے خیالات کی تصویر ہے۔ لیکن ایسے پانی میں ہے جو گدلا ہے یا عکس ہے ایسے آئینہ میں جو دھندلا ہے۔

تم نے خیال کیا؟ زبان یعنی تقریر گویا انسان کے دل، انسان کی خواہش اور اس کے حرکات اعضائی کا مجموعی خلاصہ ہے۔ اسی خیال سے زبان عرب کے ابتدائی محققوں میں **عباد بن سلیمان ضمیری** نے کہہ دیا کہ ''الفاظ اپنے حروف، اعراب اور آوازوں کے ذریعے سے خود بخود اپنے معنی بتلاتے ہیں۔'' مگر یہ رائے عموماً درست نہیں۔ اصفہانی نے شرح منہاج بیضاوی میں لکھا ہے کہ جمہور اہل لغت اس پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اگر یہی بات ہوتی تو ہر شخص ہر لفظ کے معنی سمجھتا۔ بتانے اور لغت میں دیکھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ دوسرے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں، جو باہم مخالف ہیں۔ اگر الفاظ بالطبع اپنے معنوں پر دلالت کرتے تو یہ کیونکر ہوسکتا تھا۔ البتہ لفظ بھی بعض جگہ اپنے معنوں پر آپ اشارہ کرتا ہے۔ دیکھو۔

تندر (رعد) کو خیال کرو اس لفظ میں گرج زور و شور سنائی دیتا ہے یا نہیں؟

درشت کو دیکھو۔ کرخت پر خیال کرو، سختی اور کھردراپن نہیں پایا جاتا؟

تیر کی ی کو مد کی کشش میں دیکھو۔ صاف نظر آتا ہے کہ کوئی تیز چیز تیز رو ہے کہ سیدھی چلی جاتی ہے

خم یا **خُنب** بولنے میں بھی اپنی پھلاوٹ اور گلاوٹ کی تصویر دکھاتا ہے۔

یورپ کے دانا کہتے ہیں کہ پہلے طبیعت کی تاثیر نے حالت کے مناسب آوازیں نکالی تھیں۔ پھر استعمال اور تہذیب نے انھی کو لفظ بنا دیا، یہ رائے قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

چہچہہ بلبل کی آوازِ مسلسل کا نام ہوا۔ کوکو فاختہ کی آوازِ متواتر کا۔

غرّش جانوروں کی خفگی کی آواز۔ قہقہہ انسان کی ہنسی۔

غوغا غلغلہ، غلغل، شور و غل انسان کا ہوا۔

کوہستان **خراسان و ایران** کے کوے دیکھے۔ چیل سے ذرا چھوٹے ہوتے ہیں اور بولنے میں صاف کلغ کلغ آواز دیتے ہیں۔ کلاغ ان کا نام ہوگیا۔ **چغوك** اسی آواز کے سبب سے چڑے کا نام ہوا (یعنی چڑیا کا نَر)

تم ضرور کہو گے کہ اپنے رنگ آواز اور ادا کے انداز اور دل کی حالت کو ملا کر جو معنی چاہو پیدا کرلو۔ اصلی لفظ میں تو ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی درست ہے، لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ زبان انسان کی آواز، دل اور اشاراتِ اعضائی کا مجموعہ ہے۔ اس صورت میں کسی جز کو روکنا نہیں چاہیے۔

ولادتِ زبان کی بنیاد تم نے دیکھ لی؟ پہلے کچھ اشارے تھے۔ پھر کچھ آوازیں۔ پھر باہمی اتفاق سے کچھ الفاظ آپس کے سمجھنے سمجھانے کے لیے مقرر ہوگئے۔ پس جب آفرینش بڑھے اور آبادی پھیلے تب بھی واجب ہے کہ وہی الفاظ کام میں لائیں کہ سب کی سمجھ میں آئیں اور عام فہمی کے سبب سے انھیں سب سے پہلے کام میں لائیں۔

زبان میں کسی کو اپنی طرف سے ایک لفظ بھی ایجاد کرنے کا اختیار نہیں ہے! یہ ہوسکتا ہے کہ میں شادی کہوں اور اس کے معنی رکھوں آدمی۔ اسے شاید میرے نوکر چاکر یا دوست آشنا سمجھنے بھی لگیں مگر اور سب کب مانیں گے اور مانیں کیا؟ اگر چند لفظ ایسے تصنیف کرلوں تو کوئی میری بات نہیں سمجھے گا۔

اسی بنیاد پر عرب کے اہل تحقیق نے کہا ہے کہ لغت وہ ہے کہ جس پر جمہور کا اتفاق ہو۔ اصطلاح وہ ہے جس

پر خاص گروہ کا اتفاق ہو۔ البتہ کوئی علمی مصنف یا صاحبِ ایجاد قادر الکلام شخص بھی الفاظ ایجاد کرسکتا ہے لیکن ان کے قیامِ عمر کے لیے اسے بھی جمہور کا حسنِ قبول حاصل کرنا پڑے گا۔

میرے دوستو! تم حیران ہوگے کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا؟ ہاں لفظ کی بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفی لفظ کے جز جز کو الگ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت ان کی اصل کس کس ملک اور کس کس قوم میں پہنچتی آئی ہے۔ ان میں کیا رشتے ہیں؟ اور کیونکر وہ رشتے پیدا ہوئے ہیں؟ اور ملک بملک ان کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوئے ہیں۔ پھر اور زبانوں کے لحاظ سے اپنی باتوں پر غور کرتا ہے۔ ان کے نتائج کو بھی جانچتا ہے اور مطابقت اور مقابلہ کرتا ہے یعنی ایک زبان کے لفظ دوسری زبان سے کن کن باتوں میں متفق ہیں اور کون سی باتیں ہیں کہ ایک ہی کے لیے خاص ہیں۔ پھر ان سببوں کی جستجو کرتا ہے جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں اور یہ غیر منقطع کام ہے کبھی ترقی کے رنگ میں ہوتا ہے، کبھی تنزل میں، مگر جاری ہمیشہ رہتا ہے اور اسی کو زبان کی اصل نسل کہتے ہیں۔ اب چند مثالیں توضیح مطلب کے لیے لکھتا ہوں۔

گریبان کو فلسفی زبان نے دیکھا۔ بان پر جوڑ معلوم ہوا۔ اس نے گرے کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بمعنی گلو پایا۔ سجھ گیا کہ اس جز و لباس کا گلے پر قبضہ ہے اس لیے اس کا نام گریبان رکھا ہوگا کہ مالک گلو ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں گریوا ग्रीवा انھی معنوں میں آیا ہے اور بان سنسکرت میں وان वान ہے۔ ثابت ہوگیا کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ ملک اور مدت کے انقلاب سے آواز بدل گئی، یہاں مرگیا وہاں جیتا ہے۔

کلابتون کو سب پہنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں، فلسفی زبان اس کا بل کھولتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کلابہ۔ کلاوہ (سوت کا لچھا) آلتون ترکی میں سونے کو کہتے ہیں وہی سنہرا لچھا ہوا۔

نیلوفر کو بے خبر آدمی ایک گلِ خودرو سمجھے گا، فلسفی زبان دیکھے گا کہ نیلوپر۔ نیلوفل۔

نیلوپل نیلپر۔ سب طرح مستعمل ہوا ہے۔ تب اِدھر اُدھر نظر دوڑائے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ سنسکرت میں نیل नील نیلا ۔ اُت پل उत्पल پنکھڑی ہے۔ یعنی نیلی پنکھڑی والا پھول، فارسی میں اَدل بَدل ہوکر کچھ سے کچھ ہوگیا۔

ناہار اور **نہار** ہندوستان میں بھی سب جانتے ہیں۔ فلسفی زبان نے دیکھا تو ن پر جوڑ معلوم ہوا۔

اہار کو دیکھا تو فارسی بلکہ سنسکرت میں بھی بمعنی خورش آیا ہے۔ سمجھ گیا کہ صبح سے جب تک کچھ نہ کھایا ہو اس وقت تک ناہار یا نہار ہے۔

خُربزہ کو سونگھا تو بو آئی کہ مرکب ہے۔ خر کو دیکھا بمعنی کلاں بھی آتا ہے۔ بُزہ کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بمعنی ثمر ہے۔ سمجھ گیا کہ بڑا پھل تھا، اس لیے خربزہ نام رکھا ہوگا۔ سنسکرت میں بھی بعینہ یہی دو جز اور یہی معنی ہیں۔

میرے دوستو! تم دل میں کہتے ہوگے کہ اس توڑ جوڑ اور لفظوں کے رگ پٹھے چیرنے سے کیا فائدہ؟ جب ہم ایک زبان سیکھتے ہیں تو اس میں یہی غرض ہوتی ہے کہ اور کی بات سمجھ لیں اپنی بات سمجھا دیں۔ اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ لفظوں کے معنی آگئے۔ عبارت کا مطلب معلوم ہوگیا۔ والسلام۔ میں بھی کہتا ہوں۔ بے شک زبان سیکھنی ہو تو اس سے زیادہ کاوش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ذرا خیال کرکے دیکھو۔ جب تم کوئی شکل اقلیدس کی حل کرتے ہو یا ایک حساب کے سوال کا جواب نکال لیتے ہو یا ایک بچہ کوئی پہیلی بوجھتا ہے تو کیا خوشی ہوتی ہے! ہزاروں پھول، پھل، بوٹیاں، نباتات، جمادات ہیں۔ اگر ان کے مزے اور اصلی تاثیریں معلوم کرکے تمھیں خوشی حاصل ہوتی ہو گی تو لفظوں کی اصلیت دریافت کرکے بھی ضرور خوشی ہوگی۔ جن الفاظ کی توضیح میں نے بیان کی انھیں سن کر کس کس کے دل کو فرحت نہیں ہوئی؟ البتہ بدمزہ، بے مغز ہے کہ الفاظ کو فقط منہ کی بھاپ یا پیٹ کا سانس سمجھتے ہیں۔ انھیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہونٹ سے لفظ نکلے ہوا ہوگئے۔ ان کے نزدیک کچھ بات ہی نہیں۔

الفاظ ظاہر میں ہوائی جنبشیں ہیں، لیکن حقیقت میں مستقل چیزیں ہیں۔ تم ضرور پوچھو گے کہ الفاظ مستقل چیزیں کیونکر ہو سکتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ جب تمھیں کوئی چیز مثلاً چاکو یا قلم درکار ہوتا ہے۔ اگر ایک لڑکے سے بھی کہتے ہو تو فوراً اٹھالاتا ہے۔ دور ہو یا پاس۔ حالانکہ تم نے فقط لفظ کہا تھا چاکو یا قلم کی تصویر بنا کر نہیں دی۔ دیکھو لفظ نے اس کے دل پر اصل شے کا کام دیا۔

تم لفظوں میں فقط اتنا ہی نہ سمجھو کہ برائے نام خاص خاص چیزوں پر اشارے کرتے ہیں۔ غور کروگے تو پاؤ گے کہ وہ بھی اور چیزوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ ترقی و تنزل کرتے ہیں۔ سفر کرتے ہیں اور اس میں طبیعت اور رنگ بدلتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔

الفاظ کے تغیر طبیعت اور ان کے رنگ بدلنے پر تمھیں ضرور کھٹکا گزرے گا کہ اسما حقیقت میں اشیا کے نام ہیں۔ جب چیزیں نہیں بدلیں اور نام ان کے بدل گئے تو الفاظ اور معانی میں عجب خلط ملط پیدا ہوگا۔ میرے دوستو! یہ تغیر ضرور ہوتے ہیں اور وہ قباحت نہیں پیدا ہوتی جس کا تمھیں خطرہ ہے۔ دیکھو؟

جیب عرب میں اوّل سینہ کو اور دل کو بھی کہتے تھے۔ پھر گریبان کو کہنے لگے کہ سینہ پر ہوتا ہے۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں جَوب بمعنی قطع ہے گریبان کترا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا نام جیب رکھا۔ عرب کے لوگ جبہ یا کرتہ کے گریبان میں ایک تھیلی ٹانک کر اس میں چیز رکھ لیا کرتے تھے۔ مدت کے بعد اسی کا نام جیب ہوگیا۔

فارس میں وہ تھیلی گریبان سے ڈھلک کر کمر کے نیچے آگئی اور نام وہی جیب رہا۔ تماشا یہ کہ اب گھڑی کے شوقینوں نے چھاتی کے بائیں طرف جگہ دی اور کوٹ پتلون والوں نے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ پھر بھی وہی جیب ہے اور عرب میں جیب وہی گریبان ہے۔

جب عرب میں علم ریاضی کا چرچا اور علم مثلث کا یونانی سے ترجمہ ہوا تو جو خط کسی قوس یا اس کے زاویہ کا اندازہ بتائے اسے جیب کہنے لگے۔ کیونکہ وہ بھی قوس کے لیے ایسا ہے جیسے سینہ کے لیے گریبان۔

شمع عرب میں موم کو کہتے ہیں۔ پھر موم کی شمعیں بننے لگیں۔ ان کا نام بھی شمع ہی رہا۔ فارس میں آکر چربی کے قالب میں ڈھلیں۔ یہاں شمع عام ہوگئی۔ موم کی بتی ہو خواہ چربی کی۔ عرب میں شمع وہی موم ہے۔

اسباب عربی میں سبب کی جمع ہے۔ فارسی میں اسباب خانہ داری کو کہتے ہیں۔

شراب عرب میں پینے کو اور اس چیز کو کہتے ہیں جو پینے میں آئے۔ فارس میں مرادف بادہ ہوگیا

(1) بعض الفاظ سفر کرکے آتے ہیں اور ملک غیر میں بے عزت ہو جاتے ہیں۔

غلام عرب میں نوخط لڑکے کو کہتے ہیں۔ فارس میں لونڈی کا نر غلام۔

مہتر فارسی میں سردار کو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں چوڑھا ہوگیا۔

خلیفہ کا رتبہ عرب میں نائب پیغمبر اور خلیفہ الٰہی تک پہنچا ہوا ہے۔ ہندوستان میں نائی کو کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں لفظ ایجاد نہیں ہوتے۔ نئے خیالات کے ادا کرنے میں پرانے الفاظ مدد کرتے ہیں۔ مثلاً:

نفط رال کا مرادف ہے۔ اب مٹی کے تیل کو بھی کہتے ہیں۔

مداد پہلے سیاہی کو کہتے تھے۔ اب پنسل کو بھی کہتے

ہیں۔ پہلے **قلم سرمہ** اور **کلک فرنگی** کہتے تھے۔ یہ لفظ مر گئے۔

بوقلموں چند سال سے **فیل مرغ** (پیرو) وہاں پہنچا ہے۔ اسے بوقلموں کہتے ہیں۔

(2) کبھی دو لفظ مرکب کر لیتے ہیں۔ مثلاً:

سیب زمینی آلو کو کہتے ہیں۔ یہ بعینہٖ ترجمہ ہے پوٹے ٹو کا۔ پس معلوم ہوا کہ فرانس کے رستہ سے پہنچا۔

آبجوش سوڈا واٹر کو کہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ہزاروں لفظ پیدا ہو گئے ہیں۔

(3) کبھی مشتق کر لیتے ہیں۔ وہاں بھی اب برف کوزوں میں جماتے ہیں۔ اسے بستنی کہتے ہیں۔

(4) کبھی جو شے آتی ہے اپنا نام ساتھ لاتی ہے **تلگراف** ایران میں تار کے پیغام کو کہتے ہیں۔ اس میں تصرف کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ہشت روز است خط نوشتہ بودم۔ جواب نیامد۔ ناچار امروز تیل زدہ ام (آج میں نے تار دیا ہے)۔

منات نوٹ کو کہتے ہیں۔ روسی لفظ ہے

پرتغال ایک قسم کا رنگترہ ہوتا ہے۔ اس کا پودہ پرتگال سے آیا تھا۔ وہی نام ہو گیا۔

کالسکہ بگی کو کہتے ہیں۔ یہ بھی روسی لفظ ہے۔ ایسے سیکڑوں لفظ ایران میں زبان زدِ خاص و عام ہیں اور اکثر چیزوں کے نام بدل گئے ہیں۔ پہلے ناموں کو سمجھو کہ مر گئے۔

چاپ چھاپے کا کام ہندوستان سے گیا۔ اسی واسطے یہ نام پایا۔

(5) علمی الفاظ اور علمی اصطلاحیں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اکثر زندہ رہتی ہیں اور کارروائی کرتی ہیں۔ علم ہمیشہ ترقی کرتا ہے اور اصلاح پاتا ہے۔ اس لیے بعض الفاظ جلد مر جاتے ہیں۔ نئے پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج سے 30 برس پہلے کی ریاضی یا جغرافیہ کی کتاب اردو زبان میں دیکھو تو یہ تعجب جاتا رہے گا۔

(6) خوش ایجاد نام بھی اکثر کم عمر اور ناپائیدار ہوتے ہیں۔

محمود غزنوی جب ہندوستان میں آیا اور آم کھایا تو بہت بھایا۔ مگر نام سن کر ہنسا اور کہا۔ سخت ستم ہے کہ ایسا لطیف میوہ اور نام میں یہ فحش! اسے نغزک کہنا چاہیے کہ اسم بامسمّی ہو چنانچہ بعض فارسی کی کتابوں میں نغزک بعض میں انبہ لکھتے ہیں۔ امیر خسرو نے قران السعدین میں ہندوستان کے میووں کی تعریف کرتے کرتے آم کے باب میں بھی چند اشعار لکھے ہیں:

نغزکِ خوش مغز کُنِ بوستاں
خوب ترین میوۂ ہندوستاں

نعمت خان عالی نے اپنے دوست **حسن خاں** کو آموں کی رسید لکھی۔ اس کی نظم میں ایک شعر ہے کہ نہیں بھولتا:

انبہ فرستاد حسن خاں بمن
اَنْبَتَہُ اللّٰہ نَبَاتاً حَسَنْ

اکبر نے صدہا چیزوں کو ناموں کے خلعت دیے۔ کوئی باقی ہے کوئی پرانا ہو کر پھٹ گیا۔ ایک دن اصطبل خاصہ میں گھوڑوں کے دیکھنے کو آیا۔ ہلاک خور ٹوکرے بھر بھر کر کثافتیں اٹھا رہے تھے۔ فرمایا کہ بڑی محنت کی روٹی کھاتے ہیں، انھیں حلال خور کہنا چاہیے۔ آج تک وہی نام چلا آتا ہے۔

ہار کو کہا کہ سنگار کی چیز اور مبارک چیز پر ہار کا نام آنا بدشگونی ہے۔ اسے 'پھل مال' کہا کرو۔ یہ سرسبز نہ ہوا۔

اسی خیال سے گھوڑے کی اندھیری کا اُجیاری نام رکھا یہ پیش نہ گئی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسے اب ہم 'اندھری' کہتے ہیں اس وقت اسے بھی اندھیاری کہتے تھے۔

جہانگیر نے شراب کا نام رام رنگی رکھا۔ مگر رنگ نہ جما۔

جمعرات کا نام **مبارک شنبہ** رکھا کہ جو خوشی ہمیں ہوتی ہے اکثر اسی دن ہوتی ہے۔ پیر کا نام گم شنبہ رکھا۔ لکھتا ہے کہ مجھے جو غم یا فکر ہوتا ہے اسی دن ہوتا ہے۔ اس کا نام ایام ہفتہ سے گم ہونا چاہیے۔

محمد شاہ نے **بلبل** ہندستان کا نام گلدم رکھا تھا۔ اب تک اسی طرح چلا آتا ہے۔

رنگترہ کو پہلے سنگترہ کہتے تھے۔ **محمد شاہ** نے کہا کہ اس لطیف میوہ کو پتھر مارنا سخت ستم ہے۔

رنگترہ کہا کہ خوش رنگ بھی ہے، تر و تازہ بھی ہے۔

شاہ عالم نے سرخاب کو **گلسرہ** کہا مگر شہرت نے نامنظور کیا۔

کنجر اور **کنجری** ہندی میں زنِ رقاصہ کو کہتے تھے۔ اکبر نے ایک دن خوش ہو کر کہا کہ انھیں کنچنی کہا کرو۔

نواب سعادت علی خاں نے **ملائی** کا نام **بالائی** رکھا۔ اہل لکھنؤ اب بھی بالائی کہتے ہیں۔ اور شہروں میں شہرت نہ ہوئی۔

عزیزانِ وطن! تم ضرور کہتے ہو گے کہ زبان کی عمر کیا؟ اور اس کی تاریخ کیا؟ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ عالم میں بہت سے ملک۔ بے شمار اہل ملک اور ہزاروں قومیں ہیں۔ اسی طرح زبانوں کا بھی عالم گروہ در گروہ سمجھو کہ تھا اور ہے اور ہوتا رہے گا۔ جس طرح قومیں بڑھیں، چڑھیں، ڈھلیں اور فنا ہو گئیں اور ہوں گی۔ اسی طرح زبانوں کا عالم ہے کہ اپنے الفاظ کے ساتھ آباد ہے وہ اور اس کے الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔ ملک سے ملک میں سفر کرتے ہیں۔ حروف و حرکات اور معانی کے تغیر سے وضع بدلتے ہیں۔ بڑھتے ہیں، چڑھتے ہیں، ڈھلتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔

الفاظ جو سفر و سیاحت کر کے ملک غیر سے آتے ہیں اور زبان میں گھر بناتے ہیں وہ اکثر تجارت کی وکالت یا قوموں کے ارتباط سے راہ پاتے ہیں۔ زبانوں میں عام دستور یہ ہے کہ بعض لباس، بعض کھانے، بعض اجناس، بعض علمی مطالب اور ان کے سامان ملکِ غیر سے آئے۔ وہ یا تو اپنے نام ساتھ لائے یا یہاں آ کر یہیں کی زبان سے نام پائے۔ فارس میں عرب کا تسلط ہوا اور ملک، مملکت، مذہب، سکونت سب کو روک لیا کہ یہی رستے زبان کے استقلال یا انقلاب کے تھے۔ اہل ملک بہت تو مسلمان ہو گئے، بہت سے آوارہ ہو گئے اور جو بھاگنے کے قابل ہی نہ تھے، وہ گمنامی کے غاروں اور پہاڑوں میں بیٹھ رہے۔ زبان قومی کی حفاظت کون کرتا؟ علوم، فنون، کتابیں اور علمی سامان جو یونان سے پہلو مارتے تھے۔ اس طرح فنا ہوئے کہ نام و نشان تک نیست و نابود ہو گئے۔ پھر جو علم، ادب اور شائستگی نے رونق پھیلائی۔ وہ علما اور شرفائے عرب سے پھیلی، یا ان نو مسلموں سے جنھوں نے عربیت اور اسلام کا جامہ پہن لیا تھا اور اسی کو فخر سمجھتے تھے۔ اقبال سلطنت ایک ایسی برکت ہے کہ جس قوم کے ماتھے کو لگ جاتا ہے۔ اس کی ہر چیز بلکہ بات بات دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ہزاروں فارسی کے لفظ گم ہو کر فنا ہو گئے۔ ہزاروں رہے، مگر بے رغبتی کے سبب بے رواج ہو کر متروک ہو گئے۔

بہت سے نئے الفاظ ہیں کہ سلاطینِ چغتائی کے عہد میں اشیائے مختلفہ کے لیے ہندوسان کے اہل انشا یا دربار کے اراکین نے پیدا کیے۔ یہاں کی معتبر تاریخوں میں مسلسل ہیں اور ان شعرا کے کلاموں میں منظوم ہیں، جو کہ ہندوستان میں تھے یا آئے اور رہ کر چلے گئے۔

رسد جن معنوں میں بولتے ہیں ایران میں کہو تو کوئی نہ سمجھے گا۔ وہاں سورسات کہتے ہیں۔

منشی ایران میں کسی کو کہیں تو اس کے لفظی معنی (یعنی انشا پرداز) سمجھے جائیں گے اور بس۔ جسے یہاں منشی کہتے ہیں۔ وہاں اسے میرزا کہتے ہیں۔

تمسک ہندوستان میں جن معنوں میں متعارف ہے ایران میں کہیں تو کوئی نہ سمجھے گا۔

رسید یہاں قبض الوصول کو کہتے ہیں۔ ایران میں کہیں تو کوئی نہیں سمجھتا۔

گاؤتکیہ ہندوستانی فارسی ہے ایران میں متکا کہتے ہیں

روشنائی لکھنے کی سیاہی کو کہیں تو کوئی ایرانی نہیں سمجھتا۔ وہ مرکب کہتے ہیں۔

دست پناہ ہندوستانی فارسی ہے۔ وہاں آتش گیر کہتے ہیں۔

مالیدہ یا **ملیدہ** ہندوستان میں کہتے ہیں۔ وہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ وہ چنگالی کہتے ہیں۔

تہذیب کے معنی لغت میں ہیں پاک کردن۔ اصلاح کردن۔ اب سولزیشن کے معانی کی ہیئت مجموعی جو کچھ ہے تمھارے ذہن میں ہے اور یہ خیال بھی انگریزی سے ہماری زبان میں آیا ہے۔ تم خود غور کر کے دیکھو! جن جن معنوں کی رعایت سے آج لفظ تہذیب بولا جاتا ہے اور اس میں کوٹ، پتلون اور پھندنے دار ٹوپی بھی شامل ہے۔ وہ حقیقی معنوں سے کس قدر علیحدہ ہیں۔ یہ خیال اور یہ لفظ دونوں ہماری آنکھوں کے سامنے پیدا ہوئے ہیں اور یہی حالت ہے شائستگی کی۔

تعلیم یافتہ کے لفظی معنی تم جانتے ہو۔ انگریزی میں جسے ایجوکیٹڈ کہتے ہیں۔ اب ہم اسے تعلیم یافتہ کہتے ہیں۔ لیکن اس میں کئی صفتیں اور مقصود ہوگئی ہیں۔ جن میں شرافت کی بربادی اور کوٹ پتلون کی فرضیت لازم کی گئی ہے۔ جو تعلیم یافتہ کے اصلی معنوں سے بالکل الگ ہیں۔ یہ خیال انگریزی سے آیا اور حال ہی میں یہ لفظ بھی اس کے لیے نامزد ہوا۔

بلند نظری کے لفظی معنی ظاہر ہیں لیکن حال کی تحریروں اور انگریزی کے ترجموں میں بلند نظر ایسے عالی دماغ، ہمت والے شخص کو کہتے ہیں کہ کوئی بلند رتبہ اور عمدہ حالت اس کی خاطر میں نہ آئے۔ ہمیشہ ترقی کا طالب رہے اور اس کی تحصیل میں کسی خطرناک تدبیر سے اندیشہ نہ کرے یہ لفظ بھی تیس چالیس برس سے پیدا ہوا ہے۔

عزت طلب میں یہ لفظ عالم طفولیت میں اکثر شرفا کے باب میں سنا کرتا تھا جو شخص کہ سامان، لباس، اخلاق، اطوار، عادات اور معاشرت احباب میں ہمیشہ ایسی حالت کے ساتھ رہے جس سے حکام اور خاص و عام اس کے ساتھ بہ عزت پیش آئیں۔ اسے تعریف کے ساتھ کہتے تھے کہ فلاں شخص عزت طلب آدمی ہے۔ لفظ مذکور تحریر میں داخل نہ تھا۔ اب مدت سے متروک ہے۔ ہم سے کچھ پہلے پیدا ہوا اور ہمارے سامنے مرگیا۔

وضعدار بھی ایسے ہی شخص کو کہتے تھے اور تہذیب انگریزی سے پہلے یہ الفاظ شرفا کے لیے تعریف میں داخل تھے کہ پابندیِ وضع لازمۂ شرافت تھی۔ دلی میں اب بھی وضعداری سے **بانکپن** اور **حسن** مراد لیتے ہیں۔

اخبار جس صورت سے اب جاری ہیں پہلے یہ صورت ہی نہ تھی۔ اسی واسطے اس کے لیے نام بھی نہ تھا۔ یہ لفظ ان معنوں کے ساتھ ہندستان میں بھی اب پیدا ہوا اور یہ ظاہر ہے کہ اخبار جمع خبر کی ہے اور بس۔ اہل ایران نے اس کے لیے روزنامہ یا خبرنامہ پیدا کیا اور یہ مناسب تر ہے۔

صاحب لوگ عرب میں صاحب بمعنی ہم صحبت ہے۔ پھر اور لفظوں کے ساتھ مل کر فاعلیت کے معنی پیدا کرنے لگا۔ مثلاً صاحب الصولۃ، والملک والدولۃ، فارس میں آکر صاحبِ ملک، صاحب دولت، صاحبِ مال رہا۔ ہندستان میں آکر لفظ تعظیمی ہوا۔ میر صاحب، مرزا صاحب، نواب صاحب، اسی نوے برس سے صاحبان انگریز کے نام کا جزو ہوگیا۔ پھر جو کمپنیہ سے کمپنہ کرشان ہو، وہی صاحب لوگ ہوگیا۔

کوٹھی ہندوستان میں صاحب لوگ لباس تجارت میں آئے تھے۔ چونکہ تاجروں کا رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین تاجروں ہی سے ہوتا تھا۔ اوّل اوّل معاملات بھی بنگالہ کے تاجروں اور مہاجنوں سے ہوتے ہوں گے۔ عالم مسافرت میں انھیں نوکر چاکر درکار ہوئے ہوں گے۔ وہ بھی انھیں سے لیے ہوں گے۔ عالیشان مہاجنوں اور سوداگروں کی دکانوں کو کوٹھی کہتے ہیں۔ چونکہ صاحب لوگ لباس تجارت میں تھے۔ جب کسی سے ملتے جلتے ہوں گے کوٹھی پر جاکر ملتے ہوں، وہ پوچھتے ہوں گے، آپ کی کوٹھی کہاں ہے۔ یہ پتہ دیتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ کوٹھی گھر کو کہتے ہیں۔ کیونکہ مسافر تھے۔ ان کی دکان اور کوٹھی ایک ہی تھی۔ ان کے نوکر بھی کوٹھی ہی کہتے ہوں گے۔ کام کے موقع پر آپ کہتے ہوں گے۔ یہ چیز ہماری کوٹھی پر لے آؤ اور لوگ کہتے ہوں گے جاؤ، یہ چیز صاحب کی کوٹھی پر دے آؤ۔ مدت کے بعد تجارت کا پردہ۔ اٹھا دیا۔ وہی گھر دارالحکومت ہوگئے۔ جب سے کوٹھی کا نام جو محاورہ میں آگیا تھا۔ وہی رہا اور یہ نیک نیتی کا پھل ہے۔

چٹھی بنگالہ کے ہندو مسلمان خط کو چٹھی کہتے ہیں۔ ابتدا میں جب کوئی صاحب لوگوں کو کچھ لکھتا ہوگا۔ نوکر آکر کہتا ہوگا۔ صاحب یہ چٹھی آئی ہے۔ یہ بھیجتے ہوں گے تو کہتے ہوں گے۔ یہ چٹھی فلانے مہاجن کو دے آؤ۔ ان سے باتیں کرتے ہوں گے تو بھی چٹھی ہی کا لفظ محاورہ میں آتا ہوگا۔ صاحب لوگ اردو اور ہندی کے محاورہ سے واقف نہ تھے۔ چٹھی ہی کہتے رہے۔ آگے کے شہروں میں بڑھے۔ پھر بھی جو لفظ محاورہ میں آگیا تھا، اسی طرح رہا۔ یہاں تک کہ اب انگریزوں کے خطوط اور ہر انگریزی خط کو چٹھی کہتے ہیں۔

بڑا دن دسمبر کی 25 تاریخ کو بڑا دن کہتے ہیں۔ حالانکہ برس کا سب سے بڑا دن یہ نہیں۔ البتہ 25 سے دن بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ لیکن محاورہ میں یہی نام ہوگیا۔ جب کہتے ہیں سب سمجھ جاتے ہیں۔ ایسے ایسے ہزاروں لفظ ہیں کہاں کہاں تک لکھوں۔

■

ماخذ: سخن دانِ فارس: محمد حسین آزاد، **سنہ اشاعت** پہلا: اترپردیش اردو اکادمی ایڈیشن: 1986، پہلا قومی اردو کونسل ایڈیشن: 2005، **ناشر**: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مراٹھی کہانی

باؤلا

مصنف: جی اے کلکرنی

ترجمہ: سلام بن رزاق

جی اے کلکرنی—ایک تعارف

جی اے کلکرنی مراٹھی افسانے کا ایسا روشن نام ھے جس پر ماہ و سال کی گرد اثرانداز نہیں‌ہوتی۔ جی اے کلکرنی کا پورا نام شری گروناتھ آباجی کلکرنی تھا۔ البتہ وہ اپنے قارئین کے حلقے میں صرف جی اے کے مختصر نام سے جانے جاتے تھے۔

جی اے کا جنم 10 جولائی 1924 کو ہوا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں اور اعلیٰ تعلیم بیلگام میں ہوئی۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد قلیل عرصے کے لیے انھوں نے ممبئی میں ملازمت کی اور بعد میں دھارواڑ کے جے ایس ایس کالج میں انگریزی کے اُستاد کی حیثیت سے قریب چالیس سال تک تدریس کے فرائض انجام دیتے رھے۔ جی اے کلکرنی کے تخلیقی سفر کا آغاز 1955 سے شروع ہوتا ھے۔ انھوں نے5 195 سے 1977 یعنی بیس بائیس برس کے درمیان سو کے قریب کھانیاں لکھیں۔ یہ بیس برس مراٹھی افسانے میں صرف جی اے کے نام سے منسوب کیے جاسکتے ھیں۔ اگر ان بیس برس میں لکھے گئے مراٹھی کے تمام افسانوی ادب کو دریا برد کردیا جائے اور صرف جی اے کی کھانیاں بچا لی جائیں تب بھی مراٹھی افسانے کے تسلسل اور ارتقا میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ جی اے مراٹھی کے واحد افسانہ نگار ھیں جنھوں نے اپنی کھانی کا اُفق خود دریافت کیا۔ وہ نہ صرف اسلوب کے اعتبار سے منفرد ھیں بلکہ ڈکشن اور موضوعات کے انتخاب میں بھی لاثانی ھیں۔ جی اے نے مراٹھی افسانے کو فلسفیانہ بصیرت اور زندگی کے گھرے ادراک کے ساتھ ایک ایسی معنوی جھت عطا کی ھے جس کی نظیر اس سے پھلے یا بعد میں مراٹھی افسانے میں نھیں ملتی۔ سحر کارانہ واقعاتی رچاؤ، ماورائی فضاسازی، استعاروں اور علامتوں کا خلاقانہ استعمال اور سب سے بڑھ کر افراط و تفریط سے پاک ان کا دلکش اسلوب اور بیان کی جادو آفرینی ان کے ھر افسانے کو فکشن کا نادرالمثال شہ پارہ بنا دیتی ھے۔

جی اے بنیادی طور پر ایک کھانی کار تھے۔ اُنھوں نے کھانی اُسی انھماک اور محویت کے ساتھ لکھی جیسے کوئی تپسوی مکتی پانے کے لیے تپسیا کرتا ھے۔ انھو ں نے کوئی ناول نھیں لکھا مگر اپنی ھر کھانی کو نہ صرف ناول کی سی وسعت اور شاعری کی سی گھرائی عطا کی بلکہ مراٹھی کھانی کے سابقہ میلانات اور رجحانات کے طاقتور عناصر کو اپنے دامن میں جذب کرکے کھانی کی معنوی جھتو ں کو وسیع تر کردیا۔

10 دسمبر 1987 کو پونے میں خون کے کینسر سے اس نابغہ افسانہ نگار کا سورگ باس ھوگیا۔ ان کی کھانیوں نے مراٹھی افسانے کو ایسی سربلندی عطا کی ھے جس کی مثال ھندوستانی ھی کیا بیشتر بیرونی زبان کے افسانوی ادب میں بھی شاذ و نادر ھی ملتی ھے۔

اُن کے انتقال کو پچیس برس کا عرصہ ھوگیا مگر آج بھی مراٹھی ادب کے ناقدین ان کے افسانوں کی نئی نئی تعبیریں تلاش کرنے میں سرگرداں نظر آتے ھیں۔

جی اے کی بعض کھانیوں میں جانور اور پرندے کرداروں کی صورت میں آتے ھیں۔ انھوں نے جانوروں کے حوالے سے انسانوں کے باطن کو کھنگالنے کی کوشش کی ھے۔

زیرنظر کھانی 'باولا' میں بھی اس کی جھلک موجود ھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ھے کہ جب بھی کوئی صاحب نظر پیدا ھوتا ھے سماج میں اس کی مخالفت ھوتی ھے۔ اس کھانی میں یھی کتے انسانی کج فھمی فرسودگی اور بربریت کا اشاریہ ھیں جب کہ نوجوان کو روشن خیالی اور روشن ضمیری کی علامت تصور کیا جاسکتا ھے۔

وہ ایک چلچلاتی دوپہر کو شمشان گھاٹ میں داخل ہوا۔ راستے کی دھول پر اس کے قدموں کے نشان دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ گاؤں پیچھے رہ گیا تھا۔ شمشان گھاٹ کے گرد گھنی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ وہ ہانپتا لڑکھڑاتا ان کی چھاؤں میں آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک ستاتا رہا۔ پھر جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا، کاغذ پر وقفے وقفے سے جھک کر کچھ لکھتا رہا۔ شمشان گھاٹ کسی دیو کی غضبناک آنکھ کی طرح جل رہا تھا۔ جھاڑیاں ہولے ہولے سرسرا رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی پرند کی پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دے جاتی۔ درختوں پر نئی کونپلیں شمع کی ساکت لو کی طرح تنی کھڑی تھیں۔ ان کی گہری ٹھنڈی چھاؤں زمین پر پسری ہوئی تھی اور وہ اس چھاؤں میں لیٹا، رہ رہ کر کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کا لباس میلا چیکٹ ہو رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال اس کی گردن تک بڑھ آئے تھے۔ حلیے سے وہ ایک مفلس شکستہ حال شخص لگ رہا تھا مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت تھی۔ ایک ایسی طمانیت جو ہمیشہ خوابوں میں ڈوبے رہنے والے شخص کے چہرے پر ہوتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر سے پرزے پر کچھ لکھتا لکھ کر چند لمحوں تک ان لفظوں پر غور کرتا اور پھر یک سرخوشی کے عالم میں گنگنانے لگتا۔ اس کی آواز سے دبے دبے جوش کا اظہار ہوتا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے شمشان کے سکون میں دراڑ سی پڑنے لگی.. شمشان کے پاس بنی ویران شکستہ جھونپڑی سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک دو دو کرکے کتنے ہی کتے جھونپڑی سے نکل میدان میں جمع ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد میں

اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اب وہ علی الاعلان اجنبی کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنے لگے۔ ان کے جبڑے کھلتے اور تیز نکیلے دانتوں کی لمبی قطار کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی۔ لگتا ان کے بھونکنے کی آوازیں ان کے دانتوں کے شگافوں سے پھوٹ رہی ہیں۔ ان کا بے پناہ غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جارہا تھا۔ اس جھنڈ میں ایک بلند قامت سیاہ کتے نے اپنی خونخوار آنکھیں اجنبی کے چہرے پر گاڑتے ہوئے غرا کر کہا:

''عجیب آدمی ہے یہ، ایسی چلچلاتی دھوپ میں شمشان میں کیا کررہا ہے؟''

''تِس پر مزے سے گا بھی رہا ہے۔'' ایک پستہ قد کتے نے لقمہ دیا۔

اس بلند قامت سیاہ کتے کو اس کا درمیان میں یوں لقمہ دینا پسند نہ آیا اور اس نے 'عف' کرکے اپنے نکیلے دانت اس کی گردن میں پیوست کردیے اور اسے ہوا میں اچھال کو دور پھینک دیا۔ دیگر کتوں نے بیک آواز بھونک کراسی کی 'جے جے کار' کا نعرہ لگایا پھر اس سیاہ فام کتے نے اس جملے کو اس طرح دہرایا جیسے وہ جملہ اس کی اختراع ہو۔

''تِس پر مزے سے گا بھی رہا ہے..''

اجنبی کتوں کی زبان سے تو نابلد تھا۔ لیکن اسے زخمی کتے کی حالتِ زار پر ترس آگیا۔ اس نے اپنی جیب میں پڑی سوکھی پاؤ روٹی کا ایک ٹکڑا نکالا اور پچکار کر اس کتے کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن اس کے یوں جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے ہی کتوں میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور وہ سب ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر دھول اور مٹی میں تڑپتے اس پستہ قد زخمی کتے کو گود میں اٹھالیا۔ اس کی گردن پر ایک گہرا زخم تھا جس سے خون رس رہا تھا۔ اس نے اس کے زخم کو باندھنے کے لیے جیب سے رومال نکالا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے زخم پر رومال باندھتا کتے نے اپنے تیز دانت اس کی کلائی میں گاڑ دیے اور تڑپ کر اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ پھر بے تحاشا گرتا پڑتا بھاگا اور ہانپتا ہوا اپنے جھنڈ میں شامل ہوگیا۔

بلند قامت کالے کتے کی آنکھیں اور بھی سرخ ہوگئیں۔ اس کے منہ سے کف نکلنے لگا وہ زور سے بھونکا۔

''یہ آدمی باؤلا ہوگیا ہے۔''

''ہاں! یہ آدمی باؤلا ہوگیا ہے۔''

دوسرے کتوں نے اس کے سر میں سر ملایا۔

''یہ ہمیں ٹھوکر مارنے کی بجائے روٹی دیتا ہے۔''

''دوسرے لوگ ہمیں دھتکارتے ہیں، یہ پیار کرتا ہے۔ گود میں اٹھا کر پچکارتا ہے۔ یہ آدمی دوسرے آدمیوں جیسا نہیں ہے ... یہ باؤلا ہوگیا ہے۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی کتوں کے جبڑے عجیب وحشیانہ انداز میں وا ہوگئے۔ مگر وہ سب اجنبی سے بری طرح خوف زدہ تھے۔ گویا اس کے صرف ایک لمس ہی سے ان کی موت واقع ہوجائے گی۔ دھونکنی کی طرح پھولتی پچکتی ان کی ہڈیاں کمانوں کی طرح تن گئیں۔ وہ کالا کتا کسی رینگتے سائے کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھا۔ دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ان کی آنکھیں اجنبی پر گڑی ہوئی تھیں اور ان کی سرخ باچھوں سے رال ٹپک رہی تھی۔ قریب پہنچ کر کالے کتے نے یک بیک آدمی پر چھلانگ لگادی اور اپنے تیز سلسلاتے دانت اس کی گردن میں پیوست کردیے۔ اس کی تقلید میں دوسرے کتے بھی آدمی پر ٹوٹ پڑے۔ چند لمحوں تک غضب ناک غراہٹوں سے دوپہر کا سناٹا کانپتا رہا اور آدمی کتوں میں جھپ کر رہ گیا۔ گھنی جھاڑیوں سے دو چار پرند پھڑ پھڑا کر اڑے۔ تھوڑی دیر بعد تمام کتے ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ آدمی بے حس و حرکت پڑا تھا اور اس کے نیچے کی زمین سرخ ہورہی تھی۔ کاغذ کا پرزہ ہوا سے اڑ کر ایک جھاڑی میں پھنسا پھڑ پھڑا رہا تھا۔ زخمی کتے نے پاس ہی پڑے دھول میں سے پاؤ روٹی کے ٹکڑے کو چپکے سے منہ میں دبا کر ایک طرف کو کھسک جانا چاہا۔ تبھی وہ قد آور کتا جانے کہاں سے ایک بار پھر اس پر جھپٹا اور اس کے تیز نکیلے دانت دوبارہ اس کی گردن میں پیوست ہوگئے۔ پستہ قد کتے کے جبڑے سے پاؤ روٹی کا ٹکڑا چھٹک کر دور جا گرا اور وہ ایک بار پھر دھول اور مٹی میں لوٹتا ہوا کیو کیو کرنے لگا۔ کالے کتے نے جھپٹ کر پاؤ روٹی کے ٹکڑے کو اپنے مضبوط جبڑے کی گرفت میں لے لیا اور ایک طرف کو چل دیا۔

اب پیڑوں کے پتوں سے پیدا ہوتی اداس سرسراہٹ کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ کہیں کہیں ایک آدھ پرند کی پھڑ پھڑاہٹ ضرور سنائی دے جاتی۔ درختوں کی نئی کونپلیں شمع کی ساکت لوؤں کی طرح تنی کھڑی تھیں اور زمین پر آدمی کی خون آلود لاش اس جلتی دوپہر میں یوں لگ رہی تھی جیسے کسی دودھیا گرم بدن پر تازہ رستا ہوا زخم۔

■

Salam bin Razak, B-603, New Aakaar CHS, Opp. Haidary Masjid, Naya Nagar, Mira Road (E), Dist. Thane - 401 107
Contact : +91 9967330204

آن لائن اردو صحافت اور روزگار کے مواقع

سلمان فیصل

اکیسویں صدی یعنی سائنس و ٹیکنالوجی کی اس صدی میں جدید تیز رفتار ٹیکنالوجی نے کل جہان آب وگل کی وسعت کو سمیٹ کر ایک مختصر سے کیبن میں مقید کر دیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہے انٹرنیٹ کی آمد، جو لوگوں کو ایک زنجیر میں باندھ کر ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے کی سہولت عطا کرتا ہے۔ انٹرنیٹ سے connect ہونا دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچنے کے مترادف ہے۔ انٹرنیٹ کے کیا فوائد ہیں اور کیا نقصانات، ہر تعلیم یافتہ شخص اس سے بخوبی واقف ہے۔ اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک کسی بھی شکل میں پہنچانے کے ذرائع انسانی زندگی کے جزو لاینفک ہیں۔ اس کائنات کی ابتدا ہی سے انسان اپنے احساسات و خیالات کو مختلف شکلوں میں دوسروں تک پہنچاتا رہا ہے۔ ہر دور میں انسانی ذہنوں نے مختلف قسم کے ذرائع ابلاغ ایجاد کیے ہیں۔ ان ذرائع ابلاغ نے صحافت کی راہ ہموار کی۔ پریس کی ایجاد سے مطبوعہ صحافت کا دائرہ وسیع ہوا۔ اخبارات و رسائل کی کثرت طباعت نے میدان صحافت میں ایک انقلاب پیدا کیا جس کے نتیجے میں معاشرے میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مطبوعہ صحافت کے اثرات سماج پر مرتب ہو رہے تھے کہ پھر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجاد نے صحافت کو ترقی کی راہ پر بہت آگے پہنچا دیا اور پرنٹ کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا بھی اس کے ہم قدم بلکہ اس سے دو قدم آگے نظر آنے لگا۔ اب انٹرنیٹ ٹیکنالوجی کے وجود میں آنے کے بعد سے حالیہ دہائی کے دوران صحافت کی دنیا میں انقلاب آیا اور آن لائن صحافت کا آغاز ہوا۔

انٹرنیٹ بھی میڈیا کا ایک حصہ ہے لہٰذا میڈیا پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور آن لائن صحافت یا آن لائن جرنلزم کی شروعات ہوئی اور اس کا دائرہ بھی کافی وسیع ہوا ہے۔ آج دنیا بھر میں بے شمار آن لائن اخبارات و رسائل ہماری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے موجود ہیں۔ جس طرح اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن مطبوعہ صحافت کے میدان میں اپنے کارنامے انجام دے رہے ہیں اسی طرح آن لائن صحافت بھی فی الوقت اپنے عروج پر ہے۔ آن لائن صحافت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی تنگ نظری آن لائن جرنلزم میں کم نظر آتی ہے۔ اس شعبہ صحافت سے وابستہ لوگوں کی سوچ کافی کھلی ہوئی اور لبرل ہے۔ اس میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور مخالف نقطہ نظر کے لیے بہت حد تک گنجائش بھی ہے۔ مخالفین کی آرا کو بھی مناسب انداز سے جگہ دی جاتی ہے۔

انٹرنیٹ جاننے اور اس پر کام کرنے کے لیے اب انگریزی زبان سے واقفیت زیادہ ضروری نہیں۔ اب کئی ہندوستانی زبانیں بھی انٹرنیٹ پر آ گئی ہیں۔ چند سال قبل تک جو لوگ انٹرنیٹ سے گھبراتے تھے، اب اس پر کام کرنے لگے ہیں۔ وہ ای پیپرس کا مطالعہ کرتے ہیں، ای میل بھیجتے اور وصول کرتے ہیں، بلاگ لکھتے ہیں اور اپنی زبانوں میں ویب سائٹ لانچ کر رہے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دو امریکی کمپنیوں مائکروسافٹ اور گوگل نے اسے ممکن کر دکھایا ہے۔ ایک دہائی قبل تک انٹرنیٹ پر ہندوستانی زبانوں کے استعمال میں بہت دشواریاں تھیں۔ فونٹس اور 'کی بورڈ' یکساں نہیں تھے۔ جس کی وجہ سے کسی بھی ہندوستانی زبان کا استعمال انٹرنیٹ پر آسان نہیں تھا۔ لیکن ہندی اور اردو کے لیے یونی کوڈ سپورٹ کی ایجاد نے سب کچھ بدل دیا ہے اور اب یہ سارا مرحلہ بہت آسان ہو گیا ہے۔

اردو صحافت کی بات کی جائے تو اس نے بھی انٹرنیٹ کی دنیا میں اپنے قدم جما لیے ہیں۔ انٹرنیٹ پر اردو کے استعمال نے اردو صحافیوں کو آن لائن صحافت کی طرف متوجہ کیا اور اردو زبان میں بھی آن لائن صحافت کا آغاز ہوا اور اس وقت بے شمار ویب سائٹیں آن لائن اردو صحافت میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ان میں اُن ویب سائٹس کی تعداد زیادہ ہے جو اخبارات و رسائل پرنٹ میں بھی شائع ہو رہے ہیں جیسے راشٹریہ سہارا، انقلاب، منصف، سیاست، اردو ٹائمز، صحافت، دی سنڈے انڈین وغیرہ وغیرہ۔ یہ اخبارات اور رسائل آن لائن بھی موجود ہیں اور روز اپ ڈیٹ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی کئی ویب سائٹس ہیں جن پر مطبوعہ اخبارات و رسائل کے علاوہ بھی آن لائن خبریں، مضامین، کالم، فیچر، کمنٹ کی شکل میں مراسلے اور اشتہارات وغیرہ بھی پوسٹ کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً خبریں دن میں کئی مرتبہ اپ ڈیٹ ہوتی رہتی ہیں۔

آج دنیا کے متعدد ملکوں سے اردو اخبار اور رسالے شائع ہو رہے ہیں اور ان میں سے بیشتر آن لائن بھی ہیں۔ اس وقت امریکہ کا سب سے بڑا اخبار ہفت روزہ اردو ٹائمز ہے جو کئی شہروں سے نکل رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکہ میں اردو اخبارات اشتہاروں سے اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں اور مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ سید تقی عابدی کے مطابق آج سے تقریباً چالیس سال قبل امریکہ سے اردو کا پہلا اخبار شائع ہوا تھا۔ وہ دو وَرقی تھا اور اس کا نام کریسنٹ تھا۔ اس کے مالک و مدیر ڈاکٹر مظفر شکوہ تھے۔ انھوں نے چالیس یا پچاس کاپیاں نکالی تھیں۔ جبکہ اردو ٹائمز کے مالک، مدیر اور سرپرست خلیل الرحمان ہیں۔ انھوں نے بھی بہت عسرت میں یہ اخبار شروع کیا تھا۔ لیکن آج اس نے بہت ترقی کر لی ہے اور اس کو آن لائن ایڈیشن شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اردو ٹائمز ڈاٹ کام نہ صرف مطبوعہ اخبار کی آن لائن فراہمی کو ممکن بنا رہا ہے بلکہ بہت سی دوسری خبروں اور معلومات کو بھی جن کا اردو قارئین کو مکمل علم نہیں ہو سکتا، پیش کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اردو ٹائمز ڈاٹ کام اگرچہ کوئی کمیونٹی سائٹ نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کا نصب العین اردو پڑھنے والوں کو بالعموم اور امریکن کمیونٹی

کو بالخصوص ان تمام بین الاقوامی موضوعات سے آگاہ کرنا ہے جو کسی نہ کسی طرح یا تو کمیونٹی سے متعلق ہیں یا جن کا علم کمیونٹی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے۔ اردو ٹائمز ڈاٹ کام کا اصل مقصد تو تازہ ترین خبروں کی فراہمی ہے چاہے وہ کسی بھی شعبہ زندگی سے تعلق رکھتی ہوں لیکن اپنے پڑھنے والوں کو جدید مسائل پر جاری بحثوں سے مطلع رکھنا اور ان بحثوں پر قارئین کی آرا کو ایک دوسرے تک پہنچانا بھی اس کی ترجیحات میں شامل ہے۔ اردو ٹائمز ڈاٹ کام ہر عمر اور ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایسی سائٹ ہے جو نہ صرف ان سب کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے بلکہ ایک دوسرے کی بہتر سمجھ بوجھ اور ان کے خیالات کو ایک دوسرے تک پہنچانے میں بھی اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ اس اخبار کی مانند دوسرے ملکوں سے بھی متعدد ایسے اخبار شائع ہوتے ہیں جو آن لائن بھی دستیاب ہیں۔ یہ تو صرف ایک مثال تھی۔ ایسی کئی سائٹس موجود ہیں جنھیں انٹرنیٹ پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح ایسے کئی ریڈیو اسٹیشن اور نیوز چینل ہیں جو اردو میں خبریں نشر کرتے ہیں۔ ان کی سائٹس اردو زبان میں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً بی بی سی، وائس آف امریکہ، ریڈیو جرمنی وغیرہ۔ ان کی سائٹس پر اردو زبان میں خبریں، کالم، مضامین، فیچر اور تحقیقی مضامین بھی ہوتے ہیں۔ ان سائٹس کی دنیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی دنیا سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایسی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس ہیں جن پر صحافت کی جھلک نظر آتی ہے اور ان پر اردو زبان میں بھی بہت کچھ لکھا جارہا ہے مثلاً فیس بک، آرکٹ، ہائی فائیو وغیرہ۔

صحافت کی ایک منفرد نوع بلاگ نویسی نے بھی صحافت کی دنیا میں اپنا ایک الگ مقام بنا لیا ہے۔ ایک طرح سے بلاگ، ویب سائٹ کا ہی حصہ ہوتا ہے جس پر کسی فرد کی جانب سے پابندی کے ساتھ خیالات، احساسات، واقعات وغیرہ متن یا متن کے ساتھ ساتھ سمعی و بصری صورتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ بلاگ نویسی کے میدان پر اگر طائرانہ نظر دوڑائی جائے تو مختلف قسم کے بلاگ نظر آئیں گے مثلاً ذاتی بلاگ جس میں ایک فرد اپنے خیالات اور اپنے تبصرے نیز دیگر چیزیں نیٹ صارفین کے سامنے پیش کرتا ہے گرچہ اس کے بلاگ کو پڑھنے والے خال خال ہی ہوں لیکن وہ ایک ذاتی ڈائری کی طرح خامہ فرسائی کرتا رہتا ہے۔ تجارتی مقصد کے تحت بھی بلاگ لکھے جاتے ہیں جس کے ذریعے ایک کمپنی اپنے پروڈکٹ کی مارکٹنگ اور Branding کرتی ہے اور اپنے صارفین و دیگر عوام سے تعلقات استوار رکھنا چاہتی ہے۔ اسی طرح بلاگ موضوعاتی بھی ہوتے ہیں جیسے مذہبی، سیاسی، تعلیمی بلاگ، فیشن بلاگ، میوزک بلاگ وغیرہ وغیرہ۔ بلاگ نویسی کی یہ خاصیت ہے کہ کوئی بھی شخص کسی بھی موضوع کے تحت بلاگ نویسی کرسکتا ہے اور الگ الگ موضوعات پر الگ الگ بلاگ پیش کرسکتا ہے۔ اردو زبان کے حوالے سے اگر بلاگ نویسی کا جائزہ لیا جائے تو اردو زبان میں اور اردو زبان کے تعلق سے بھی سیکڑوں بلاگ اپنی جانب متوجہ کرتے نظر آئیں گے۔ بعض بلاگ تو ایسے ہیں جو اردو زبان و ادب سے متعلق ہیں مگر وہ انگریزی زبان میں ہیں یا اردو زبان میں انگریزی حروف اور انگریزی رسم الخط میں ہیں۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان نے بھی انٹرنیٹ کی دنیا میں اپنی جگہ اور شناخت قائم کرلی ہے اور بتدریج اس کا دائرہ مزید بڑھتا جارہا ہے اور اردو رسم الخط میں اپنے ہاتھ پیر پھیلا رہی ہے۔ لہٰذا بلاگ نویسی میں بھی انگریزی حروف اور رسم الخط میں اردو زبان کے ساتھ ساتھ اردو رسم الخط میں بھی بلاگ لکھے جارہے ہیں۔ اردو زبان میں بلاگ لکھنے کے لیے یونی کوڈ فونٹ کی مدد لی جاتی ہے جو ہر کمپیوٹر پر آسانی سے دستیاب ہوتا ہے اور ہر جگہ accessable ہوتا ہے۔ اردو زبان میں ایسے بہت سارے برقی اخبار اور سائل و جرائد ہیں جن کی ویب سائٹس پر اردو زبان میں بلاگ پڑھے اور لکھے جاسکتے ہیں۔ واضح رہے کہ اردو زبان میں بلاگ لکھنے کے لیے ویب سائٹ کا اردو زبان میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ کسی بھی زبان میں موجود ویب سائٹ پر اگر بلاگ لکھنے کی سہولت مہیا ہے تو اس ویب سائٹ پر اردو زبان میں یونیکوڈ فونٹ کا استعمال کرکے بلاگ لکھے جاسکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ صارف کے کمپیوٹر میں اردو کی بورڈ موجود ہو جو Language & Date Setting Tool کے ذریعے Instal کیا جاسکتا ہے۔

آن لائن اردو صحافت کو تجارتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے اور اس میدان میں روزگار کے مواقع تلاش کیے جائیں تو یہاں بھی منافع کا سودہ ہے۔ اس میدان میں بھی اردو صحافیوں کے لیے مواقع میسر آئیں گے گرچہ وہ کم ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ آن لائن اردو صحافت میں بیشتر وہ سائٹیں ہیں جن کی مطبوعہ صحافت پہلے سے موجود ہے اور آن لائن صحافت میں بھی انھیں صحافیوں سے کام لیا جارہا ہے۔ پرنٹ کے لیے تیار ہونے والا مواد ہی ویب سائٹ پر اَپ لوڈ کردیا جاتا ہے۔ اور اس طرح ویب سائٹ کے لیے الگ سے اسٹاف کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ ویب سائٹ پر اس اخبار یا رسالے کو پوسٹ کرنے کے لیے صرف ایک یا دو اسٹاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی اگر دیکھا جائے تو اس میں بھی روزگار کے مواقع ضرور ملیں گے۔ خصوصی طور پر ان صحافیوں کو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ سائٹس جن پر صرف ای۔ پیپرز ہی نہیں پوسٹ ہوتے بلکہ اس کے علاوہ بھی چیزیں اس سائٹ پر موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح کی سائٹ کے لیے کئی اسٹاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں خبریں، کالم، اشتہار، فیچر اور مضامین وغیرہ کافی مقدار میں ہوتے ہیں اور اپ ڈیٹ ہوتے رہتے ہیں۔

روزنامہ اخباروں کی ویب سائٹ پر تازہ ترین خبریں اپ ڈیٹ کی جاتی ہیں جس کے لیے الگ سے اسٹاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ان اخباروں کو ویب سائٹ پر ڈالنے کے لیے بھی اضافی کارکنوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کام وہی لوگ کرسکتے ہیں جو کمپیوٹر کا علم رکھتے ہوں اور خبریں اور مضامین اپ لوڈ کرنے کا فن جن کو آتا ہو۔ مستقبل میں آن لائن صحافت کا کیریئر بہت روشن ہے۔ جو لوگ کمپیوٹر جانتے ہوں وہ اس میدان میں کافی آگے جاسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ای میل صحافت کو بھی اہمیت حاصل ہوتی جارہی ہے۔ یعنی کوئی بھی رپورٹر کسی بھی شخص سے ای میل کے ذریعے انٹرویو کرسکتا ہے۔ اور پھر اس انٹرویو کو رپورٹ کی شکل میں یا انٹرویو ہی کی شکل میں ویب سائٹ پر پوسٹ کردیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر آن لائن صحافت کا دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اگر اخباروں کے آن لائن ہونے کا سلسلہ اور آن لائن اخبار نکالنے کا شوق اسی طرح پروان چڑھتا رہا تو کوئی تعجب نہیں کہ آن لائن اخباروں اور رسالوں کی تعداد مطبوعہ اخباروں اور رسالوں کے برابر ہوجائے یا ان سے بھی بڑھ جائے۔ حالانکہ یہ بات ابھی دور از کار لگتی ہے لیکن جس طرح انفارمیشن ٹیکنالوجی مسلسل مائل بہ ترقی ہے اس کی روشنی میں یہ کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے۔ اس جائزے کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ مطبوعہ صحافت کی مانند آن لائن صحافت میں بھی روزگار کے مواقع موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مواقع کو تلاش کیا جائے اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

■

Salman Faisal, 370/6A, Zakir Nagar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

عزیز احمد

ہندوستانی سنیما اور اردو

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے جولائی 2012 کے شمارے میں نصرت ظہیر کا تحریک پیدا کرنے والا تخلیقی مضمون 'ہندوستانی سنیما: جسے اردو نے بولنا سکھایا' شائع ہوا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں اردو کے تعلق سے جتنے تحقیقی اور معتبر مضامین لکھے گئے ہیں ان میں سے بیشتر اردو دنیا میں شائع ہوئے ہیں اور یہ مضمون ان میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے، جو ہندوستانی فلمی صنعت اور اردو کے باہمی تعلق کے موضوع پر اپنے پڑھنے والوں کے لیے ایسے حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے جو ابھی تک عام واقفیت کے دائرے سے باہر رہے ہیں اور اس دلچسپ موضوع پر مزید دعوت فکر بھی دیتا ہے۔

ہمارے درمیان اہل نظر عرصے سے یہ مشاہدہ تو کرتے چلے آرہے ہیں کہ رجعت پسند سیاست اور تہذیب سوز کلچرل نیشنلزم کی بیخ کن مہم کے باوجود اردو ہماری فلموں میں بیباکی کے ساتھ موجود ہے، اور اسکرین پر فلم کی زبان کے کالم میں 'اردو' کی جگہ 'ہندی' لکھے جانے کے علاوہ اردو پر اور کوئی آفت نازل نہیں ہوئی۔ لیکن گہرائی میں جاکر فلم اور اردو کے تعلق کو سمجھنے کی کوشش شاید کم ہی کی گئی ہے۔ ہمارے درمیان ایسے فی البدیہہ رائے دینے والے حضرات بھی ہیں جنھوں نے اردو کے ضمن میں اس زبان کی اپنی قوت، اردو اور عوام کے تعلق کو لے کر اس کے ماضی اور حال، اس کے ساتھ ہوئی تخریبی سیاست اور مستقبل میں اس کے زبردست امکانات پر ابھی غور نہیں کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صاحب، اردو کو تو فلموں نے زندہ رکھا ہے ورنہ اب تک کبھی کی ختم گئی ہوتی۔ ان کی نگاہ نہ تو عوام کے تعلق سے زبانوں کی قوت پر گئی ہے اور نہ خود اردو زبان کی اپنی غیر معمولی قوت کی طرف۔ یہ واضح ہے کہ زبان کا مخرج عوام ہیں اور عوام کا زبان سے مسلسل تعلق ہی اس کو قوت بخشتا ہے۔ زبان عوام کی ضرورت کے تحت خود انھیں کے استفادے کے لیے وجود میں آتی ہے، اُگتی بڑھتی ہے، پھولتی پھلتی ہے اور صدیوں تک رفع وارتقا کے عمل سے گزر کر ترسیل کا موثر وسیلہ بن جاتی ہے۔ یہ سب کچھ فطری انداز میں ہوتا ہے۔ حقیقی عوامی زبان دفتروں میں بیٹھ کر، سیاسی مصلحتوں کے دباؤ میں رہ کر یا شعوری طور پر نہیں گھڑی جاتی ہے، نہ ہی کسی زبان کو تہہ کر کے طاق پر رکھا جاسکتا ہے، نہ ہی لسانی یا سیاسی بالادستی قائم کر کے جبراً کسی ملک یا علاقے کی زبان کو مٹایا جاسکتا ہے۔ کسی غیر عوامی زبان کو لوگوں کو لکھنے پڑھنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن روزمرہ زندگی میں بولنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے ملک میں تین زبانیں: سنسکرت، فارسی اور انگریزی اپنے اپنے دور میں بالادست زبانوں کی حیثیت سے صدیوں تک تعلیمی اور دفتری شعبوں میں استعمال کی گئیں لیکن مقامی زبانوں کو ختم نہیں کرسکیں۔ البتہ ان زبانوں پر اپنے اثرات ضرور چھوڑ گئی ہیں اور یہ اثرات بھی صرف وہ ہیں اور اس نہج کے ہیں جنھیں لوگوں نے خود قبول کیا ہے۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے انگریزوں کے اقتدار کے خاتمے کے بعد بھی ابھی تک نئی نئی راہوں سے ہندوستانی زبانوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی کی یہ اثر اندازی نامعلوم مدت تک جاری رہ سکتی ہے۔ بہرحال انگریزی سے اثر پذیری کے معاملے میں ہندوستان اکیلا نہیں ہے ساری دنیا میں یہی حال ہے۔

اردو کی پہلی قوت اس کی اساس ہے جو ہندوستانی بول چال ہے اور ہمارے ملک میں عوامی رابطہ کی ملک گیر زبان ہے۔ اردو ہندوستانی بول چال کا محاورہ اور لے استعمال کرتی ہے اور اسی کی مقبول ترین معیاری شکل ہے اسی لیے ترسیل کا عام فہم اور پسندیدہ وسیلہ ہے اور ایک زندہ وپائندہ زبان ہے۔ اردو کی ایک اور قوت اس کا شعری ادب بھی ہے جو مشاعروں کے وسیلے سے اردو اور عوام کے اضافی تعلق کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اردو مشاعرے نہ صرف عام شاعروں بلکہ اول درجہ کے شعرا کو بھی شعر کے ذریعے عام آدمی کے روبرو رکھتے آئے ہیں اور اردو شعرا کو ہمیشہ سے معلوم رہا ہے کہ شعر کس کے لیے کہنا ہے۔ مزید برآں ہندوستان کی مشترک گنگا جمنی تہذیب کا اہم ترین فیکٹر ہونے کی وجہ سے اردو صدیوں سے اس تہذیب کے تسلسل کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اردو ہماری گزشتہ نو صدیوں کی تاریخ کی امین بھی ہے جس نے اپنے بے شمار کارناموں سے ہماری قومی زندگی کے سیاسی، معاشی، سماجی اور کلچرل شعبوں کو مالامال کر دیا تھا۔ ان

گزشتہ صدیوں کی گوناگوں دستاویزات، قلمی نسخوں، اور علمی وادبی کتابوں کے بے پناہ ذخیروں تک رسائی کا واحد ذریعہ آج بھی اردو رسم الخط ہے۔ ملک میں فارسی کا تسلط ختم ہونے پر کسی ہندوستانی زبان کو جانشین زبان کی حیثیت سے منتخب کرنے کے معاملے میں صرف اردو کو ہی اس کا حق دار خیال کیا گیا اور بلا امتیاز مذہب وملت اسے بلا تکلّف اختیار کرلیا گیا۔ انیسویں صدی میں تعلیمی اور دفتری مقاصد کے لیے اردو کے استعمال کو ترجیح دینے میں مسلم ریاستوں اور برٹش حکومت کے مقابلے میں راجستھان کی غیر مسلم ریاستوں نے پہل کی تھی۔ اردو زبان وادب کا سیکولر نقطہ نظر بھی اس کی طاقت اور مقبولیت کا ایک سبب رہا ہے اور آج بھی ہے۔ مزید برآں اردو کی ایک اور قوت دوسری زبانوں کے الفاظ کو آسانی سے جذب کرنے کی روایت ہے جو سینکڑوں سال پرانی ہے۔ ایسے الفاظ سماجی، تہذیبی اور علمی و تدریسی اثر اندازی اور اثر پذیری کے دوران ضرورت کے تحت فطری انداز میں داخل ہوتے ہیں اور اردو انھیں اپنے وجدان اور لے کی مناسبت سے اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ یہ الفاظ غیر ہندوستانی زبانوں اور دوسری ہندوستانی زبانوں اور بولیوں سے آئے ہیں لیکن عوام نے انھیں معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اپنے لسانی ڈھانچے میں جذب کرلیا ہے۔ اب وہ الفاظ ہر طرح اردو کے الفاظ ہیں اور کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور اردو اسی ہندوستانی بول چال کی معیاری شکل ہے۔ حالانکہ ہمارے ملک میں کبھی کبھی زبان کی صفائی اور ہمارے دور میں شدّھی کی تحریک بھی ہوئی ہے۔ جس کے اثر سے ہم ان زبانوں کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں جن کو ہم اپنی لسانی اور تہذیبی اصل سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدید دور میں ہماری لسانی اصل ہندوستانی ہے اور تہذیبی اصل ہندوستانیت ہے جو ہماری مشترکہ تہذیب ہے، جس میں کئی دوسری تہذیبوں کے علاوہ مغربی تہذیب کے عناصر بھی شامل ہیں۔ اب ہم اس صورتِ حال کو بدل نہیں سکتے کیونکہ عوام کی غالب اکثریت اس طرح کی باتوں کی قطعاً پرواہ نہیں کرتی۔ خود ہمارے دور میں انگریزی کے بہت سارے الفاظ اور اصطلاحات مغربی اشیا کے استعمال، جدید تعلیم خاص طور پر سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم کے راستے سے بڑی تیزی سے داخل ہو رہے ہیں اور ہمارے لیے ناگزیر بن گئے ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے ہماری اپنی زبانوں کے میڈیم سے ان علوم کی تدریس کا کام نہایت آسان ہو جاتا ہے اور ترسیل وتفہیم کا دائرہ قومی اور بین الاقوامی حلقوں میں وسیع تر ہو رہا ہے۔

اردو کو قومی سطح پر عوامی رابطے کی حیثیت سے مستحکم کرنے اور اس کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ کرنے میں کئی اداروں کا اہم رول رہا ہے۔ اردو پہلی ہندوستانی زبان تھی جو ملک گیر پیمانے پر تعلیمی نصاب کی زبان بنی۔ اولاً اٹھارویں صدی کے آخری برسوں میں مدرسے میں اردو نے فارسی کی جگہ لینا شروع کر دی تھی۔ اس کے بعد سرکاری اور نیم سرکاری جدید تعلیمی اداروں میں ایک صدی سے زیادہ تک اردو تدریس کا باقاعدہ میڈیم بنی رہی اور دفتری زبان کی حیثیت سے بھی استعمال کی گئی۔ ملکی سطح پر نمودار ہونے والا سب سے بڑا پریس اردو زبان کا تھا۔

یہ اردو زبان ہی ہے جس نے ہندوستانی فلمی صنعت کو ایک ہر دلعزیز، باوقار اور مالدار صنعت کی حیثیت سے زندہ رکھا ہے۔ علاقائی زبانوں کی فلمیں اپنے علاقوں تک محدود رہتی ہیں جب کہ اردو کی فلمیں نہ صرف اپنے علاقوں بلکہ تمام ملک میں یکساں شوق اور دلچسپی سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہ اردو ہی ہے جس نے ہماری فلم انڈسٹری کو قومی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری بنایا ہے۔

اردو اخبارات اور رسائل سارے ملک میں نکلتے اور پڑھے جاتے تھے اور آج بھی اسی طرح ملک کے ہر گوشے سے نکلتے اور پڑھے جاتے ہیں۔ اردو کی مقبولیت کو بڑھانے میں مشاعروں کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ مشاعرے صدیوں سے اردو کے شعری ادب کو عوامی سطح پر رکھنے میں مددگار رہے ہیں اور ایک ادارے کی حیثیت سے وہ آج بھی اپنی پوری آن بان اور شان سے موجود ہیں۔ اب تو ان کا دائرہ دوسرے ملکوں تک وسیع ہوگیا ہے اور اردو کے شاعر ساری دنیا میں سنے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ مشاعرے کا ادارہ صرف اردو زبان تک مخصوص رہا ہے۔ اسی لیے اردو کا شعری ادب ملک میں اور بیرون ملک اس قدر مقبول ہے۔ یہ سعادت کسی اور ہندوستانی زبان کے شعری ادب کو حاصل نہیں ہوئی۔ کم و بیش گزشتہ سو سال سے ہندوستانی فلم انڈسٹری نے تو اردو کے تعلق سے کمال ہی کر دیا ہے اس نے فلمی مکالموں اور گانوں کے ذریعے اردو کو ملک کے ایک ایک گوشے ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد تک پہنچا دیا ہے۔ بہرحال اردو پر فلموں کے احسان کا تذکرہ کرتے وقت اس سچائی کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ عنایت یک طرفہ نہیں۔ یہ اردو زبان ہی ہے جس نے ہندوستانی فلمی صنعت کو ایک ہر دلعزیز، باوقار اور مالدار صنعت کی حیثیت سے زندہ رکھا ہے۔ علاقائی زبانوں کی فلمیں اپنے علاقوں تک محدود رہتی ہیں جب کہ اردو کی فلمیں نہ صرف اپنے علاقوں بلکہ تمام ملک میں یکساں شوق اور دلچسپی سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہ اردو ہی ہے جس نے ہماری فلم انڈسٹری کو قومی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری بنایا ہے۔ بقول نُصرت ظہیر ''اردو زبان نے ملک کے عوام کو رابطے اور ترسیل کا وسیلہ عطا کیا اور لسانی اور سماجی سطح پر اسے جوڑے رکھا''۔ گویا اردو نے دوسروں سے کہیں بڑھ چڑھ کر اردو فلموں کے توسط سے اور اردو فلموں نے اردو کے توسط سے ہندوستان کے عوام میں رنگ ونسل، ذات پات، مذہب، علاقائیت اور کلچر کی بے پناہ رنگارنگی کے باوجود سیکولر نظریات اور عمل، اور متحدہ قومیت کے جذبے اور طرز فکر کو مستحکم کرنے میں بڑا کام کیا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اردو زبان وادب کے بغیر مشترکہ ہندوستانی تہذیب اور متحدہ ہندوستانی قومیت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ نُصرت ظہیر کے الفاظ میں ''اردو مشترکہ تہذیب کی علامت ہی نہیں اس کی پروردہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی سنیما آج بھی اسے دل سے لگائے ہوئے ہے''۔ اردو نے ہندوستانی سنیما کو نہ صرف قومی اور بین الاقوامی سطح پر غیر معمولی طور پر مقبول بنا دیا ہے بلکہ ہالی ووڈ کے مقابلے میں بالی ووڈ آج دنیا کی دوسری سب سے بڑی فلم انڈسٹری ہے، جس کی اردو فلمیں ہالی ووڈ کی انگریزی فلموں کی طرح ساری دنیا میں چلتی ہیں۔ اردو کوئی معمولی زبان نہیں ہے وہ دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی تیسری بڑی زبان ہے۔ ہندوستان بلکہ پورے برصغیر میں کروڑوں لوگوں کی مادری زبان ہے اور باقی کروڑوں لوگ اسے رابطے کی زبان کی حیثیت سے بولتے، سنتے اور سمجھتے ہیں۔ دراصل ہندوستان بلکہ پورے برصغیر کی مشترک زبان ایک ہی ہے جسے ہم ہندوستانی کہتے ہیں اور اردو اسی ہندوستانی کی مقبول ترین معیاری شکل ہے۔ یہ سب حقائق روز مرہ کا مشاہدہ ہیں جنھیں کسی ثبوت کی

ضرورت نہیں۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری کی پہلی بولنے والی فلم ''عالم آرا'' کے مکالمے بھی اردو میں تھے اور گانے بھی اردو میں اور یہ دونوں روایتیں آج بھی ہماری فلموں میں زندہ ہیں۔ عالم آرا اپنی مقبولیت کی وجہ سے تین بار بنائی گئی۔ یہ غالباً اس لیے ہوا کہ ہمارے ملک کے عوام نے نہ صرف تصویروں کی حرکت اور بولنے کے عمل کو بلکہ اس فلم کی موسیقی، اردو مکالموں اور اردو گانوں کو ہمیشہ کے لیے قبول کرلیا تھا۔

ایک بار اس بات کو دہرا دیں کہ اردو نے ہی دنیا کی سب سے بڑی فلمی صنعت کے مقابلے میں بین الاقوامی بازار میں بالی ووڈ کا سر بلند رکھا ہے۔ ہندوستانی سنیما میں اپنی اساسی روایات یعنی اردو مکالمے اور اردو گانے نہ صرف باقی رکھے گئے ہیں بلکہ ہر دور میں بہتر طریقے سے استعمال کیے گئے ہیں۔ پہلی بولنے والی فلم میں اردو استعمال کرنے اور اسے آج تک قائم رکھنے کی کم از کم تین وجوہات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، اولاً اردو اور ہندوستانی فلم کی اپنی اصل سے دفاداری یعنی ہندوستانی مشترکہ تہذیب، ہندوستانی قومیت اور سیکولرزم کی نمائندگی کے تاریخی رجحان کے معاملے میں مصلحت، سیاسی اور سماجی رجعت پسندی اور نیشنل کلچر پر کلچرل نیشنلزم کے دباؤ میں کسی دور میں بھی اپنی اصل سے انحراف نہیں کیا۔ دوسری وجہ خود اردو زبان کی غیر معمولی قوت اور استفادیت، ہمہ گیری، دل پذیری، جدت پسندی اور قبول عام ہے جسے قومی سطح پر فعال کوئی بھی آرٹ اور کلچر سے تعلق رکھنے والا ادارہ نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اور تیسری وجہ جو بالکل واضح ہے، کاروباری نقطہ نظر ہے۔ ہر فلم ساز چاہے گا کہ اس کی فلموں کی مانگ زیادہ سے زیادہ ہو، انھیں زیادہ سے زیادہ لوگ دیکھیں اور وہ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمائیں۔ مختصر یہ کہ اس کی فلمیں 'سپرہٹ' ہوں۔ 'میل ٹوڈے' میں شائع ہونے والے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق سو سال پرانی ہندوستانی فلمی صنعت کی مالی حیثیت اس وقت تین ارب ڈالر ہے یعنی ایک کھرب پچاس ارب ہندوستانی روپے۔ یا اس سے بھی کچھ زیادہ اور اس صنعت سے پچیس لاکھ کارکن وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس صنعت کی بدولت کئی قد آور ہیرو اور ہیروئنز ہر دور میں موجود رہتے ہیں جو نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک بھی مقبول و مشہور ہیں اور نوجوانوں کے لیے مثالی شخصیت بنے رہتے ہیں۔ ہندوستانی فلمی صنعت فنی اعتبار سے اول درجے کی ہے، خوشحال ہے اور ترقی پذیر ہے اور ترقی کے لیے آسمان حد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غیر معیاری فلمیں بھی بنتی رہتی ہیں لیکن وہ فلاپ ہوجاتی ہیں، اس لیے ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔

ہماری مقبول فلمیں ہمارے ماضی، حال اور مستقبل کو چلتی پھرتی ناچتی گاتی خوبصورت اور دل پذیر تصویروں کے توسط سے ہندوستانی عوام کے سامنے قومی زندگی کے ہر پہلو کو جرأت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ ہماری تاریخ کو حقیقی بنا کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ نہ صرف دکھتی رگیں پکڑتی ہیں بلکہ دل پذیر گیتوں کے وسیلے سے لوگوں کے دل و دماغ کی گہرائیوں کو چھولیتی ہیں اور انھیں تازگی و شگفتگی عطا کرتی ہیں۔ مستقبل کے خواب دکھا کر امیدوں سے بھر دیتی ہیں۔ ہر حال میں زندہ رہنے کا فن سکھاتی ہیں۔ انسانیت کے جذبات اور زندگی کی اعلا قدروں کا شعور پیدا کرتی ہیں۔ سو سال سے ایک پسماندہ، منتشر اور جہالت و غربت کے شکار سماج میں عام لوگوں کو زندگی کا علم اور شعور فراہم کرتی رہی ہیں۔ قومی آزادی، فرد کی آزادی، سماجی انصاف اور برادری برابری کا احساس جگاتی ہیں۔ سماجی، سیاسی اور کلچرل شعبوں میں اصلاحات اور انقلاب کی ضرورت کا سبق پڑھاتی ہیں۔ دوسرے ملکوں میں ہندوستان اور یہاں کے لوگوں کے لیے خیر سگالی پیدا کرنے میں ہماری فلموں کا اہم رول رہا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ جب اوپر بیان کی گئی بالی ووڈ کی قومی سطح پر اعلی درجے کی تعلیمی و تہذیبی خدمات جو بیشتر اردو فلموں کے توسط سے انجام پاتی ہیں اور جنھیں اس ملک کے صد فی صد عوام کم و بیش سو سال سے قبول کرتے چلے آرہے ہیں تو قومی اور ریاستی سطح پر (بالخصوص اتر پردیش میں) سرکاری اور نیم سرکاری نظام تعلیم اور دفاتر سے اردو کو دور کیوں رکھا جارہا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے عمر بھر ہر جہت سے اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے اردو کے تعلق سے دنیا دیکھی ہے۔ ان کے علم، ان کے تجربات، ان کے خلوص اور اردو سے ان کے طویل اور غیر معمولی تعلق کے پیش نظر ان کی رائے کی بڑی اہمیت ہے انھوں نے کہا ہے کہ اردو پاکستان میں صرف رابطے کی زبان ہے جبکہ اس کی جڑیں ہندوستان میں ہیں۔ اردو ہندوستانی زبان ہے۔ اپنی مٹی پر اس کا حق ہے۔ اردو کے حقوق کی بحالی کے جواز میں ایک جمہوری سیکولر ملک میں اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے؟

□

Mr. Aziz Ahmad, Al-Ameen Urdu Markaz, Al-Ameen IIT, Bulanad Shahar Road, Hapur - 245101 (NCR)

ज्ञान-विज्ञान विमुक्तये
UGC-NET

محمد بہلول

لیکچرر شپ میں کیریئر سازی
یو جی سی۔ نیٹ۔ کی تیاری کیسے کریں

ملک کی کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی یا کالج میں لیکچرر یا اسسٹنٹ پروفیسر کے لیے ماسٹر ڈگری کے ساتھ نیٹ کوالیفائی ہونا لازمی ہے۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ سال میں دو مرتبہ منعقد ہونے والا یہ مسابقتی امتحان کافی معنی رکھتا ہے۔ چونکہ دسمبر میں منعقد یہ امتحان پوری طرح آبجیکٹیو (معروضی) ہوگا اس لیے سبجیکٹ کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

اگر آپ کسی کالج یا یونیورسٹی میں درس و تدریس کے خواہش مند ہیں تو آپ کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (یو جی سی) کے زیر اہتمام ہونے والے نیشنل ایلی جبلٹی ٹسٹ (نیٹ) پاس کرنا ہوگا۔ اس کے بعد آپ ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں لیکچرر یا اسسٹنٹ پروفیسر کی ملازمت کے اہل ہوتے ہیں یا پھر جونیئر ریسرچ فیلوشپ (جے آر ایف) حاصل کر کے پی ایچ ڈی میں اندراج ہوسکتے ہیں یہ ٹیسٹ سال میں دو مرتبہ یعنی جون اور دسمبر میں منعقد کیا جاتا ہے۔ جو طالب علم جے آر ایف کوالیفائی کرتے ہیں انھیں متعلقہ سبجیکٹ میں ریسرچ کرنے کے لیے پانچ سال تک فیلوشپ دی جاتی ہے۔

موضوعات/ مضامین (Subjects) دسمبر 2012 کے امتحان میں کل 94 موضوعات/ مضامین میں یہ ٹیسٹ منعقد کیا جائے گا جس کے دائرے میں ہندی، اردو، انگریزی، سوشل سائنسز، فارینک سائنسز، کمپیوٹر سائنس اور الیکٹرانک سائنس وغیرہ سے متعلق موضوعات/ مضامین ہیں۔ غور طلب ہے کہ کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (سی ایس آئی آر) سائنس سبجیکٹ کے لیے الگ سے ٹیسٹ منعقد کرتی ہے۔ جس کے دائرے میں لائف سائنس، فزیکل سائنس، کیمیکل سائنس اور پلانٹری سائنس سے متعلق سبجیکٹ (موضوعات) ہوتے ہیں۔

امتحان: اس ٹیسٹ میں تین پیپر ہوں گے۔ تمام تینوں پیپر آبجکٹیو یعنی معروضی جوابات پر مبنی ہوں گے جو دو الگ الگ شفٹوں میں ہوں گے۔ پہلا پیپر 100 مارکس کا ہوگا اور کل 60 میں سے 50 سوالوں کا جواب دینا ہوگا۔ اس کے حل کے لیے سوا گھنٹے ملیں گے۔ دوسرا پیپر بھی 100 مارکس کا ہوگا اور 50 سوالات ہوں گے۔ اس کے حل کے لیے بھی سوا گھنٹے کا وقت ملے گا۔ تیسرے پیپر میں 75 سوالات ہوں گے اور تمام سوالات کے جوابات دینا لازمی ہے اور یہ 150 مارکس کے ہوں گے۔ اس پیپر کے لیے ڈھائی گھنٹے کا وقت ملتا ہے۔ تمام سوال نامے انگریزی اور ہندی دونوں زبانوں میں ہوں گے۔

پہلا پرچہ: پہلا پرچہ عام سطح کا ہوتا ہے جس میں ٹیچنگ و ریسرچ اپٹی ٹیوڈ کی جانچ ہوتی ہے اس میں ریزننگ ایبلٹی، ڈائیورژن تھنکنگ اور جنرل ایویلویشن سے متعلق سوال ہوتے ہیں۔ ہر ایک سوال دو مارکس کا ہوتا ہے۔ پرچہ دوم میں متعلقہ سبجیکٹ سے 50 سوال ہوتے ہیں اور ہر سوال دو مارکس کا ہوتا ہے۔ تیسرا پرچہ بھی سبجیکٹ سے متعلق ہی ہوگا اور ہر ایک سوال دو مارکس کا ہوگا۔ تینوں پرچے کے سوال آبجیکٹو ہوں گے۔

نتائج: جنرل زمرے کے امیدوار کو پہلے پرچے میں 40 فیصد، دوسرے میں 40 فی صد اور تیسرے میں 50 فیصد مارکس لانا لازمی ہے جب کہ او بی سی کو کم سے کم حاصل مارکس میں 5 فیصد کی رعایت ہے۔ معذور، ایس سی اور ایس ٹی کو بھی پہلے اور دوسرے پرچے میں کم سے کم 5 فیصد کی رعایت ہے۔ وہیں تیسرے پرچے میں محض 40 فیصد مارکس لانے ہوں گے۔ تمام امیدواروں کو ہر ایک پرچے میں الگ الگ طے شدہ مارکس لانا لازمی ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر فائنل ریزلٹ طے ہوگا۔ دسمبر 2012 کے امتحان سے جون 2012 کی طرح طالب علم او ایم آر ریسپانس شیٹ (OMR Response Sheet) کی کاربن کاپی امتحان کے بعد گھر لے جاسکیں گے۔ جس سے وہ خود جائزہ لے سکیں گے کہ انھوں نے کہاں غلط کیا اور کہاں صحیح۔ نگیٹیو مارکنگ اس مرتبہ بھی نہیں ہے۔

تیاری: پہلے پرچے کی تیاری کے لیے گہرا مطالعہ کرنا ہوگا کیونکہ اس پرچے کا مقصد امیدوار کی ٹیچنگ، ریسرچ کی صلاحیت کی جانچ کرنا ہے۔ اس کے لیے اگر آپ اس پرچے سے متعلق کسی گائیڈ سے مطالعہ کرتے ہیں تو کام چل سکتا ہے۔ اگر ایک مہینہ قبل اس سے متعلق سوالات پر توجہ دی جائے اور پریکٹس کی جائے تو اس سے امتحان میں آسانی ہوگی۔

چونکہ چند سوال انگریزی، ریزننگ، کمپری ہینشن سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ کی پریکٹس جتنی بہتر ہوگی اتنے ہی اچھے مارکس آپ لاسکیں گے۔ اسی پرچے میں چند سوال جنرل نالج کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کی تیاری کے لیے میگزین کے ساتھ دسویں تک کی این سی ای آر ٹی کی کتابوں پر نظر ضرور ڈال لیں۔ دوسرا اور تیسرا پرچہ متعلقہ سبجیکٹ کا ہوتا ہے اس لیے اس بات کا خیال ضروری رکھیں کہ آپ کی بنیاد مضبوط ہو۔ چونکہ تمام سوالات آبجیکٹو یعنی معروضی ہوں گے اس لیے جتنی گہرائی سے مطالعہ ہوگا اتنے ہی زیادہ آپ مارکس حاصل کرسکیں گے۔

ابھی تک دوسرے پرچے میں چند سوال کمپری ہینشن سے وابستہ ہوتے تھے، یعنی آپ کو ایک پیراگراف یعنی اقتباس پڑھنا ہوتا تھا اور اسی کی بنیاد پر سوالات کے جوابات دینے ہوتے تھے۔ ایسے سوالات کے جوابات اگر آپ نے صحیح دے دیے تو پورے مارکس ملتے ہیں۔ اس لیے ایسے سوالات کا جواب فوراً دیں اس کے لیے پریکٹس کا ہونا ازحد ضروری ہے۔

حقائق، حادثات، واقعات اور تاریخی وارداتوں کو بھی ذہن میں ضرور رکھیں۔ اس سے متعلق سوال ضرور آتے ہیں۔ اس سے آپ کو زیادہ مارکس ملیں گے۔ اگر آپ دوسرے اور تیسرے پرچے میں زیادہ سے زیادہ سوال حل کرتے ہیں تو آپ کے پاس ہونے کا امکان زیادہ ہے، اس لیے جو بھی پڑھیں تفصیل سے پڑھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سرسری نگاہ سے پڑھنے کے سبب آپ کو سوال حل کرتے وقت پریشانی کا سامنا ہو۔

آپ خاص طور سے یہ خیال رکھیں کہ امتحان کی متعینہ تاریخ کو امتحان کے شروع ہونے سے آدھا گھنٹہ قبل از وقت امتحان گاہ میں ہر حال میں پہنچیں تاکہ ریسپانس شیٹ پر مذکورہ تمام کالم کو یعنی مثال کے طور پر اپنا نام، رول نمبر جوابی بیاض نمبر اور پیپر کوڈ وغیرہ کو مقررہ وقت پر پر کرسکیں تاکہ امتحان شروع ہونے پر آپ کا وقت ضائع نہ ہو اور تمام سوالوں کے جوابات کو نشان زد کرسکیں۔

چونکہ رسالہ 'اردو دنیا' خصوصی طور پر اردو طلبا و طالبات کے حلقوں میں کافی مقبول ہے اسی

کے پیش نظر اردو مضمون میں جون 2012 کے امتحان میں پوچھے گئے سوالات پرچہ دوم اور سوم مع جوابات پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ آنے والے دسمبر 2012 کے امتحان میں آسانی ہو سکے۔

URDU - PAPER - II

Note: This paper contains fifty (50) objective type questions of two (2) marks each. All questions are compulsory.

یہ پرچہ پچاس (50) معروضی سوالات پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے دو (2) نمبر مختص ہیں۔ تمام سوالات لازمی ہیں۔

1. 'رانی کیتکی کی کہانی' کس زبان میں لکھنے کا دعویٰ کیا گیا ہے؟
(A) ہندی (B) اردو (C) دکنی (D) گجری

2. کون سی تصنیف اس کے مصنف کی زندگی میں ہی انگریزی میں ترجمہ ہو گئی تھی؟
(A) فسانۂ عجائب (B) باغ و بہار (C) سب رس (D) بوستانِ خیال

3. آپ بیتی کی طرز میں لکھا ہوا ناول ہے:
(A) آگ کا دریا (B) ٹیڑھی لکیر (C) فردوسِ بریں (D) امراؤ جان ادا

4. کس کی شاعری رومان اور انقلاب کا حسین سنگم ہے؟
(A) فیض احمد فیض (B) ن م راشد (C) تصدق حسین خالد (D) اختر الایمان

5. انگریزی کی شعری روایت کا پرتو کس کی غزلوں میں نظر آتا ہے؟
(A) آرزو لکھنوی (B) بہزاد لکھنوی (C) فراق گورکھ پوری (D) فانی بدایونی

6. کس کی نظمیں عملی زندگی میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں؟
(A) نظیرا کبرآبادی (B) خواجہ الطاف حسین حالی (C) میراجی (D) نظم طباطبائی

7. کس کی نظمیں عموماً پیغام سے مملو ہوتی ہیں؟
(A) ن م راشد (B) میراجی (C) اختر الایمان (D) محمد اقبال

8. مغربی طرزِ حیات کو طنز و تضحیک کا ہدف بنانے والا شاعر:
(A) سرور جہان آبادی (B) نظیرا کبرآبادی (C) اکبرالہ آبادی (D) سیماب اکبرآبادی

9. 'مجموعہ نغز' کیا ہے؟
(A) تاریخ (B) تنقید (C) تبصرہ (D) تذکرہ

10. 'شعرائے اردو کے تذکرے' کس کی تصنیف ہے؟
(A) نورالحسن نقوی (B) مولوی عبدالحق (C) حنیف احمد نقوی (D) رشید حسن خاں

11. 'دل اور دلی کا مرثیہ' کس کی شاعری کو کہا گیا ہے؟
(A) مصحفی (B) میر (C) درد (D) سودا

12. 'تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے' صحیح مصرع سے شعر مکمل کیجیے:
(A) جنوں میں جتنی بھی گزری بہ کار گزری ہے (B) وہ شب ضرور سرِکوے یار گزری ہے
(C) وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے (D) تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

13. خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشما ساز کرے
کس کا شعر ہے؟
(A) فانی (B) فراق (C) حسرت (D) فیض

14. زین الملوک کس مثنوی کا کردار ہے؟
(A) بہارِ عشق (B) پھول بن (C) سحرالبیان (D) گلزارِ نسیم

15. کون سی تخلیق راجندر سنگھ بیدی کی نہیں ہے؟
(A) اپنے دکھ مجھے دے دو (B) بھولا (C) سپنوں کے دیس میں (D) گرہن

16. کس ناقد کا تعلق ترقی پسند تحریک سے نہیں ہے؟
(A) احتشام حسین (B) مجنوں گورکھپوری (C) ممتاز حسین (D) محمد حسن عسکری

17. کون سا بیان درست ہے؟
(A) 'امراؤ جان ادا' اردو کا پہلا ناول ہے۔ (B) شمالی ہند کی پہلی مثنوی قطب مشتری ہے۔ (C) نکات الشعرا اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے۔ (D) کربل کتھا دکن کی پہلی نثری تصنیف ہے۔

18. میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر — لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
یہ کس کا شعر ہے؟
(A) مخدوم (B) اقبال (C) مجروح (D) سردار جعفری

19. 'امراؤ جان ادا' کا کردار 'فیض علی' کیا ہے؟
(A) غلام (B) بھائی (C) ڈاکو (D) نواب

20. پریم چند کا افسانہ 'کفن' پہلی بار کس ادبی جریدے میں شائع ہوا تھا؟
(A) نگار (B) زمانہ (C) جامعہ (D) مخزن

21. دیا شنکر نسیم کے استاد کا نام:
(A) ناسخ (B) میر حسن (C) درد (D) آتش

22. "مغل دور نے ہندوستان کو تین چیزیں دیں۔ غالب، اردو اور تاج محل"، یہ کس کا قول ہے؟
(A) آل احمد سرور (B) رشید احمد صدیقی (C) خورشید الاسلام (D) مالک رام

23. امراؤ بیگم کس شاعر کی شریک حیات تھیں؟
(A) ذوق (B) مومن (C) حسرت (D) غالب

24. 'داستان زبانِ اردو' کس کی تصنیف ہے؟
(A) ڈاکٹر سہیل بخاری (B) گراہم بیلی (C) شوکت سبزواری (D) ڈاکٹر مسعود حسین خاں

25. پریم چند نے اپنے کس ناول میں پہلی مرتبہ دیہاتی زندگی کے مسائل کی عکاسی کی ہے؟
(A) ہم خرما و ہم ثواب (B) گوشۂ عافیت (C) جلوۂ ایثار (D) گئودان

26. راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ 'لاجونتی' میں لاجونتی کے شوہر کا نام کیا ہے؟
(A) سندر لال (B) منوہر (C) منگل (D) دیپک

27. صحیح مصرعے سے شعر مکمل کیجیے:
یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا..........
(A) تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا (B) دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا
(C) مدعا ہے چشم گوہر بار کا (D) ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا

28. زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر — عیاں ہو خامے سے تحریرِ نغمۂ جائے صریر
کس کے قصیدے کا مطلع ہے؟
(A) سودا (B) مصحفی (C) ذوق (D) محسن

29. ذیل میں کس نے کوئی مثنوی نہیں لکھی؟
(A) درد (B) سودا (C) میر حسن (D) میر

30. زمانی اعتبار سے کون سی ترتیب درست ہے؟
(A) بال جبریل، بانگ درا، ارمغان حجاز، ضرب کلیم (B) ضرب کلیم، بانگ درا، ارمغان حجاز، بال جبریل (C) بال جبریل، ضرب کلیم، بانگ درا، ارمغانِ حجاز (D) بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، ارمغان حجاز

31. زمانی اعتبار سے صحیح ترتیب کی نشاندہی کیجیے:
(A) ناسخ، آبرو، غالب، میر (B) میر، غالب، آبرو، ناسخ
(C) آبرو، میر، ناسخ، غالب (D) غالب، ناسخ، میر، آبرو

کیریئر گائڈ

32. 'دیوانِ غالب' کو الہامی کتاب کس نے کہا ہے؟
(A) حالی (B) نیاز فتح پوری (C) مالک رام پوری (D) عبدالرحمٰن بجنوری

33. کون کتاب محمد حسین آزاد کی نہیں ہے؟
(A) آبِ حیات (B) دربارِ دربار (C) دربارا کبری (D) سخن دان فارس

34. ''یہ طرز خاص میری دولت تھی سوایک ظالم 'پانی پت' انصاریوں کے محلے میں رہنے والا لوٹ لے گیا'' غالب نے اپنے خط میں یہ بات کس کے لیے کہی ہے؟
(A) سرفراز حسین (B) میر مہدی مجروح (C) میر نصیر الدین (D) الطاف حسین حالی

35. 'گذشتہ لکھنؤ' کے مصنف کا کیا نام ہے؟
(A) رجب علی بیگ سرور (B) تیج بہادر سپرو (C) عبدالحلیم شرر (D) محمد علی طبیب

36. 'سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر' کس کا مضمون ہے؟
(A) حبیب الرحمٰن خاں شروانی (B) حالی (C) شبلی (D) وقار الملک

37. 'حیات جاوید' کس کی سوانح حیات ہے؟
(A) جاوید اقبال (B) غالب (C) ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری (D) سرسید احمد خاں

38. حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو
یہ شعر کس کا ہے؟
(A) فیض (B) جوش (C) مجاز (D) مخدوم

39. نظم 'ساقی نامہ' اقبال کے کس مجموعۂ کلام میں شامل ہے؟
(A) بانگ درا (B) بال جبرئیل (C) پیام مشرق (D) ضرب کلیم

40. اردو میں گیان پیٹھ انعام یافتگان کا کون سا زمرہ صحیح ہے؟
(A) فراق گورکھپوری- سردار جعفری- حیات اللہ انصاری (B) فراق گورکھپوری- اختر الایمان- قرۃ العین حیدر (C) فراق گورکھپوری- جگر مراد آبادی- شہریار (D) فراق گورکھپوری- سردار جعفری- شہریار

41. ''اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی'' اس نظریہ کو کس نے پیش کیا؟
(A) حافظ محمود شیرانی (B) مسعود حسین خان (C) محمد حسین آزاد (D) نصیر الدین ہاشمی

42. 'رجز' کس صنف سخن کا جزو ہے؟
(A) قصیدہ (B) مرثیہ (C) ریختی (D) واسوخت

43. دیا شنکر نسیم کا تعلق کس دبستان سے تھا؟
(A) دبستانِ لکھنؤ (B) دبستانِ دہلی (C) دبستان گولکنڈہ (D) دبستانِ بیجاپور

44. مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا مصنف کون ہے؟
(A) ملک خوشنود (B) غواصی (C) ابن نشاطی (D) وجہی

45. ان میں سے حالی کی تصنیف کون سی ہے؟
(A) بنات النعش (B) نصیحت کا کرن پھول (C) مجالس النسا (D) توبۃ النصوح

46. اس شعر کا مصرع اولیٰ کیا ہے؟ ع ''..........نیند کیوں رات بھر نہیں آتی''
(A) مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی (B) کوئی امید بر نہیں آتی
(C) ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی (D) موت کا ایک دن معین ہے

47. قدیم اردو کا وہ کون سا شاعر ہے جسے حاسدوں نے شہید کر دیا؟
(A) غواصی (B) نصرتی (C) مقیمی (D) ابن نشاطی

48. نظیر اکبر آبادی کا اصل نام کیا ہے؟
(A) ولی محمد (B) محمد ولی (C) محمد علی (D) محمد تقی

49. حالی کے نزدیک کون سی صنف سخن سب سے زیادہ مفید اور کار آمد ہے؟
(A) مثنوی (B) غزل (C) مرثیہ (D) قصیدہ

50. کس ناول نگار نے سب سے پہلے تعلیم نسواں کو موضوع بنایا؟
(A) پریم چند (B) عبدالحلیم شرر (C) ڈپٹی نذیر احمد (D) مرزا ہادی رسوا

URDU - PAPER - III

Note: This paper contains seventy five (75) objective type questions of two (2) marks each. All questions are compulsory.

یہ پرچہ پچھتر (75) معروضی سوالات پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے دو (2) نمبر مختص ہیں۔ تمام سوالات لازمی ہیں:

1. جو نظم ''اے عشق کہیں لے چل'' سے شروع ہوتی ہے اس کا خالق کون ہے؟
(A) علی سردار جعفری (B) اختر شیرانی (C) نیاز حیدر (D) اختر الایمان

2. جوش ملیح آبادی کا نام تھا:
(A) شبیہ الحسن خان (B) شریف الحسن خان (C) شبیر حسن خان (D) صفدر حسین خان

3. ''کیا وہ نمرود کی خدائی تھی- بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا''
اس شعر میں کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے؟
(A) حسن تعلیل (B) تلمیح (C) تشبیہ (D) استعارہ

4. حالی نے اردو نثر کا مورث اعلیٰ کسے قرار دیا؟
(A) سرسید (B) غالب (C) محسن الملک (D) میر مہدی مجروح

5. ان میں سے کون سا ناول پریم چند کا نہیں ہے؟
(A) اسرار معابد (B) میدانِ عمل (C) گوشۂ عافیت (D) خدا کی بستی

6. میر تقی میر کس نواب کی دعوت پر لکھنؤ گئے؟
(A) شجاع الدولہ (B) آصف الدولہ (C) واجد علی شاہ (D) امجد علی

7. پہلے حالی کا تخلص خستہ تھا، کس کے کہنے پر انھوں نے تبدیل کر دیا؟
(A) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (B) شبلی (C) مرزا غالب (D) میر مہدی مجروح

8. یہ کس شاعر کا مصرعہ ہے؟ ع ''عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ، جائے صریر''
(A) سودا (B) ذوق (C) غالب (D) مومن

9. 'گنج خوبی' کے مصنف کا کیا نام ہے؟
(A) رجب علی بیگ سرور (B) للو لال جی (C) میر امن دہلوی (D) محمد حسین آزاد

10. ''شاعری دنیا کی مادری زبان ہے'' کس کا قول ہے؟
(A) خورشید الاسلام (B) مولانا ابوالکلام آزاد (C) رشید احمد صدیقی (D) اسلوب احمد انصاری

11. ذیل میں سے کون سی کتاب محمد حسین آزاد کی نہیں ہے؟
(A) مجالس النساء (B) سخندانِ فارس (C) آبِ حیات (D) دربارِ اکبری

12. سلور کنگ کس کا ڈرامہ ہے؟
(A) طالب بنارسی (B) احسن بنارسی (C) بیتاب لکھنوی (D) آغا حشر کاشمیری

13. شوکت سبزواری نے اردو زبان کا مولد کسے بتایا ہے؟
(A) ہریانہ (B) پنجاب (C) سندھ (D) دکن

14. سادگی، جوش اور اصلیت کو شعر کی خوبی قرار دینے والی کتاب کا نام
(A) اردو شاعری پر ایک نظر (B) شعر العجم (C) مقدمہ شعر و شاعری (D) ہماری شاعری

15. ترقی پسند ناقدین والے زمرے کی نشان دہی کیجیے:
(A) آل احمد سرور، خورشید الاسلام، خلیل الرحمٰن اعظمی (B) سید سجاد ظہیر، سید احتشام حسین، مجنوں گورکھ پوری (C) محمد حسن عسکری، کلیم الدین احمد، مسعود حسن رضوی (D) گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، محی الدین قادری زور

16. صرف ناولوں کے ناموں والے زمرے کی نشان دہی کیجیے:

(A) امراؤ جان ادا، خواب باقی ہیں، باغ و بہار (B) لہو کے پھول، اُداس نسلیں، آگ کا دریا (C) گئودان، روٹھی رانی، پردۂ غفلت (D) آگ کا دریا، بادشاہت کا خاتمہ، خانہ جنگی

17. کس شاعر نے ریختی کا دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے؟
(A) نصرتی (B) جنیدی (C) ہاشمی (D) وجدی

18. اردو میں علامہ اقبال کے کل کتنے شعری مجموعے شائع ہوئے؟
(A) چار (B) پانچ (C) چھ (D) سات

19. تذکرہ 'گلشن بے خار' کا مصنف کون ہے؟
(A) مصحفی (B) مرزا علی لطف (C) قائم چاند پوری (D) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

20. کرشن چندر کی تصنیف 'پودے' کا تعلق نثر کی کس صنف سے ہے؟
(A) ناول (B) رپورتاژ (C) ڈراما (D) مختصر افسانہ

21. اسلوبیاتی تنقید کا نمائندہ نقاد کون ہے؟
(A) شمس الرحمٰن فاروقی (B) محمد حسن (C) گوپی چند نارنگ (D) آل احمد سرور

22. فراق گورکھپوری کا تعلق کس دبستان تنقید سے تھا؟
(A) مارکسی (B) تاثراتی (C) نفسیاتی (D) ساختیات

23. 'رانی کیتکی کی کہانی' کا ادب کی کس صنف سے تعلق ہے؟
(A) داستان (B) ناول (C) مختصر افسانہ (D) ڈراما

24. درگا سہائے سرور جہاں آبادی کا ابتدائی تخلص کیا تھا؟
(A) ناظم (B) درگا (C) اسد (D) وحشت

25. دکنی شعرا میں موضوعات کا تنوع کس کے پاس زیادہ ہے؟
(A) ولی (B) غواصی (C) نصرتی (D) محمد قلی قطب شاہ

26. شعر مکمل کیجیے: ع تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
(A) اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا (B) میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
(C) دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا (D) ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

27. ان میں کون سا بیان درست ہے؟
(A) دیوان غالب کی سب سے زیادہ شرحیں لکھی گئیں۔ (B) ڈاکٹر زور نامور افسانہ نگار تھے۔ (C) کرشن چندر کے شعری مجموعہ کا نام 'شکست' ہے۔ (D) یادوں کی برات' غالب کی خودنوشت سوانح ہے۔

28. اردو زبانوں کے کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟
(A) ہند یوروپی (B) دراوڑی (C) افروایشیائی (D) ہند آریائی

29. ناول 'ایک چادر میلی سی' میں 'رانو' کے شوہر کا کیا نام ہے؟
(A) منگل (B) تلوکا (C) سندر لال (D) گوبر

30. 'ماورا' کس شاعر کے شعری مجموعہ کا نام ہے؟
(A) میراجی (B) احمد ندیم قاسمی (C) اختر الایمان (D) ن م راشد

31. درست جوڑ کی نشاندہی کیجیے:
(A) فیض احمد فیض: آہنگ (B) شاد عظیم آبادی: نغمۂ الہام
(C) جگر مراد آبادی: گلِ نغمہ (D) مخدوم محی الدین: ایشیا جاگ اٹھا

32. میر تقی میر کی ولادت کہاں ہوئی؟
(A) آگرہ (B) دہلی (C) لکھنؤ (D) فیض آباد

33. اقبال کے وہ کون سے استاد تھے جن کو اقبال کی وجہ سے شمس العلما کا خطاب ملا؟
(A) داغ دہلوی (B) محمد حسین آزاد (C) حالی (D) میر حسن

34. کس نثری صنف کو ذہن کی ترنگ کہا جاتا ہے؟
(A) داستان (B) انشائیہ (C) مختصر افسانہ (D) رپورتاژ

35. اصلیت، سادگی اور جوش کی بحث کس کتاب میں ملتی ہے؟
(A) ہماری شاعری (B) تنقیدی جائزے (C) شعر العجم (D) مقدمۂ شعر و شاعری

36. صحیح جوڑ کی نشاندہی کیجیے:
(A) ایسی بلندی ایسی پستی: جیلانی بانو (B) ایوانِ غزل: کرشن چندر
(C) گردشِ رنگ چمن: قرۃ العین حیدر (D) شکست: عزیز احمد

37. زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
یہ کس کا شعر ہے؟
(A) شاد اں (B) آتش (C) مومن (D) میر تقی میر

38. شوکت علی خاں کس شاعر کا اصل نام ہے؟
(A) جگر (B) اصغر (C) فانی (D) حسرت

39. مخدوم محی الدین کا پہلا شعری مجموعہ کون سا ہے؟
(A) گلِ تر (B) بساطِ رقص (C) سرخ سویرا (D) پرواز

40. فراق گورکھپوری کس سنہ میں پیدا ہوئے؟
1905(D) 1901(C) 1897(B) 1896(A)

41. کس ماہر لسانیات نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ ''اردو دراوڑی خاندان کی زبان ہے؟''
(A) سہیل بخاری (B) شوکت سبزواری (C) سنیتی کمار چٹرجی (D) سید محی الدین قادری زور

42. ذیل میں کس زمرے کا تعلق مختصر افسانے سے ہے؟
(A) سوتیلی ماں- سیر کوہسار- سیدہ کا لال- غبن (B) پردۂ مجاز- سونے کا سنسار- سیتا ہرن- حضرت جان (C) نوک جھونک- بالکونی- موذیل- تلادان (D) آتش رفتہ- رات- سوا سیر گیہوں- دستِ وفا

43. ذیل میں کس زمرے کا تعلق ناول سے ہے؟
(A) سفینۂ غم دل- خیالستان- نرملا- کوکھ جلی (B) زوال بغداد- پردۂ مجاز- معرکۂ کربلا- گردشِ رنگ چمن (C) چند ہم عصر- ہم نفسانِ رفتہ- شیش محل- چاندنی بیگم (D) دوزخی- یاران کہن- شکست- ارہر کا کھیت

44. ''زبان دہلی و پیرامنش، اردو کا اصل اور سرچشمہ ہے اور حضرت دہلی اس کا حقیقی مولد و منشا۔'' یہ قول کس کا ہے؟
(A) محمد حسین آزاد (B) میر امن (C) حافظ محمود شیرانی (D) مسعود حسین خاں

45. ان میں طبع زاد داستان کون سی ہے؟
(A) الف لیلہ (B) باغ و بہار (C) فسانۂ عجائب (D) سب رس

46. ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفس وہ خواب ہیں ہم
اس شعر کا خالق کون ہے؟
(A) درد (B) مومن (C) فراق (D) شاد

47. اردو کا پہلا مثنوی نگار کون ہے؟
(A) غواصی (B) فخر دین نظامی (C) میر حسن (D) ملا وجہی

48. ان میں کون صوفی شاعر ہے؟
(A) فانی بدایونی (B) خواجہ میر درد (C) فائز دہلوی (D) محمد رفیع سودا

49. پراکرت کا پہلا ادبی روپ ——— ہے:
(A) مہاراشٹری (B) شورسینی (C) پالی (D) مگدھی
50. قاضی عبدالودود اردو ادب میں کس حیثیت سے مشہور ہیں؟
(A) نقاد (B) تذکرہ نگار (C) انشائیہ نگار (D) محقق
51. 'کلیات محمد قلی قطب شاہ' کے اولین مرتب کا نام بتائیے۔
(A) پروفیسر سیدہ جعفر (B) سید محی الدین قادری زور
(C) عبدالحق (D) مسعود حسین خاں
52. سر سید احمد خاں نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کب قائم کی؟
1866(D) 1865(C) 1864(B) 1862(A)
53. 'چکبست' کا شعری مجموعہ کس نام سے شائع ہوا؟
(A) سریلی بانسری (B) جام سرور (C) صبح وطن (D) گل نغمہ
54. کس تحریک کے دوران اردو میں صنف ناول کا آغاز ہوا؟
(A) رومانی تحریک (B) علی گڑھ تحریک
(C) حلقہ ارباب ذوق تحریک (D) ترقی پسند تحریک
55. میر تقی میر کا سنہ وفات کیا ہے؟
1813(D) 1812(C) 1811(B) 1810(A)
56. میر امن نے 'باغ و بہار' کس کی فرمائش پر لکھی؟
(A) لارڈ ویلزلی (B) ڈاکٹر جان گلکرائسٹ (C) کرنل ہالرائیڈ (D) حسین عطا خان تحسین
57. حالی نے شاعر کے لیے کون سی تین شرطیں لازمی قرار دی ہیں؟
(A) تخیل - محاکات - کائنات کا مطالعہ (B) محاکات - رعایت لفظی - مبالغہ
(C) تخیل - مبالغہ - محاکات (D) تخیل - مطالعۂ کائنات - تفحص الفاظ
58. نفسیاتی دبستان تنقید سے کس نقاد کا تعلق ہے؟
(A) عبدالعلیم (B) کلیم الدین احمد (C) میراجی (D) مسعود حسین خان
59. 'تین رنگ' اور 'پابند نظمیں' کس شاعر کی کتابیں ہیں؟
(A) چکبست (B) نظم طباطبائی (C) اختر الایمان (D) میراجی
60. محسن کاکوروی کس شاعر کے شاگرد تھے؟
(A) داغ دہلوی (B) امیر مینائی (C) مرزا غالب (D) آتش
61. اردو کی لسانی تشکیل میں کس زبان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے؟
(A) پالی (B) برج بھاشا (C) کھڑی بولی (D) پنجابی
62. مرزا غالب نے تاریخ کی کون سی کتاب لکھی تھی؟
(A) تزک بابری (B) تاریخ جہانگیری (C) تاریخ تیموری (D) مہر نیمروز
63. گل نغمہ کس شاعر کا مجموعہ کلام ہے؟
(A) جگر (B) فانی (C) فراق (D) فیض
64. اندر سبھا کا تعلق ادب کی کس صنف سے ہے؟
(A) مثنوی (B) مختصر افسانہ (C) ناول (D) ڈرامہ
65. شام بھی تھی دھواں دھواں، حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں
یہ کس کا شعر ہے؟
(A) فیض (B) جگر (C) حسرت (D) فراق
66. ان میں کون سی کتاب رشید احمد صدیقی کی نہیں ہے؟
(A) ہم نفسانِ رفتہ (B) آشفتہ بیانی میری (C) زرگذشت (D) گنج ہائے گراں مایہ
67. ان میں کون سی کتاب شمس الرحمٰن فاروقی کی ہے؟
(A) ادبی تخلیق (B) تخلیقی عمل (C) لفظ و معنی (D) افکار و مسائل
68. وحدتِ تاثر کس صنف کی نمایاں اور اہم خصوصیت ہے؟
(A) داستان (B) ناول (C) ڈرامہ (D) مختصر افسانہ
69. یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو جوں توں صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا
اس شعر میں کس صنعت کا استعمال کیا گیا ہے؟
(A) تضاد (B) مبالغہ (C) تلمیح (D) اشتقاق
70. قصیدہ کے اجزا کی صحیح ترتیب کی نشاندہی کیجیے:
(A) تشبیب، مدح، گریز، دعا (B) تشبیب، گریز، مدح، دعا
(C) تشبیب، گریز، دعا، مدح (D) گریز، تشبیب، مدح، دعا
71. ان میں سے کون دکنی شاعر نہیں ہے؟
(A) غواصی (B) نصرتی (C) آبرو (D) ہاشمی
72. نظم 'ذوق و شوق' میں ریگ نواح کاظمہ سے کیا مراد ہے؟
(A) نجف اشرف (B) مکہ معظمہ (C) بیت المقدس (D) مدینہ منورہ
73. مرزا دبیر کہاں پیدا ہوئے تھے؟
(A) دہلی (B) لکھنؤ (C) فیض آباد (D) آگرہ
74. تنقیدی نظریات پر مبنی کتاب 'بوطیقا' کس کی ہے؟
(A) ہیگل (B) افلاطون (C) ارسطو (D) اقلیدس
75. 'سیف و سبو' کس شاعر کے مجموعۂ کلام کا نام ہے؟
(A) یگانہ چنگیزی (B) فراق گورکھپوری (C) جوش ملیح آبادی (D) فیض احمد فیض

Answer Keys (Paper-II)

1	A	2	B	3	D	4	A	5	C
6	B	7	D	8	C	9	D	10	C
11	B	12	D	13	C	14	D	15	C
16	D	17	C	18	C	19	C	20	C
21	D	22	B	23	D	24	C	25	B
26	A	27	D	28	C	29	A	30	D
31	C	32	D	33	B	34	D	35	C
36	C	37	D	38	D	39	B	40	D
41	A	42	B	43	A	44	B	45	C
46	D	47	B	48	A	49	A	50	C

Answer Keys (Paper-III)

1	B	2	C	3	B	4	A	5	D
6	B	7	C	8	B	9	C	10	C
11	A	12	D	13	A	14	C	15	B
16	B	17	C	18	A	19	D	20	B
21	C	22	B	23	A	24	D	25	D
26	D	27	A	28	D	29	B	30	D
31	B	32	A	33	D	34	B	35	D
36	C	37	B	38	C	39	C	40	A
41	A	42	C	43	B	44	D	45	C
46	D	47	B	48	B	49	C	50	D
51	B	52	B	53	C	54	B	55	A
56	B	57	D	58	C	59	D	60	B
61	C	62	D	63	C	64	D	65	D
66	C	67	C	68	D	69	A	70	B
71	C	72	D	73	A	74	C	75	C

Mohd Bahlul, 492, First Floor, Gali Bahar Wali, Chatta Lal Miyan, Daryaganj, New Delhi - 110002

مظہر حسنین

اردو سافٹ ویئر کا تیس سالہ سفر

کمپیوٹر نے جیسے ہی اپنے آمد کی خبر زمانے کو دی اہم زبانوں نے اس سے دوستی کے لیے اپنے ہاتھ دراز کر لیے۔ زبان سے محبت کا دم بھرنے والے اس جادوئی مشین کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئے۔ زبان سے اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لیے اسے کمپیوٹر سے ہم آہنگ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اردو کے پرستاروں کو بھی اپنی زبان کو کمپیوٹر سے وابستہ کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ ان کی عملی پیش قدمی نے بہت سے اردو سافٹ ویئر کو جنم دیا۔ جن میں کاتب، صدف، شاہکار، سُرخاب، خطاط، صفحہ ساز، پیج پرو، اردو پبلشر، اردو کلپ آرٹ، نقاش، اردو ماہر، اردو ایڈیٹر، اردو 1-89، رقعہ، اردو نگار، راقم، پارس نگار اور ان پیج قابل ذکر ہیں۔ ابتدائی دور میں کمپیوٹر میں اردو کا تصور محال تھا اور کتابوں، اخباروں، رسالوں کے لیے کاتب حضرات کی مدد لینی پڑتی تھی اس میں کافی وقت ضائع ہوتا تھا، جب اردو ٹائپ رائٹر کا استعمال ہونے لگا تو اس میں کچھ سہولت ہوئی لیکن جیسے ہی کمپیوٹر میں اردو کا استعمال ہونے لگا اردو کمپوزنگ کی دنیا بالکل تبدیل ہو گئی۔

ٹائپ رائٹر میں الفاظ کو جوڑ کر نسخ خط میں تحریر کیا جاتا تھا۔ نسخ خط (فانٹ) کو کم لوگ ہی پسند کرتے ہیں۔ ہاں جہاں کام چلانے یا نکالنے کی بات ہو وہاں معاملہ کچھ مختلف ہو جاتا ہے۔ نسخ کی ایک بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ اس کے کچھ الفاظ بہت ہی غیر واضح ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس زمانے میں اس کی اپنی اہمیت تھی جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کمپیوٹر نے طباعت و اشاعت کے میدان میں داخل ہو کر ڈسک ٹاپ پبلشنگ کا آغاز کیا۔ پہلے دنیا کی اہم زبانوں میں اس کی مدد لی گئی۔ عربی زبان میں اس طرح کے کام کیے جانے لگے اور مشرق وسطیٰ میں کمپیوٹر کے ذریعے عربی کمپوزنگ شروع ہوئی۔

اردو میں اس سلسلے میں جب غور کیا گیا تو مسائل کی طرف توجہ گئی۔ اردو کے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ اردو نستعلیق خط میں لکھی جاتی تھی۔

لیکن کمپیوٹر میں نسخ کا استعمال ہوتا تھا یعنی ہم کمپیوٹر کی مدد سے اردو نسخ خط میں لکھ سکتے تھے۔ اردو کا ایک لفظ اپنے استعمال کے لحاظ سے مختلف جگہوں پر مختلف شکلیں اختیار کرتا تھا۔ یعنی اردو نظام تحریر ترسیموں (Ligatures) پر مبنی تھا۔ مثلاً ٹائپ کے لفظ اور رائٹر کا استعمال ایک ہی طرح ہے۔ لیکن دونوں کی شکل مختلف ہے جبکہ عربی میں جو نظام تحریر استعمال ہوتا ہے وہ حروف کے جوڑوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اردو کے لیے دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ عربی میں اردو کے کچھ حروف ہوتے ہی نہیں تھے جن کی کمی کی وجہ سے اردو کے بیشتر الفاظ کو لکھنا ممکن نہ تھا۔ اب ان سب مسائل پر غور کر کے کمپیوٹر کے ذریعے اردو لکھنے کی ضرورت کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور وخوض کیا گیا۔ 1980 میں پاکستان کے مرزا جمیل احمد نے سافٹ ویئر تیار کرنے والی غیر ملکی کمپنی سے سافٹ ویئر کی تیاری کی غرض سے رابطہ کیا۔ مرزا جمیل احمد جو ایک پبلشر ہونے کے ساتھ خاندانی خطاط بھی تھے، ان کے اور کمپنی کے مابین ساری باتیں طے پا گئیں تو کمپنی کو گراف پیپر پر اردو زبان کے ایک ایک حروف کے تمام الفاظ اور ممکنہ شکلوں کی ڈرائنگ دی۔ جنھیں لگچرز یا ترسیموں کا نام دیا گیا۔ یہ کام بھی نہایت دشوار گزار تھا اور اس کے لیے کافی مشقت کرنی پڑی۔ تمام پوائنٹ میں الفاظ کی ضرورت ہو تو اس کے لیے اس سائز میں علیحدہ الفاظ بنائے گئے۔ تقریباً 25000 لگچرز پر مشتمل ایک سافٹ ویئر تیار کیا گیا۔ جو کچھ اس طرح سے کام کرتا تھا۔ تحریر پروگرام کے ایڈیٹر میں نسخ رسم خط میں ٹائپ کی جاتی جس کے بعد کاغذ پر چھپائی کرنے کے لیے سافٹ ویئر اس تحریر میں موجود ہر ایک لفظ کو ڈرائنگ سے ضرورت کے مطابق پوائنٹ سائز کی لگچرز کی لائبریری سے نکال

لیتا۔اس طرح تمام تحریر مکمل کر کے پرنٹر کے ذریعے کاغذ پر پرنٹ کر لی جاتی تھی۔اس کے ساتھ ایک دشواری یہ تھی کہ اگر کسی لفظ کا لگچر نہ ملتا تو یہ اس کو نسخ طرز تحریر میں ڈھال دیتا۔ اس خامی کے باوجود ابتدائی دور میں یہ کمپوزنگ کے تعلق سے اردو کی ضروریات کو پورا کررہا تھا۔ اس کی آمد سے اردو پبلشنگ کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ ہاتھ کے ذریعے کی جانے والی کتابت کی اہمیت کم ہوتی گئی۔ جولوگ بدقت اخبارات اور رسائل، جرائد، کتب کا ہاتھ سے کام کرتے تھے ان کے لیے اس نے کافی سہولیات فراہم کی اور اس سافٹ ویئر نے جیسے ان کی دنیا ہی تبدیل کردی۔ اخبار کی دنیا میں اس سافٹ ویئر کا سب سے پہلے استعمال جنگ اخبار گروپ پاکستان نے کیا۔

1985 میں 'کاتب' نامی سافٹ ویئر تیار کیا گیا۔ یہاں ایک بات واضح کرتا چلوں کہ 'کاتب' کے آنے سے قبل بھی سافٹ ویئر لیزر پرنٹر کی مدد سے پرنٹ کی سہولت فراہم کرتے تھے اور یہ ڈاس (DOS) میں کام کرتے تھے۔اس کے بعد اردو سافٹ ویئر، اردو ورڈ پروسیسنگ پر کام ہوا۔ اس سلسلے میں پہلے 1986 'شاہکار' سافٹ ویئر منظر عام پر آیا۔ بعدازاں 'خطاط' نے اردو کمپوزنگ کی دنیا میں دستک دی۔ پھر یکے بعد دیگرے سافٹ ویئر کی آمد کا جو سلسلہ شروع ہوا تو درجنوں سافٹ ویئر منظر عام پر آئے۔جن میں سرخاب،صدف، اردو پبلشر، اردو کلپ آرٹ، اردو ماہر شامل ہیں لیکن یہ مکمل طور پر صفحہ تیار کرنے کی خصوصیت نہیں رکھتے تھے۔اس میں زیادہ تر کام مواد جمع کرنے کے لیے ہی ہوتا تھا لیکن پھر بھی ان کی اپنی اہمیت وافادیت تھی اور بھرپور طریقے سے استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ تاہم اس کے بارے کوئی اشارہ نہیں مل پاتا کہ ان کو کن کن اداروں نے استعمال کیا۔ جب اس کا موازنہ انگریزی سے کیا گیا تو بہرحال انگریزی زبان میں وہ ساری سہولیات ڈیزائننگ، صفحے کی تیاری کے کام بڑی خوبصورتی سے کیے جارہے تھے اس لیے ایسا لگا کہ اردو ابھی اس سفر میں کافی پیچھے ہے۔ چنانچہ اس کے لیے کوشش جاری رہیں۔ تجربات کیے جاتے رہے۔ ایک اہم سافٹ ویئر 'صدف' کے نام سے آیا۔اس سے اردو سافٹ ویئر کی خصوصیات میں مزید اضافہ ہوا۔صدف کی دواہم خصوصیات یہ تھیں۔

(1) اس میں ڈاٹ میٹرکس پرنٹر سے بھی پرنٹ لینے کی سہولت تھی۔

(2) یہ ڈاس(DOS) میں بھی نستعلیق رسم الخط میں تحریر کرتا تھا جبکہ ابھی تک کے سبھی سافٹ ویئر نسخ رسم الخط میں تحریر کرتے تھے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صدف سافٹ ویئر نے اردو سافٹ ویئر کی دنیا میں اپنی خصوصیات کو مختلف ثابت کیا اور اپنی اہمیت وافادیت کو واضح کرتے ہوئے مقبول عام ہوا۔

اردو سافٹ ویئر کا سفر صدف سے تھوڑا آگے بڑھ کر 'نقاش' تک پہنچا۔ یہ مائیکروسافٹ ورڈ سے مطابقت رکھتا تھا۔

باوجود اس کے کہ یہ ایک اچھا سافٹ ویئر تھا پھر بھی اس میں خامیاں تھیں اور ان خامیوں کو دور کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

ابھی یہ زمانہ چل ہی رہا تھا کہ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم منظر عام پر آیا۔ ابھی تک سارے سافٹ ویئر ڈسک آپریٹنگ سسٹم (DOS) کی مدد سے کام کرتے تھے۔لیکن ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کے آنے کے بعد سب سے پہلے کناڈا میں انعام علوی نے 'صفحہ ساز' نامی سافٹ ویئر تیار کیا جس کو ہندوستان میں کمپیوٹر کارپوریشن نامی ادارہ نے بازار میں پیش کیا۔

یہ سافٹ ویئر بھی خوب استعمال ہوا۔ اخبارات، کتابیں، رسائل وجرائد کی کمپوزنگ اسی سے کی گئی۔یہ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں کام کرنے کی سہولت فراہم کرتا تھا اس لیے ونڈوز آپریٹنگ سسٹم استعمال کرنے والوں نے اس کا خوب استعمال کیا۔اس سافٹ ویئر کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ذریعے اردو سیکھنے میں بھی مدد ملتی تھی۔ابھی تک جن بالا سافٹ ویئر کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں کچھ نہ کچھ خامیاں ضرور آجاتی تھیں جس کی وجہ سے برابر بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش جاری تھی۔ان کی خامیوں کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے۔

(1) ان تمام سافٹ ویئر میں جو ڈسک آپریٹنگ سسٹم کی مدد سے چلائے جاتے تھے،اس کے استعمال کرنے والے کو تمام کمانڈس (ہدایتیں) لکھ کر استعمال کرنی پڑتی تھیں۔جس کے لیے کافی وقت درکار ہوتا تھا اور اکثر اس میں غلطیاں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔

(2) ان سب سافٹ ویئر میں پریویو کی سہولت بھی نہ تھی۔جس سے یہ پتا لگانا دشوار تھا کہ ٹائپ شدہ مواد کا نمونہ کاغذ پر کس شکل میں ظاہر ہوگا۔

اردو سافٹ ویئر کی دنیا میں آسٹریلیا میں تیار ہونے والا پارس نگار بہت اہمیت کا حامل ہے۔گرچہ یہ نسخ میں تحریر کرتا تھا لیکن اردو کو انٹرنیٹ پر متن کی شکل (Tex format) میں پیش کرنے کے لیے بہت معاون تھا۔اس کے خط فارسی کے خط سے بہت مطابقت رکھتے تھے جن کے لیے اردو ویب (Urdu Web) اردو چی چیٹ (Urdu Chechet) دو فانٹ (خط) کا استعمال کیا جاتا تھا۔اب اس میں تقریباً دو درجن فانٹ تیار کی جاچکی ہے۔ہندوستان میں اس کو اردو نیٹ نامی پورٹل کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ بنیادی طور پر اسے فارسی کے لیے انٹرنیشنل سسٹم کنسلٹنسی (InternationalSystems Consultancy) نامی کمپنی نے تیار کیا تھا۔لیکن بعد میں عربی، اردو، کردش اور اسیرین زبانوں کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔اب تک اس کے کئی ورژن آچکے ہیں۔اس کا جدید ورژن اردو یونی کوڈ کو بھی سپورٹ کرتا ہے۔یہ 32bit ونڈوز پر کام کرتا ہے۔سافٹ ویئر تیار کرنے والی کمپنی کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی مدد سے آپ عربی، فارسی اور اردو کو کورل ڈرا، پاور پوائنٹ میں استعمال کرسکتے ہیں۔کمپنی مزید دعویٰ کرتی ہے کہ اس کی مدد سے آپ ایچ ٹی ایم ایل ویب پیج تیار کرسکتے ہیں، ای میل کرسکتے ہیں۔

اب جبکہ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کا استعمال ہونے لگا تو 93-1992 میں کونسیپٹ سافٹ ویئر نامی کمپنی نے ان پیج سافٹ ویئر دریافت کیا۔اس سافٹ ویئر کے آتے ہیں دیگر تمام سافٹ ویئر کی اہمیت کم ہونے لگی اور رفتہ رفتہ یہ بازار سے غائب ہوکر تاریخ کے اوراق میں ثبت ہوگئے۔ان پیج مکمل طور پر اردو پبلشنگ کے لحاظ سے بنایا گیا تھا۔اس کی مدد سے کسی بھی اخبار یا جریدے کا مکمل صفحہ تیار کیا جاسکتا تھا۔اس کے استعمال اس کی اہمیت وافادیت کو دیکھتے ہوئے بڑی تیزی سے مشہور ہونے لگا اور 'ان پیج' اردو صفحہ سازی کا سب سے اہم سافٹ ویئر قرار پایا۔ان پیج کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے کمپنی نے اس کے کئی ورژن متعارف کرائے۔''ان پیج 1.1-، ان پیج 2.1 اور اس کا اہم ورژن ان پیج 2000 بازار میں آیا اور ابھی تک اس کا استعمال ہورہا ہے۔اس کو مزید بہتر بنایا گیا اس میں گرافکس، تصاویر کے ساتھ ساتھ سرخیاں بنانے اور لے آؤٹ ڈیزائن کرنے کی سہولت بھی دستیاب تھی۔اس کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس کو تصاویر، ایڈوب فوٹو شاپ (Adobe Photoshop) اور کورل ڈرا (Corel Draw) کے ساتھ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ کونسیپٹ سافٹ ویئر نے ونڈوز ایکس پی کو دیکھتے ہوئے 'ان پیج ایکس پی' بھی متعارف کرایا۔ ونڈوز ایکس پی میں ان پیج 2000 کو استعمال کرنے میں کچھ دشواریاں پیش آتی ہیں۔اس میں ان پیج2000 کو کھولتے ہیں کچھ ہدایتیں ایرر کی شکل میں

اسکرین پر ظاہر ہوتی ہیں جن سے گزر کر ہی ان پیج 2000 قابل استعمال ہوتا ہے۔ اس میں بھی بیچ بیچ میں بند ہونے جیسی پریشانیاں پیش آتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی کام کرتے ہوئے یہ خود بخود بند بھی ہو جاتا ہے اس طرح کی دشواریوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ شاید انھیں مسائل کے حل کے لیے کونسیپٹ سافٹ ویئر نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اس کو مزید بہتر بنا کر ''ان پیج ایکس پی کے نام سے نیا ورژن پیش کیا جائے۔ بہت سارے لوگوں نے ان پیج کو کاپی کر کے اپنے اپنے ناموں سے منسوب کر لیا ہے۔

ہم اس سے پہلے کے زمانے کی طرف اگر نگاہ ڈالیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ پہلے چھپائی کے کام کتنے دشوار اور محنت طلب ہوتے تھے۔ اس وقت ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں تھا اور ہم ان محدود وسائل کو بروئے کار لا کر اپنے کام انجام دیتے تھے۔ لیکن آج کی صورت حال بدل چکی ہے۔ اردو پبلی کیشنز میں مواد کی تیاری سے لے کر لے آؤٹ ڈیزائننگ تک سب کام کمپیوٹر کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے۔ یعنی جو سارے کام پہلے انگریزی اشاعت کے لیے تھا وہ اب اردو میں بھی ہو رہا ہے۔ اردو کمپیوٹنگ آگے بڑھ کر کمپوزنگ کی دنیا میں دوسری زبانوں کے مقابل کھڑی ہے۔

اس سے قبل جتنے اخبارات و جرائد، کتابیں شائع ہوتی تھیں وہ انسان کی خود کی محنت کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ لیکن انسان نے اپنی ذہنی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے ان دشوار ترین کاموں کو کمپیوٹر جیسی مشین کے حوالے کر دیا۔ پہلے کے دشوار ترین کام کا اندازہ ہم یوں لگا سکتے ہیں کہ پہلے کاتب تحریری مواد کی کتابت کرتا تھا۔ پھر اس مواد کی ایک ایک سطر کو کاٹ کر جگہ کی مناسبت سے سطر پر چپکایا جاتا تھا پھر یہ پلیٹ پریس میں جاتی تھی۔ جہاں سے اخبار چھپ کر ہم تک پہنچتا تھا۔ لیکن آج ان پیج ہمارے پاس ایک ایسا ذریعہ ہو گیا ہے جس نے ان ساری منزلوں سے گزرنے سے ہمیں بچا لیا ہے۔ اب اخبارات، کتابوں کی ڈیزائن اور کمپوزنگ کمپیوٹر کی مدد سے بہت عمدہ اور دلکش انداز میں ہونے لگی ہے۔

ویسے دیکھا جائے تو بازار میں اردو کمپوزنگ کے لیے کئی طرح کے سافٹ ویئر دستیاب ہیں لیکن سبھی پر ان پیج کو فوقیت حاصل ہے اور اس کا استعمال بہت زیادہ ہو رہا ہے اور یہ بات بھی صد فی صد درست قرار پاتی ہے کہ 'ان پیج' کے مقابل کوئی سافٹ ویئر بازار میں نہیں ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت اور مقبولیت پر اردو کمپیوٹنگ ماہر عمران لاری یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''یوں تو اس وقت بازار میں اردو کمپوزنگ کے حوالے سے کئی سافٹ ویئر دستیاب ہیں لیکن ان میں سے بہترین اور سب سے زیادہ استعمال ہونے والا سافٹ ویئر ان پیج ہی ہے۔ یہ اپنی خصوصیت کی وجہ سے تقریباً ہر پبلشنگ ہاؤس میں استعمال ہو رہا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں کام کرتا ہے۔ اس لیے گرافکس کو بھی بہت بہتر انداز سے سپورٹ کرتا ہے۔''

عمران لاری کے مذکورہ بیان سے اِن پیج کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ان پیج کمپوزنگ کے لیے ایک مکمل سافٹ ویئر ہے اور اس کو اردو ورڈ پروسیسنگ میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان پیج کی خصوصیات ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

1. اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ونڈوز کے تصویری ماحول میں کام کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے

استعمال کرنے والے کو بہت آسانی ہوتی ہے اور اس میں کام کرنے میں کوئی دشواری معلوم نہیں ہوتی۔

2. اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جیسا یہ اسکرین پر دکھاتا ہے۔ ویسا ہی کاغذ پر پرنٹ کرتا ہے جو کہ اس سے پہلے کے سافٹ ویئر میں نہیں تھی۔

3. اس میں مختلف طرح کے خوبصورت بارڈر بھی لگائے جا سکتے ہیں۔

4. اردو پیراگراف کے اندر انگریزی کو آسانی سے رکھ سکتے ہیں۔

5. اس میں تصاویر، گرافکس کو بھی ڈال سکتے ہیں۔

6. اردو اور انگریزی کو اکٹھے لکھ سکتے ہیں

7. اردو کو فوٹو شاپ میں لے جا کر خوبصورت ڈیزائن بنائی جا سکتی ہے۔

8. کورل ڈرا میں سرخیوں کو دلکش بنانے کی سہولت دستیاب ہے۔

9. اس میں اپنی مرضی کے مطابق کی بورڈ سیٹ کر سکتے ہیں

10. ٹروٹائپ فانٹ کی سہولت ہے۔ جس کی مدد سے الفاظ کو بآسانی چھوٹا بڑا کیا جا سکتا ہے۔

11. اس سافٹ ویئر کی مدد سے آپ ویب صفحات میں تصاویر استعمال کرنے کی غرض سے تحریر کو بطور Gif,JPEG کے ایکسپورٹ کر سکتے ہیں۔

12. یہ تحریر کو تین گنا سے تین سو فیصد تک بڑا دیکھنے کی سہولت دیتا ہے۔

13. یہ سافٹ ویئر تحریر کو 1024 پوائنٹس تک بڑا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

14. آپ لفظ کو باہر یا اندر کی طرف پھیلا یا سکوڑ سکتے ہیں۔

15. تحریر کو بولڈ، اٹالک بھی کر سکتے ہیں۔

16. ان میں رنگوں کی مدد سے تحریر کو مختلف رنگوں سے رنگ سکتے ہیں۔

17. یہ پیج بنانے اور ڈیزائننگ کے لیے 10 سے زائد ڈیزائننگ ٹولز مہیا کرتا ہے۔

18. اس میں مونوٹائپ، مقتدرہ، آفتاب، کردش، کشمیری، فارسی، فونیٹک اور یوزر ڈیفائنڈ (یعنی استعمال کرنے والا خود بھی اپنی سہولت کے مطابق اسے سیٹ کر سکتا ہے جسے یوزر ڈیفائندہ کی بورڈ کہا جاتا ہے۔

ابھی چند برس قبل برس ہندوستانی حکومت نے سافٹ ویئر کمپنی سی ڈیک (C-DAC) کے ذریعے ہندوستان کی تقریبا ایک درجن سے زائد زبانوں میں سافٹ ویئر کی سی ڈی جاری کی تھی۔ یہ حکومت کی جانب سے مفت تقسیم کرائی گئی تھی۔ اردو میں اس کو اردو سافٹ ویئر ٹولز کے نام سے جاری کیا گیا تھا جس میں کچھ فانٹ بھی تھیں لیکن یہ سافٹ ویئر مقبول نہ ہو سکا۔

یہ تو تذکرہ تھا اردو سافٹ ویئر کا لیکن اب کمپیوٹر میں اردو طرز تحریر کا سفر یونیکوڈ تک کی منزل تک جا پہنچا ہے۔ جس کی مدد سے اردو کو مائیکروسافٹ ورڈ میں تحریر کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی تحریر دیدہ زیب بنانے کے لیے جمیل نوری نستعلیق اور علوی نستعلیق سمیت درجنوں یونی کوڈ سپورٹ کرنے والی فانٹ دستیاب ہیں۔ آج اردو سافٹ ویئر کی تاریخ 30 برس سے زائد عرصہ پر محیط ہو چکی ہے اور ترقی کی جانب عمل پیہم میں مصروف ہے۔

■

MAZHAR HASNAIN, 212-E, Mahanadi Hostel, JNU, New Delhi - 110067

ایس ایس رضا

ذیابیطس
ایک مہلک مرض

ایک مجموعی تخمینے کے مطابق اس وقت دنیا میں تقریباً ساڑھے اٹھائیس کروڑ افراد ذیابیطس کے مرض میں مبتلا ہیں، جب کہ سن 2000 میں ان کی تعداد صرف پندرہ کروڑ تھی، اور ایک اندازے کے مطابق اگر اس مرض پر خاطر خواہ قابو نہ پایا جاسکا تو 2030 تک یہ تعداد تقریباً 43 کروڑ تک تجاوز کر جائے گی، جو شمالی امریکہ کی کل آبادی کے برابر ہے۔ ایک غور طلب امر یہ ہے کہ دنیا میں اس مرض میں مبتلا ہر تین افراد میں سے ایک فرد ہندوستان اور چین کے باشندہ ہیں۔

ذیابیطس کو طرز زندگی کا مرض (Life styles disease) بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ بیشتر افراد کھیل کود اور جسمانی کثرت پر توجہ نہیں دیتے ہیں۔ اور بے عملی کی زندگی گزار دیتے ہیں اور بیٹھ کر کام کرنے کو فوقیت دیتے ہیں۔

خاص طور پر ذیابیطس کا مرض ان افراد کو لاحق ہوتا ہے جن کے Pancrease سے انسولین نام کے ہارمون کی رطوبت کم ہوجاتی ہے۔ غذا، نظام، ہاضمہ میں داخل ہونے کے بعد Glucose (شکر)، میں تبدیل ہوجاتی ہے اور یہ شکر (Glucose) خون میں شامل ہوجاتی ہے۔ اور خون کے توسط سے یہ خلیوں (Cells) میں اور پھر جسمانی اعضا میں پہنچ جاتی ہے۔ شکر کو خلیہ کی دیواروں میں سرایت کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے Insulin کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان جب غذا لیتا ہے تو خون میں شکر کی مقدار میں اضافہ ہوجاتا ہے اور نظام ہاضمہ Pancrease کو انسولین پیدا کرنے کی تحریک دیتا ہے—!

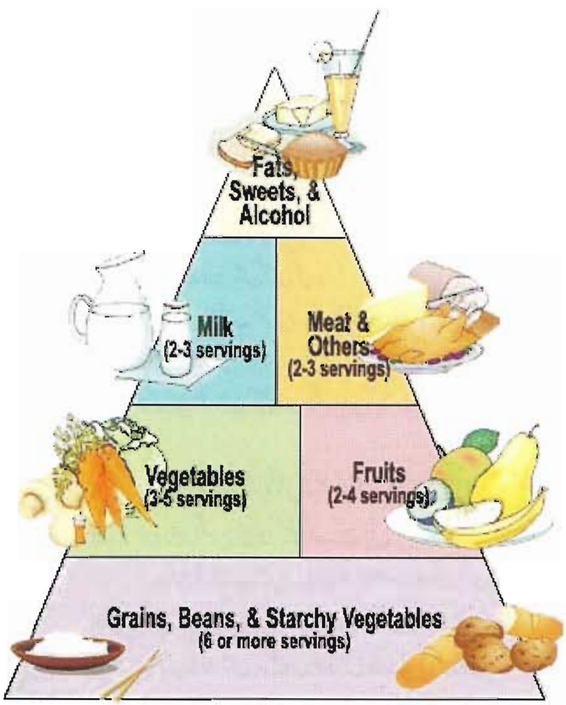

ذیابیطس دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ Type-1 ذیابیطس میں مریض کا دفاعی نظام کمزور ہوجاتا ہے اور Pancrease میں موجود Cell کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ Inculin, Cell پیدا کرتے ہیں۔ لیکن نقصان کے باعث یہ insulin Cell کی پیدائش کو کم کردیتا ہے یا بالکل روک دیتا ہے۔ اس قسم کا ذیابیطس عام طور پر 20 سال سے کم عمر کے لوگوں کو ہوتا ہے—Type-II ذیابیطس میں مریض کا جسم یا نظام ہاضمہ، Insulin کو استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے، جس کے سبب خون میں شکر کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے، اور Insulin Pancrease پیدا کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ نتیجتاً Pancrease کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے آخر کار Pancrease کو نقصان پہنچتا ہے۔ عام طور پر اس قسم کا ذیابیطس 50 سال سے زائد کے عمر کے لوگوں کو ہوتا ہے۔

حاملہ عورتوں میں بھی یہ مرض پایا جاتا ہے جسے Gestational Diabetes کہا جاتا ہے۔ لیکن بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی یہ ختم ہوجاتا ہے۔ تاہم ان عورتوں میں Type-2

ذیابیطس ہونے کا خطرہ بہت رہتا ہے۔ اگر خون میں شکر کی مقدار آٹھ گھنٹے کی فاقہ کشی کے بعد 100 سے کم ہے تو آپ بالکل صحت مند ہیں۔ 125-100 تک کی حد میں خون میں شکر کی مقدار آپ کے Pre - Diabetes ہونے کی تصدیق کرتی ہے۔ اور اگر خون میں شکر کی مقدار 125 سے زیادہ ہے تو مریض Diabetic کہلاتا ہے۔ اسی طرح اگر کھانا کھانے کے بعد یا 200ml پانی میں 75 گرام گلوکوز ملا کر پینے کے بعد جانچ کرنے کے بعد اگر خون میں شکر کی مقدار 140 سے کم ہے تو آپ صحت مند ہیں۔ اگر یہ مقدار 199-140 کے درمیان ہے تو یہ Pre-Diabetes ہونے کی علامت ہے اور اگر یہ مقدار 200 سے زائد ہے تو آپ Diabetic کہلاتے ہیں۔

زیادہ پیشاب ہونا اور پیاس کی شدت میں اضافہ ہونا اس مرض کی خاص علامتیں ہیں۔ اس مرض کا تعلق موٹاپے (Obesity) سے بھی ہے۔ اس لیے ماہرین کی رائے ہے کہ انسان کو موٹاپے سے بچنا چاہیے۔ کیونکہ موٹاپا خود ایک مرض ہے اور کئی امراض کو پیدا کرنے کا باعث۔ ایک بات اور غور طلب ہے کہ ہندوستان میں زیادہ تر افراد میں ذیابیطس کے مرض کے لاحق ہونے کا اندیشہ بنا رہتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک موروثی مرض بھی ہے اور یہ بعض لوگوں کے gene میں موجود رہتا ہے۔ ہندوستانیوں کے gene کی بناوٹ اور ساخت اس طرح ہوتی ہے کہ یہ بھوک کو برداشت کرنے کی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے لیکن بسیار خوری کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

سال میں کم از کم ایک بار ذیابیطس کی جانچ بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ اگر Pre-Diabetes کی تصدیق ہو جاتی ہے تو مریض اس صورت حال پر ابتدا سے ہی قابو پا سکتا ہے، اور اس طرح مکمل Diabetes کو ٹالا جا سکتا ہے اس مرض پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ایک مخصوص طرز زندگی کو اپنایا جائے۔ اس مرض کو قابو میں رکھنے کے

> زیادہ پیشاب ہونا اور پیاس کی شدت میں اضافہ ہونا اس مرض کی خاص علامتیں ہیں۔ اس مرض کا تعلق موٹاپے (Obesity) سے بھی ہے۔ اس لیے ماہرین کی رائے ہے کہ انسان کو موٹاپے سے بچنا چاہیے۔ کیونکہ موٹاپا خود ایک مرض ہے اور کئی امراض کو پیدا کرنے کا باعث۔ ایک بات اور غور طلب ہے کہ ہندوستان میں زیادہ تر افراد میں ذیابیطس کے مرض کے لاحق ہونے کا اندیشہ بنا رہتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک موروثی مرض بھی ہے اور یہ بعض لوگوں کے gene میں موجود رہتا ہے۔

لیے سب سے ضروری اور کارآمد چیز ہے، صبح کی سیر اور جسمانی کثرت۔ صبح کی سیر کو روزانہ کا معمول بنانا اس مرض کے لیے اکسیر ہے۔ اس سے Insulin کی رطوبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذیابیطس کا ابھی تک کوئی موثر اور یقینی علاج نہیں ہے۔ البتہ اسے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے غذا پر کنٹرول بے حد ضروری ہے۔ غذا کے صحیح انتخاب اور کثرت اور صبح کی سیر سے اس مرض پر خاطر خواہ حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

اس کے لیے ایک مخصوص اور محتاط طرز زندگی کو اختیار کیا جائے۔ صبح کی سیر کی روزانہ کے معمول میں شامل کیا جائے یا روزانہ کم از کم آدھے گھنٹے تک جسمانی کثرت کی جائے۔ اس سے انسولین کی رطوبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ غذا میں carbohydrate کا استعمال کم سے کم کیا جائے شکر اور نشاستہ سے احتراز کیا جائے۔ اگر موٹاپے سے پریشان ہیں تو فوراً موٹاپے کو کم کرنے کے لیے gyne یا clinic سے رجوع کرنا بے حد ضروری ہے۔ ایسی غذا جس میں شکر کی مقدار کم ہو یا بالکل نہ ہو، ذیابیطس کے مرض کے لیے بے حد مفید ہے۔ ریشے دار اناج اور ریشے دار پھل اور سبزیوں کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ بغیر چھنا ہوا آٹا ذیابیطس کے مریض کی اولین ضرورت ہے۔ ایسے اناجوں میں دلیہ، براؤن چاول، چھلوں کے ساتھ دال، جو، کالا چنا بالخصوص انکور کیا ہوا چنا شامل ہے۔ پھل کے انتخاب میں بھی ذیابیطس کے مریضوں کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ پپیتا، امرود، ناشپاتی، موسمی، انناس وغیرہ ایسے پھل ہیں جنھیں ذیابیطس کے مریض کھا سکتے ہیں۔ لیکن اس بات کا خاص دھیان رکھا جائے کہ ان پھلوں کو قدرتی شکل میں کھایا جائے نہ کہ ان کے عرق نکال کر۔

کالے چنے کے ساتھ بارلی یا جو کا استعمال ایک مفید غذا ہے۔ نباتاتی پودے جو مسالہ بنانے کے کام آتے ہیں وہ بھی ذیابیطس کے مریضوں کے لیے کارآمد ہیں۔ مثلاً دارچینی، ادرک، آملہ، کریلہ وغیرہ۔ کریلہ اس مریض کے لیے بے حد مفید ہے۔ کریلے کی سبزی اس مرض کو کافی حد تک قابو میں رکھتی ہے۔ اس کے عرق کا استعمال بھی بے حد مفید ہے۔ نیم کے بیجوں کے سفوف جامن کے بیج کے سفوف اور کریلے کے سفوف کو برابر برابر مقدار میں ملا کر روزانہ استعمال سے ذیابیطس کے مرض کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔

S S Raza, C/O, Zafar Imam, Road No A/8, Alinagal Colony, Anisabad, Patna -2 (Bihar)

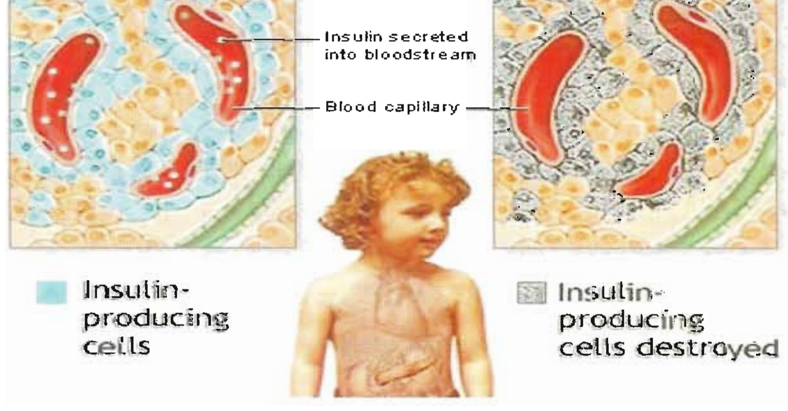

تبصرہ وتعارف

کلیاتِ سودا (جلد دوم)

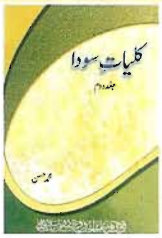

مرتب : پروفیسر محمد حسن
صفحات :240، قیمت :60روپے
ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
تبصرہ نگار: خورشید جہاں،4A/58، وشال کھنڈر چار، گومتی نگر لکھنؤ

قومی کونسل نے اردو کی ترقی کے لیے ہمہ جہت سعی و جہد سے کام لیا ہے۔ اردو زبان کے فروغ میں کونسل نے وہ تمام ذرائع استعمال کیے جو ممکن رہے۔ اس کام کے لیے اردو کونسل نے قدیم و جدید اردو متون، خواہ وہ نظم میں ہوں یا نثر میں، سب کا اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے انتخاب کیا۔

پروفیسر محمد حسن کی مرتب کردہ کتاب 'کلیات سودا' (جلد دوم) کو اردو کونسل نے اپنے ذرائع سے شائع کیا اور اردو قارئین تک کم قیمت میں پہنچایا۔ 'کلیات سودا' (جلد دوم) دراصل مرزا محمد رفیع سودا کے مراثی وسلام کو محیط ہے۔ حالانکہ اردو قصیدہ نگاری میں سودا کا نام جلی حروف میں لکھنے کے لائق ہے۔ مدح و ہجو میں سودا نے نمایاں کارکردگی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ تاہم اردو مرثیہ نگاری اور صنف سلام میں بھی خوب طبع آزمائی کی ہے۔ کلیات سودا جلد دوم کی ترتیب و تدوین میں محمد حسن نے بڑی تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے اور کتاب کی تدوین میں سودا کے کلام و مرتبہ کلیات کا باریک بینی سے تجزیہ و محاکمہ کے بعد ہی 'کلیات سودا' جلد دوم کی ترتیب کی ہے۔ محمد حسن کی تحقیق کے مطابق سودا کی زندگی میں مرتبہ کلیات مراثی سے خالی ہیں۔ تاہم ان کے دیگر مخطوطے میں مرثیے دریافت ہوئے ہیں۔ بقول پروفیسر محمد حسن:

''سودا کی زندگی میں مرتب کیے ہوئے اکثر کلیات مراثی سے خالی ہیں، مثلاً نسخۂ حبیب گنج اور نسخہ انڈیا آفس میں ایک مرثیہ بھی شامل نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ کلیات سودا کے کسی معتبر اور مستند مخطوطے میں ان کے مراثی شامل نہیں ہیں مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ کئی مخطوطے ایسے ہیں جن میں ان کے مراثی موجود ہیں۔ گو ان مراثی کی تعداد مختلف ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ سودا کی مرثیہ نگاری مسلمہ ہے اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔''

پروفیسر محمد حسن کو سودا کی مرثیہ نگاری سے متعلق اس قدر وضاحت کیوں کرنی پڑی۔ کہیں نہ کہیں کوئی خامی ضرور ہے جس کی بنا پر سودا کو بحیثیت مرثیہ نگار شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ دراصل معاملہ یوں ہے کہ سودا کے بہت سے مراثی میں مہربان خاں کا نام آیا ہے جس کی وجہ سے مراثی سودا پر مہربان خاں کی تخلیق ہونے کا شبہ ہوا۔ اگرچہ الحاقی مراثی کا گمان ہے۔ حالانکہ اس دور میں امرا و روسا کے نام سے کلام لکھے جاتے تھے۔ اس میں کوئی عیب نہیں تھا۔ اسی روش پر سودا کے ان مراثی کا لحاظ کیا جائے گا جو مہربان خاں کے نام سے تخلیق ہوئے ہیں۔

اسلوب کے اعتبار سے محمد حسن نے سودا کے مراثی کو تین خانوں میں جگہ دی ہے۔ ایک وہ مراثی ہیں جن کا لب ولہجہ عوامی ہے جن کی زبان عوامی بول چال کی ہے۔ جذبات و خیالات میں بہت رفعت نہیں ہے جب کہ سودا رفعت خیال، پرشکوہ زبان اور بلند آہنگ شاعر تھے۔ سودا نے قصیدہ نگاری میں جس شان وشوکت، رنگین خیالی اور جوش و ولولہ دکھایا ہے یہ ان کا فطری شاعرانہ اسلوب ہے۔ دوسری قسم کے مراثی اسی طرز پر تخلیق کیے گئے ہیں جس میں قصیدے کا آہنگ ہے۔ تیسری قسم واقعہ نگاری کے انداز پر ہے۔ اس میں کربلا کے واقعات کا بیان مع جزیات ہوا ہے۔

محمد حسن نے سودا کی کلیات میں 11 سلام، 16 مرثیہ امام حسین اور 3 مرثیے امام قاسم پر لکھے۔ اس کے علاوہ 32 مرثیہ ہیں۔ دیگر میں 20 مرثیے امرا و روسا کے لیے ہیں۔ اسی طرح 70 مرثیہ و مخمس اور مسدس و مرثیہ لکھے اور مرثیہ دوازدہ بھی لکھے۔ محمد حسن نے سودا کی ذہانت اور ذکاوت کو کلیات سودا میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا۔ ان کی عظمت اور شہرت قصیدے پر منحصر ہے۔ مراثی سودا کا ایک اسلوب ہندوستانی تہذیب کا نمائندہ ہے۔ سودا نے ارجن کی شجاعت اور کرشن کی محبت جیسے خوبصورت واقعات کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنا کر وطن پرستی کا ثبوت دیا ہے۔ دلی کے تمام روسا سودا کے قدردان تھے۔ نواب شجاع الدولہ والی لکھنؤ نے اسے بڑے احترام اور اشتیاق سے بلا لیا۔ مگر سودا نے دلی چھوڑنا گوارا نہ سمجھا۔ مرزا سودا، میر تقی میر کے ہمعصر اور اپنے زمانے کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان کے مرثیے وسلام اور ان کی غزلیں اپنے رنگ میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ لیکن درد واثر، سوز وگداز، غزل کی جان ہے، سودا کے کلیات میں نمایاں ہے۔ محمد حسن نے مرثیہ وسلام کا تعارف اور کرداروں کی تفصیل کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے مرثیہ سے متعلق وہ تمام یادیں فراہم کردی ہیں جن کے بغیر مرثیہ کے مطالعے کا حقیقی تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مغربی تعلیم اور مسلمان

مترجم/مصنف: مسرور علی اختر ہاشمی
صفحات:240، قیمت 74 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر ابوشہیم خاں، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی 110007

پندھوریں صدی کی آخری دہائی میں پرتگالیوں نے ہندوستان میں تجارت سے سیاست کا جو سفر شروع کیا تھا وہ مختلف یورپی قوموں کے ہاتھوں ہوتا ہوا 1858 میں ضرر پذیر ہندوستان پر برطانوی استعماری تسلط کے ساتھ تمام ہوا۔ قیادت کی یہ خونبار تبدیلی زندگی کے مختلف رویوں اور سرکاروں کے مابین تصادم کی شکل میں ظاہر ہوئی اور دیکھتے دیکھتے مغربی تسلط، تعلیم وتہذیب کے ردوقدح کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ دوسری قوموں کے ساتھ 1857 کے اصل معتوب مسلمانوں کے رویوں میں سست رو اور محتاط تبدیلی آنی شروع ہوئی اور مغربی تسلط، تہذیب وتعلیم کے چیلنجز کو قبول کرتے ہوئے دیگر اقدام کے ساتھ مسلم قوم کی ذہن سازی اور کردار سازی کی غرض سے تعلیمی اداروں کے قیام پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی۔

زیر تبصرہ مترجمہ کتاب 'مغربی تعلیم اور مسلمان' ایک تحقیقی مقالہ ہے جو 1989 میں Muslim Response to western education کے نام سے چھپ کر طلبہ و

اساتذہ کے لیے مفید مطلب ثابت ہوا۔ ظاہر ہے اس طرح کی کتابوں کی عصری معنویت اداروں کے اغراض و مقاصد کے حصول و انحراف کے تئیں خود احتسابی اور نئے سیاق میں نیا لائحۂ عمل، نصاب تعلیم اور طریقۂ تدریس وضع کرنے میں معاون ہونے کے ناطے ہمیشہ برقرار رہے گی۔

کتاب کا باب اول 'برطانوی دور میں تعلیم کی نشو ونما' ہے جس میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے سماجی سیاسی حالات نیز اس دور میں تعلیم کی نشو ونما پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی انگریزوں کے ذریعے مدرسے/ ہندو سنسکرت کالج مختلف اسکولوں، اسکول بک سوسائٹیوں، پبلک انسٹرکشن کمپنیوں، یونیورسٹیوں کے قیام/ برطانوی پارلیمان اور اہل کاروں کے ذریعے موافق اذہان کی تیاری کی غرض سے سرمایہ کاری اور ہندوستانی تعلیم میں دخل اندازی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ برطانوی چیلنج کی وسعت اور عام ہندوستانی مسلمانوں کے جوابی تنوع کو عام قاری کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی مختلف مسلم اصلاحی تحریکوں/ عیسائی مشنریوں کے خفیہ ایجنڈوں اور مسلمانوں کے حدشات کا بھی ذکر ہے۔ اس طرح اس باب کے مطالعے کے بعد اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کے سماجی، سیاسی اور تعلیمی حالات کا پورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔

باب دوم 'دارالعلوم دیوبند' ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں کا راست اور سرگرم تعلق 1857 کی بغاوت سے تھا اور یہ ادارہ صرف مغربی علوم کے چیلنج کا ہی جواب نہیں تھا بلکہ چیلنجوں کے اس پورے سلسلے کا جوابی عمل تھا جو مغربی تہذیب و سیاست نے انیسویں صدی میں مسلمانوں کے لیے پیدا کردیے تھے۔ مدرسے کے پہلے طالب علم پھر اسی مدرسے کے مہتمم شیخ الہند مولانا محمود حسن نے یہی تاثر قائم کرنے کے لیے کہا تھا کہ

''کیا میرے استاد مولانا نانوتوی نے یہ مدرسہ صرف پڑھنے پڑھانے کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میری موجودگی میں قائم ہوا تھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ ادارہ 1857 کی بغاوت کی ناکامی کے بعد ایک ایسا مرکز بنانے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا جہاں ایسے افراد کی تربیت ہوسکے جو 1857 کی ناکامیوں کی تلافی کرسکیں، اس طرح یہ ادارہ اپنے قیام کے روز اول سے برطانیہ مخالفت رہا اور جب تک برطانوی حکومت ختم نہ ہوگی مخالفت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ یہ مخالفت صرف سیاسی سطح پر نہیں کی تھی بلکہ برطانیہ کے تعلیمی/ مذہبی/ ثقافتی ہر چیلنج کو دارالعلوم نے قبول کیا اور بانیوں و ذمے داروں نے اس کا اسلامی متبادل فراہم کیا۔ جیسا کہ نصابات، اغراض و مقاصد کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔ باب سوم 'ایم او کالج علی گڑھ' ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی طرح یہ ادارہ بھی انیسویں صدی کے اس چیلنج کا جوابی عمل تھا جو مغربی تعلیم و تہذیب نے پیدا کیا تھا۔ لیکن دونوں اداروں کے سارے ہی معاملات میں اختلافات تھے۔ دیوبند کے برعکس علی گڑھ برطانیہ حامی تھا۔ اور مغربی تعلیم و تہذیب کے تئیں مثبت رویہ رکھتا تھا۔ تاکہ امن وامان کا ماحول پھر سے قائم کیا جاسکے۔ اور ملک میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرح مسلمانوں میں مغربی تعلیم حاصل کرکے ان کے شانہ بہ شانہ چل سکیں۔ مایوسی اور محرومی کے دور سے نکل کر نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرکے دین و دنیا دونوں میں اپنی معنویت قائم کرسکیں۔

باب چہارم 'دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ' ہے۔ تاریخ وار ترتیب کے اعتبار سے تیسرا ادارہ ندوۃ تھا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد مسلم معاشرے میں علما کی گم گشتہ عزت و احترام کی بازیابی تھا۔ نیز دارالعلوم دیوبند اور ایم او کالج علی گڑھ جن مقاصد کے حصول سے کسی حد تک قاصر تھے ان کی تکمیل تھی۔ اس کے لیے نیا نصاب اور نیا طریقۂ تدریس وضع کیا گیا۔ ملکی اختلافات ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ افہام و تفہیم کے دائرے کو وسیع کرکے مخالفین اسلام اور مغربی تہذیب کے داعیوں کو اس کے اندر شامل کرلیا، رویوں کی یہ لچک مذہبی اور متعلقہ علوم، معیشت و معاشرت اور نئے تقاضوں کا بہتر ادراک رکھنے والے ایسے علما تیار کرنے کا محور اور محرک ثابت ہوئی، جس کا بین ثبوت یورپ اور امریکہ میں قائم اسلامی اداروں میں اپنی خدمت انجام دے رہے 'پرانے' ندویوں کی وافر تعداد ہے۔

باب پنجم 'جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی' ہے۔ بانیان جامعہ نے جس ادارے کا خواب دیکھا تھا وہ سیکولر علی گڑھ اور دینی دیوبند کا حسین سنگم تھا اور کسی حد تک علی گڑھ کے بنیادی اغراض و مقاصد سے منحرف ہونے کا کفارہ تھا۔ بقول مصنف ''جامعہ اس احساس کے سائے میں صفحہ 229 دیگر ابواب کی طرح اس باب میں ادارے کے قیام کا تاریخی پس منظر، خصوصیات غرض و غایت، نصابات، طریقہ تعلیم و تدریس تاریخی حوالوں سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ چونکہ یہ مقالہ 1989 میں شائع ہوا تھا اس لیے صرف اس کی مدد سے مذکورہ اداروں کی موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش لاحاصل ثابت ہوگی۔ بہرحال 'مغربی تعلیم اور مسلمان' کے موضوع پر قابل قدر کتاب ہے۔ امید ہے کہ جس طرح انگریزی داں طبقہ نے اس کی پذیرائی کی تھی اسی طرح اور حلقوں میں بھی یہ کتاب مقبول ہوگی، مترجم اصل تخلیق کار تو ہیں ہی لیکن بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ وہ ایسا نظر بھی آتے ہیں۔

آدم زاد پری لوک میں

مصنف: ضمیر درویش

صفحات: 38، قیمت: 10 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عارف حسین عثمانی، G9/7، بٹلا ہاؤس، نئی دہلی 25

بچے قوم وملت کی امانت ہیں، ان کی پرورش، نگہداشت، تعلیم و تربیت اور ان کی معصوم شخصیت کو سجانے اور سنوارنے کے لیے جو قدم اٹھائے جائیں گے، ان کے نتائج اُسی وقت بہتر آسکتے ہیں، جب والدین، اساتذہ اور جملہ متعلقین اپنی اپنی ذمے داریوں کا احساس کرتے ہوئے اسے بجا طور پر انجام دیں خصوصاً ماں کی گود اور گھریلو ماحول بچے کی زندگی پر گہرا اثر اس لیے ڈالتے ہیں کہ دن ورات ان کا ساتھ رہتا ہے۔ دورانِ پرورش بچوں کو اچھی عادتیں سکھانا جیسے سچ بولنا، بڑوں کی عزت کرنا، آپس میں مل جل کر کھیلنا، کھانا وغیرہ مستقبل کے لیے نہایت کارآمد ہے۔

بچوں میں خصوصاً کہانی سننے کا بڑا شوق ہوتا ہے، اور یہ سلسلہ قدیم زمانے سے ہی گھروں میں رائج ہے، نانی، دادی، ماموں وغیرہ اس عمل کو انجام دیتے ہیں۔ رات کو سوتے وقت اکثر بچوں کی فرمائش اور اصرار پر یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ حالانکہ آج کے ترقی یافتہ دور میں کہانیوں کے لکھنے، کہنے اور سنانے کے ڈھنگ اور طریقے میں کافی تبدیلی آئی ہے پھر بھی، جن، بھوت، پریوں کی کہانیاں اور قصے بچے بڑے شوق اور ہمہ تن گوش ہوکر سنتے ہیں، کہانی سنانے کا مقصد جہاں ایک طرف بچوں میں اچھے اور برے کی تمیز پیدا کرنا، بزدلی سے بچنا، بہادر بننا ایک دوسرے کی مدد کرنے میں آگے رہنا، پریشانیوں، اور مصیبتوں سے مقابلہ کرکے فتح حاصل کرنا ہوتا ہے، وہیں دوسری جانب وقت کا صحیح استعمال، ان کی زبان وبیان، اور خاموشی سے دوسروں کی بات کو سننے کی عادت ڈالنا بھی ہے۔

زیر تبصرہ کہانی 'آدم پری لوک میں' ایک ایسی کہانی ہے جو پریوں، آدم زاد، جن اور راکشس وغیرہ کے اردگرد گھومتی ہے۔ ضمیر درویش نے اسے دلچسپ اور سہل زبان میں لکھ کر مزید پرکشش بنا دیا ہے، کہانی کے خالد، سہیل، اشوک اور من جیت سنگھ آدم زاد کردار ہیں، جب کہ پریوں کی رانی نیلم پری اور اُس کی ساتھی پریاں، اور راکشس لوہمک بھی ہیں، یہ راکشس رانی پیری کا دشمن ہے مگر گلگلا وا ایک وفادار راکشس ہے۔

'آدم زاد پری لوک کہانی' میں گیارہ چھوٹے چھوٹے حصے اور ہر حصے میں چھوٹے چھوٹے کئی واقعات رونما ہوتے ہیں، لیکن وہ آپس میں مربوط ہیں کہانی کا تسلسل اور اس میں پیش آنے والے حیرت سے بھرپور واقعات اُسے مزید دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

ضمیر درویش اس کہانی کے ذریعے کئی اہم نکات کی جانب اشارے کرکے انسانی فطرت، پریوں کی خصلت اور راکشسوں کی طاقت کو بخوبی اجاگر کرتے ہیں۔ کہانی کی ابتدا بڑے اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے اس کے تحت خالد اور ان کے دوست ضرورت مند بچوں کو گاؤں سے تلاش کرکے اُن کی پڑھائی کے سلسلے میں اُن کی معاونت کرتے ہیں، ایک چرواہے بچے کی مدد ان بچوں کے ذریعے کی جاتی ہے اور اسی مدد کے نتیجے میں خالد پریوں کے دیس پہنچ جاتے ہیں، حالانکہ پریوں کی دنیا خالد کی دنیا سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ حیرت واستعجاب سے بھرپور، رانی نیلم پری اور خالد ایک دوسرے کی قدم قدم پر مدد کرکے آگے بڑھ رہے ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ نیلم پری ایک موقعے پر خالد سے کہتی ہے کہ ''تمھاری دنیا کے بارے میں پری لوک میں اچھی رائے نہیں تم لوگ مذہب اور ذات پات کے نام پر خون خرابہ کرتے ہو تمھارے یہاں لالچ، جھوٹ، دھوکہ اور بے ایمانی عام ہے۔ پری لوک والے یہ باتیں پسند نہیں کرتے۔''

نیلم پری بھی اپنے ہی لوک میں اپنے لوگوں کے درمیان رہ کر بھی محفوظ نہیں ہے، لوہمک پری کا دشمن ہے، جو اس کی سلطنت کو ختم کرنا چاہتا ہے، خالد اپنی آدم زاد چالوں اور ترکیبوں سے اُسی کے ساتھ راکشسوں کے ہاتھوں اُسے ختم کروا دیتا ہے۔

نیلم پری کا دوسرا دشمن بھونچال راکشس ہے اسے بھی خالد اپنی بہادری اور سوجھ بوجھ سے ختم کر ڈالتا ہے، پری نیلم کے ذریعے دی گئی جادوئی ٹوپی قدم قدم پر خالد کو بچاتی ہے اور اپنے کمال سے اُسے دشمنوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

بھونچال کے خاتمے کے بعد ہر طرف خالد کی جے جے کار ہوتی ہے اور نیلم پری، اور دوسری پریوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا، اب خالد کو اپنی دنیا کی یاد ستاتی ہے، اس کے اسکول کھلنے والے ہیں، پھر اُسے غریب بچوں کی بھی تو مدد کرنی ہے وہ پری لوک سے رخصتی چاہتا ہے۔ نیلم پری اور پریاں، اُسے آنسوؤں سے رخصت کرتی ہیں، اور اُس کے آدم زاد ہوکر بھی اپنی مدد پر اُس کو انعام واکرام سے نوازنا چاہتی ہیں، مگر وہ انکار کرکے بذریعہ اُڑن کھٹولہ اپنی دنیا میں واپس آجاتا ہے۔

اس کہانی کے ذریعے یہ سبق دیا گیا ہے کہ چاہے انسانوں کی دنیا ہو یا پریوں کی دنیا اچھے اور برے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں، اور صرف عمل کی بنا پر ہی وہ اچھے اور برے بنتے ہیں، سدا ہی نیک اور اچھی قدرت کا نہ صرف چلن رہا ہے بلکہ اُن کی قدر دانی ہوئی ہے۔

آج بچوں کے ادب کی جانب اتنی توجہ نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے بچوں کے لیے خوب لکھیں اور ان میں وہ صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کریں، جس کی ملک وقوم کو بے پناہ ضرورت ہے۔

مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک

مصنف: نظام صدیقی، مرتب: ڈاکٹر محمد ہادی رہبر

صفحات: 408، قیمت: 400

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، اے 170، سوریا اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی – 95

مبصر: حقانی القاسمی، ڈی-64، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی – 25

اپنی مخصوص لفظیات، اصطلاحات اور اختراعات کی وجہ سے الگ شناخت قائم کرنے والے نظام صدیقی کا شمار مابعد جدیدیت کے نمایاں دستخطوں میں ہوتا ہے۔ وہ نئی انسانیات، ثقافتیات اور قدریات سے مکمل آگاہ ہیں۔ مابعد جدیدیت کی نظریاتی روایت کی تشکیل وتعمیر میں ان کا جو اہم حصہ رہا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مابعد جدیدیت سے متعلق بعض فرانسیسی الفاظ واصطلاحات کو اردوئی مزاج انھوں نے ہی عطا کیا ہے۔

فرانسیسی اور انگریزی ادبیات سے مکمل طور پر آگاہ نظام صدیقی کی تنقید دانشورانہ تنقیدی بصیرت کا علامیہ ہوتی ہے۔ ان کی تنقید دراصل ایک نامیاتی اور متحرک تخلیقی تنقید ہے کہ دراصل ان کی نظر میں نقاد بھی تخلیق ثانی، تخلیق مکرر کے عمل سے گزرتا ہے۔ فن پارے کی بازدید اور بازتحریر کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تخلیق کی عمیق اور رفیع قرأت کا عمل بھی اصلاً تخلیقیت کا ہی عمل ہے۔ ان کی تنقیدی کتاب 'مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک' میں تخلیقیت کا یہی عمل روشن نظر آتا ہے

نظام صدیقی ایک ایسے ناقد ہیں جن کے اندر بے پناہ تخلیقی جوہر اور تنقیدی رجولیت ہے۔ وہ فن پارے کا مطالعہ، عمیق ترین سطح (Deeper Structure) پر کرتے ہیں اور Broader Spectrum میں متن سے مکالمہ کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں ماقبل اسالیب کی باز آفرینی نہیں ہے۔ ان کا ایک الگ اسلوب ہے، ان کے الفاظ اور اصطلاحات ایک مخصوص فضا میں پرواز کرتے ہیں۔ وہ زبان کی استعاراتی تہذیب سے آگاہ ہیں اور صحیح تخلیقی ترسیلیت سے بھی واقف ہیں۔ وہ عام شعور کی سطح کا خیال رکھے بغیر تنقید لکھتے ہیں۔ عوامی معیار سے مفاہمت ان کے مزاج میں شامل نہیں ہے۔

نظام صدیقی کا مطالعہ محدود تو نہیں ہے کہ وہ کئی زبانوں اور ادبیات پر مکمل عبور رکھتے ہیں مگر ان کا مطالعہ مشروط ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تنقیدی مطالعات میں مابعد جدیدیت کی محبت میں مبالغے کی حدود بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ یہ نظری شدت پسندی نظام صدیقی کے مزاج سے میل نہیں کھاتی پھر بھی وہ شدت جذبات اور تاثرات سے مغلوب ہوکر اس طرح کی زبان بھی لکھ جاتے ہیں کہ ''فاروقی کی حمایت میں فضیل جعفری شمشیر بہ کف ہوکر منی سرکس کے مسخرے بن گئے ہیں یا فضیل جعفری جیسے نام نہاد فضلا کا تنقیدی ڈسکورس فضلہ معلوم ہوتا ہے۔'' اس طرح کی لسانی تیغ زنی جو اقدار شکنی کے ذیل میں آتی ہے ان کی بعض تحریروں میں نظر آتی ہے، مگر یہ ان کا مجموعی رویہ نہیں ہے کہ بنیادی طور پر نظام صدیقی اپنی تمکنت، متانت، بین علومیہ بصیرت یا آزادئ دید کی وجہ سے تنقیدی حلقوں میں اعتبار کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

نظام صدیقی کی زبان کی بابت ثقالت کی شکایت کی جاسکتی ہے۔ کچھ مضامین میں ایک ہی طرح کے جملوں کی تکرار سے وحشت بھی ہوسکتی ہے مثلاً فراق گورکھپوری اور ندا فاضلی کی غزلیہ شاعری کی بالائی ساخت اور داخلی ساخت میں اتنی یکسانیت آگئی ہے کہ جملے بھی وہی در آئے ہیں۔ کہیں کہیں اسمائے صفات (Adjectives) کے بیجا استعمال کا شکوہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریروں پر Tautology, Verbosity اور Obfuscation کے ٹھپے بھی لگائے جاسکتے ہیں، مگر ان کے تنقیدی شعور کی بالیدگی اور پختگی سے انکار ممکن نہیں اور نہ ہی ان کی مطالعاتی وسعت پر کوئی شک کرسکتا ہے۔ تکرار اور یکسانیت تو اب عمومی وبا بن گئی ہے کہ دس ارب خلیے والے دماغ کے قشرے (cortex) اور فصوص (lobes) میں کچھ الفاظ اور جملے اس طرح مرکوز اور مکین ہوجاتے ہیں کہ لاشعوری طور پر وہ تفکر اور تحریر کا حصہ بن ہی جاتے ہیں۔ نظام صدیقی کی تحریروں میں زبان کی ژولیدگی ان افراد کے لیے مسئلہ بن سکتی ہے جو تنقید کی اسٹیریو ٹائپ زبان کے عادی ہوچکے ہیں اور ایسی زبانوں سے مانوس نہیں ہوپاتے جو تھوڑی سی ریاضت یا ذہنی کسرت کا مطالبہ کرتی ہیں۔

نظام صدیقی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے انتقادی افکار واقدار کے نئے آفاق تلاش

کیے ہیں۔ ان کی ہر تحریر ان کی گہری سوچ اور فکری امعان و ارتکاز کی مظہر ہے۔ ان کی تنقیدی تحریروں سے نئی طرفیں کھلتی ہیں یا نئی طرفوں کے اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً مراثی میر انیس کا مطالعہ ایک تنقیدی مکاشفہ ہے۔ انھوں نے جو جہتیں تلاش کی ہیں وہ ماہرین انیسیات بھی دریافت نہ کر سکے۔ ان کے چند جملوں سے ان کی دانشورانہ بین علومی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میر انیس کے بارے میں لکھتے ہیں ''میر انیس کی رفیع تر تخلیقیت اردو زبان کی اکبری تحریر Arch Writing ہے۔'' اسی طرح فراق گورکھپوری کے بارے میں ان کا یہ جملہ اپنے اندر جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ہے کہ ''فراق گورکھپوری جدید اردو غزل کے پورٹ اوتار تھے، ہیں اور رہیں گے۔'' ایسا ہی قرۃ العین حیدر کے بارے میں بھی ان کے یہ جملے ان کی غیر معمولی فکر کا اشارہ دیتے ہیں کہ ''میرے بھی صنم خانے اور سفینۂ غم دل'' اگر ناولاتی تہذیبی ورثے ہیں جس میں تاریخیت اور یادیت کی زیریں لہریں کارفرما ہیں تو آخر شب کے ہم سفر پہلا ناولاتی اناطوفیا (Disutopia) ہے یا صلاح الدین پرویز کے ناول 'ایک ہزار دو راتیں' کے بارے میں ان کی یہ رائے ''ایک ہزار دو راتیں مابعد جدید تناظر میں نئے عہد کی تخلیقیت کا اولین ناولاتی فوق المتن (meta text) ہے۔'' اس نوع کے جملے گہرے تجزیاتی مطالعے کے بعد ہی وجود میں آ سکتے ہیں، عام شعور پر ایسے کثیر معنیاتی اور انکشافیاتی جملوں کا نزول نہیں ہو سکتا۔ ایسے جملوں کی جستجو کے لیے گہری ریاضت درکار ہوتی ہے۔

نظام صدیقی کی اس کتاب میں 15 مضامین شامل ہیں جن میں انھوں نے مابعد جدید تنقید و ادب کے جمالیاتی اقداری نظام کے علاوہ اردو نظم کی تہذیبی تخلیقیت، اردو افسانے میں تخلیقیت کا میلان، تخلیقی ترسیل کا بحران، اردو ناول میں تخلیقیت کا رجحان، معاصر اردو غزل، گوپی چند نارنگ کی ادبی نظریہ سازی، ایڈورڈ سعید کی تنقیدی نظریہ سازی کے علاوہ میر انیس، فراق، قرۃ العین حیدر، ندا فاضلی، صلاح الدین پرویز کے متن سے مکالمہ کیا ہے۔ مجموعی طور پر نظام صدیقی نے مابعد جدیدیت کے نظریات کی اطلاقی صورتیں تلاش کی ہیں اور مابعد جدیدیت کی میزان میں تمام فن پاروں کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

نظام صدیقی کی نئی تنقیدی فکریات اور جمالیات کی عکاسی اس کتاب سے بخوبی ہوتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے مباحث کی تفہیم و تعبیر کے ضمن میں یہ کتاب سنگ نشان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے جدید تنقیدی مطالعات سے ان کے ذہنی ارتقا و ارتفاع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے تنقید کے لیے ایک وسیع کشادہ اور متنوع منطقے کی جستجو کی ہے۔ اردو کی مابعد جدیدیت کے نظریاتی محراب اور منطقے کو مزید منور کرنے میں نظام صدیقی کی یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر آنند کے سات دیوان: تجزیاتی مطالعہ

ترتیب و تدوین: پریم گوپال متل

صفحات: 608، قیمت: 500 روپے

رابطہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی 110002

مبصر: ارشد علی خاں، میر عالم خاں مینشن، محمود سعیدی مارگ، امیر گنج، ٹونک 304001

اب ڈاکٹر وِڈیا ساگر آنند کا شمار اُردو کی نئی بستیوں سے اُبھرنے والے اُردو کے معتبر و معروف شعرا و ادبا میں کیا جاتا ہے۔ موصوف عرصۂ دراز سے وہاں اردو شعر و ادب کو سنوارنے سجانے کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک کی انتہائی مصروف زندگی جیتے ہوئے بھی خدمتِ زبان و ادب میں منہمک اور سرگرم ہیں۔

اب تک آنند کے سات شعری مجموعے شائع ہو کر شائقینِ شعر و ادب سے داد پا چکے ہیں۔ ان مجموعوں کی اہلِ اُردو نے نہ صرف پذیرائی کی بلکہ انھیں گفتگو کا موضوع بھی بنایا جس کا ایک ثبوت پیشِ نظر کتاب سے مل جاتا ہے، جس میں ڈاکٹر آنند کے شائع شدہ مجموعوں پر مختلف اہل الرائے حضرات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ حضرات کسی ایک ملک کے ہی شہری نہیں ہیں بلکہ ان میں ہندوستان، پاکستان، جرمنی، برطانیہ، امریکہ وغیرہ کئی ملکوں کے ادیب شامل ہیں، جس سے اُردو زبان کی بین الاقوامی حیثیت کے ساتھ ڈاکٹر وِڈیا ساگر آنند کی ہردلعزیزی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب کے مرتب پریم گوپال متل کے مطابق انھوں نے یہ مضامین مختلف رسائل و جرائد یا پھر اُن کتب سے منتخب کیے ہیں جو ڈاکٹر آنند کے فکر و فن پر شائع ہو چکی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آنند پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو پیشِ نظر کتاب میں موجود ہے۔ متل صاحب نے مضامین کے انتخاب میں اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ ایک ہی طرح کی گفتگو اور ایک ہی طرح کے پہلوؤں کو بار بار دہرایا نہ جائے۔ اس لیے موصوف نے اُنھی مضامین کو اشاعت کے لیے منتخب کیا ہے جن میں آنند کے کسی نہ کسی نئے شعری پہلو یا دوسری سرگرمیوں کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہو۔

کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب ان مضامین پر مشتمل ہے جنھیں مرتب نے مختلف رسائل و جرائد یا کتب سے منتخب کیا ہے۔ دوسرے باب میں ڈاکٹر وِڈیا ساگر آنند کے ساتوں مجموعوں کے مختصر مگر جامع شعری انتخاب کے ساتھ ساتھ ان مجموعوں میں شامل مضامین کا انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سولہ صفحات کی رنگین تصاویر بھی کتاب کی زینت ہیں جو وِڈیا ساگر آنند کی مختلف سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ کتاب کو زیادہ پرکشش اور دیدہ زیب بنانے کے لیے آنند کے ساتوں شعری مجموعوں کے اصل سرورق ڈیزائنوں کے چہار رنگی عکس بھی ہر انتخاب کے ساتھ الگ الگ دیے گئے ہیں۔

پریم گوپال متل نے کتاب کی ترتیب و پیشکش میں بڑی شائستگی اور سلیقے کا مظاہرہ کیا ہے جس سے کتاب معنوی طور پر اہم ہونے کے ساتھ صوری طور پر بھی خوشگوار تاثر چھوڑتی ہے۔

دل کے موسم

مصنفہ: عذرا نقوی

صفحات: 160، قیمت: 150

ناشر: تخلیق کار پبلشرز، 205/6، جے ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی 92

مبصر: ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، B-129، سریتا وہار، نئی دہلی 110070

علم نباتات میں ایم ایس سی کرنے والی عذرا نقوی ایک شاعر کا دل، فن کار کی نظر اور افسانہ نگار کا ذہن لے کر ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئیں جہاں ان کی حسیات اور تخئیل کو پروان چڑھنے کا بھرپور موقع ملا۔

عذرا نقوی کی والدہ سیدہ فرحت اپنے وقت کی مشہور اور کامیاب شاعرہ تھیں جن کے شعروں کی نغمگی عذرا کے کانوں میں عالمِ شیرخوارگی سے جا گزیں ہو گئی تھی جیسا کہ عذرا خود لکھتی ہیں:

''امی گھر کے کام کاج کے دوران اپنی کسی نئی غزل کی تخلیق میں گنگناتی تھیں یا اپنا کوئی پسندیدہ گیت یا غزل مدھم سروں میں ان کے لبوں پر ہوتا تھا۔ یہ گنگناہٹ میرے ذہن و دل میں رچ بس گئی ہے، اور میرے وجود کا حصہ ہے۔''

ننیہال میں صالحہ عابد حسین اور صغرا مہدی جیسی ہستیوں کا سایہ میسر ہوا مشہور سماجی

کارکن قیصر نقوی نے والد کی حیثیت سے اور سافٹ ویئر کے پروفیسر پرویز احمد نے بطور شوہر عذرا کی فنی صلاحیتوں کو بارآور کرنے میں بھرپور تعاون دیا۔

شاعری کے تئیں عذرا نقوی کا رجحان اوائل عمر سے ہی تھا۔ افسانہ نگاری کی طرف وہ بعد میں متوجہ ہوئیں لیکن نظمیں لکھنا انھوں نے کم عمری سے ہی شروع کر دیا تھا۔ عذرا کے مجموعہ کلام 'دل کے موسم' میں فن کی جو پختگی اور شعور کی بالیدگی ہے وہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اس کی جڑیں بہت گہرائی تک جاتی ہیں۔ 'دل کے موسم' میں دل کے سب ہی رنگ اور موڈ شامل ہیں جو اپنے نام ہی کی طرح خوبصورت اور اثر انگیز ہیں۔

'دل کے موسم' کو عذرا نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں نظمیں ہیں اور دوسرے حصے میں غزلیات ہیں۔ دونوں ہی حصے احساس کی شدت، جذبے کی گہرائی اور شعور کی پختگی (maturity) میں اتنے مکمل ہیں کہ فن اور موضوع پر شاعر کی مضبوط پکڑ اور فکر انگیزی کا پتہ دیتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کا کہنا ہے کہ ''شاعر کا کام ہمارے اندر صرف ایک آگاہی (awareness) پیدا کرنا ہے۔ یعنی جن چیزوں کو ہم محو کر چکے ہوں یا محو کر رہے ہوں یا جن کے محو کر دینے کا امکان ہو، ان سے ہمیں آگاہ رکھے۔'' اور یہی کام عذرا نقوی نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعے کیا ہے۔

شمیم حنفی کے الفاظ میں ''عذرا سوادِ اعظم کی شاعرہ ہیں۔ ادب میں وہ ایک ایسی جداگانہ آواز کے طور پر سامنے آئی ہیں جو فقط نسوانی نہیں ہے، جو نسائی بھی ہے اور عمرانی بھی، عصری بھی ہے اور آفاقی بھی، فکر انگیز بھی ہے اور تعمیری بھی۔ ان کے پاس شاعری اور شعور کا معتدل امتزاج ہے۔''

یہ معتدل امتزاج ہی عذرا کو اپنی ہم عصر شاعرات سے ممتاز اور ممیز کراتا ہے۔ عذرا کے جذبے میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، حقیقت پسندی بھی ہے اور خوابناکی بھی، زندگی کی تپتی ہوئی دھوپ کی تمازت کا احساس بھی ہے اور چاندنی راتوں کی ٹھنڈک اور سکون بھی ہے۔

مجھ کو مسحور کیے دیتا ہے، برف پر پھیلی ہوئی چاند کی کرنوں کا طلسم/ ہر طرف ایک فسوں خیز سی خاموشی ہے

عذرا کی شاعری کو علامتی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شاعری میں کچھ الفاظ بار بار استعمال ہوئے ہیں جو شاعر کی ذہنی رو کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور دورِ حاضر کے ماحول کی علامت بن گئے ہیں، جیسے: خواب، لمحہ، پل، پردیس، اجنبی، سناٹا، آنگن، موسم، مہاجر، سفر، تہذیب، روایات، ماضی، البم، وغیرہ وغیرہ۔ یہ الفاظ رومانیت میں لپٹی ہوئی حقیقت پسندی کے شاہد ہیں۔ عذرا کو اپنا ماضی بہت عزیز ہے۔ ان کی نظم 'انھیں مجھ سے شکایت ہے' دیکھیے:

انھیں مجھ سے شکایت ہے کہ میں ماضی میں جیتی ہوں
میرے اشعار میں آسیب ہیں گزرے زمانے کے
وہ کہتے ہیں کہ یادیں سائے کی مانند میرے ساتھ رہتی ہیں

عذرا نقوی جس دور میں شاعری کر رہی ہیں وہ بے یقینی اور عدم استحکام کا دور ہے جہاں کسی شے کو ثبات نہیں ہے نہ جذبوں کو نہ رشتوں کو اور نہ ہی حالات کو۔ صبح روزی کی تلاش میں گھر سے نکلنے والے شخص کو یقین نہیں ہے کہ وہ شام کو گھر لوٹے گا، جہاں ایک بے نام خوف نے ہر معصوم ذہن پر اپنا شکنجہ کس رکھا ہے، جہاں انسان بھی ریموٹ سے چلنے والی مشین بن چکا ہے۔ یہ رجحان اس لیے اور بھی شدید ہے کہ عذرا نے اپنی زندگی کے تیس سال وطن سے دور مختلف ممالک میں گزارے خصوصاً کناڈا، جہاں جذبوں اور رشتوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ایسے ماحول میں شاعر کا حساس دل اپنے وطن کی تہذیبی و معاشرتی میراث، رشتوں کے تقدس اور بزرگوں کی دعاؤں کو یاد کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں یادیں، البم، کینوس جیسے الفاظ اور اصطلاحیں ان کے ذہن کی گرہ کھولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عذرا کی شاعری میں موجودہ دور کی تلخی کا نوحہ بھی۔ کہیں پسِ پردہ عالمی دہشت گردی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے یقینی بھی ہے۔ عذرا کی شاعری میں ماضی اس کھلونے کی طرح ہے جو حال کی محرومیوں اور تلخیوں کو بھلا کر مستقبل کے لیے مثبت سوچ کو جنم دیتا ہے۔ ان کی نظم 'یقین' اس سوچ کا پرتو ہے۔

عذرا نقوی جوش، فیض، اختر الایمان اور ورڈس ورتھ سے خاصی متاثر نظر آتی ہیں۔ ان کی اکثر نظموں میں ہمیں فیض کے لہجے کا درد محسوس ہوتا ہے۔ عذرا نقوی کا شاعر دل اور مصور آنکھ فطرت کی بھی دلدادہ ہے۔ قدرتی مناظر کا حسن ان کے کلام میں جابجا بکھرا ہوا ہے۔ ورڈس ورتھ کی طرح وہ بھی اس امر میں یقین رکھتی ہیں کہ قدرت (nature) سب سے بڑی اتالیق بھی ہے، جراح بھی اور معالج بھی جو اپنے soothing effect سے ان اداسیوں اور دکھوں کے رنگ کو ہلکا کر دیتی ہے جو زندگی اور انسان کی عطا کردہ ہیں۔

عذرا نقوی سیدھی سادی، عام فہم لیکن حسیت سے بھرپور زبان میں شاعری کرتی ہیں۔ یہ زبان جس میں امروہہ اور علی گڑھ کی ملی جلی روایتی تہذیبی شرافت کی خوشبو ہے۔ یہ زبان جو انھیں ورثے میں ملی ہے، یہ زبان جس میں کم لفظوں میں بہت کچھ کہہ جانے کی صلاحیت ہے، عذرا کو اس زبان کے بہترین استعمال کا ہنر آتا ہے۔ عذرا ہندی کے متناسب الفاظ بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتی ہیں کیونکہ وہ جس گنگا جمنی تہذیب کی روایات بیان کر رہی ہیں اس کا تقاضا یہی ہے۔ مجموعی طور پر عذرا نقوی کا شعری مجموعہ 'دل کے موسم' اردو کے نسائی اور نسوانی ادب میں ایک بیش قیمت اور خوبصورت اضافہ ہے۔

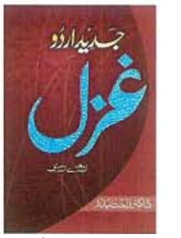

جدید اردو غزل (1971-2010)

مصنف : ڈاکٹر راحت بدر

صفحات :343 ، قیمت : 161 روپے

ناشر: ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، 25-2724 میٹرو پول مارکٹ کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی-۲

مبصر : ڈاکٹر محمد وقار خان، c/o محمد آصف، روم نمبر 31، ستلج ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی 67

زیر تبصرہ کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر راحت بدر کو عالمی شہرت یافتہ مشہور و معروف شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کی اہلیہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ڈاکٹر راحت بدر کو اردو شاعری سے دلچسپی اسکول کے زمانے سے ہی رہی ہے لہٰذا اچھی معیاری غزلیں اور اشعار اپنی ڈائری میں لکھنا اور ان کو ازبر یاد کر لینا ان کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے اور اسی مناسبت سے انھوں نے اپنی پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ 'جدید اردو غزل' کے عنوان سے پیش کیا۔

یہ کتاب 'جدید اردو غزل 1971 سے 2010 تک' دراصل مصنفہ کا تحقیقی مقالہ ہے جسے ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔ جس کا اعتراف خود مصنفہ نے کتاب کے پیش لفظ میں کیا ہے۔ جدید اردو غزل سے مراد غزل میں جدید افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ لہجے اور تیور میں جدت کے علاوہ زندگی کی حقیقتوں، داخلی کیفیات کی حرف بہ حرف نمائندگی اور سماج کی موشگاف عکاسی بھی ہے۔ جدید غزل گو شعرا اپنے مشاہدات اور تجربات کو غزل میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر کسی کو اپنے دل کی بات اور خود پر گزری ہوئی کیفیات لگتی ہیں۔

ہندوستان میں جدیدیت کا آغاز 1955 کے آس پاس ہوا اور جدید اردو غزل کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں 1968 میں علیحدہ شکل میں شامل کیا گیا۔ تاکہ طلبا خاص طور سے جدید اردو غزل سے متعارف ہوسکیں۔ جدید غزل جو آج عوام کی پسند بن

چکی ہے وہ اس وقت خواص یعنی ادبی حلقوں میں کسی حد تک پسند نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن جب جدیدیت کے قابل قدر مفہوم نکلنا شروع ہوئے تو جدید غزل منظر عام پر آ گئی اور اسے خواص نے بھی پسند کیا۔ اس کتاب میں جدید اردو غزل کے ارتقائی سفر کا ان شعرا کے حوالے سے تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے جن کی اس سلسلے میں مستند اہمیت ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے۔

ابتدائی باب میں امیر خسرو سے 1970 تک اردو غزل کے ارتقائی سفر کو بطور پس منظر قلم بند کیا گیا ہے اور غزل کے مزاج، اس کے فن، اس کے موضوعات، زبان اور طرز بیان کے ساتھ ساتھ تمام اہم شعرا کی غزل سے متعلق خدمات بھی پیش کی گئی ہیں۔ دوسرے باب میں جن شعرا کا ذکر ہے انھوں نے غزل کے پرانے موضوعات کو نئی زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے اس لیے ان کے یہاں غزل کی لفظیات میں بڑی تبدیلی آئی ہے، پرانے استعارے کم ہو گئے ہیں اور نئے لفظوں سے نئی امیجری بنائی گئی ہے جو پرانی سے بھی ہم آہنگ ہے۔

کتاب کے پڑھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اس باب میں جدید اردو غزل کے نمائندہ شعرا کی ایک طویل فہرست دی ہے جن میں کچھ کا تعلق تو ہندوستان سے اور کچھ کا تعلق پاکستان سے ہے اور ان شعرا میں سے اکثر کا کلام ہندی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی اور سندھی میں چھپ چکا ہے۔ ہر شاعر کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے ساتھ ساتھ آبائی وطن اور ابتدائی تعلیم کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد اشعار کے ساتھ شاعر کی اہمیت و انفرادیت اور شعری محاسن کو بیان کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے بشیر بدر کی حیات و خدمات اور شعری محاسن کا جائزہ قدرے تفصیل سے لیا ہے۔ اس ضمن میں بشیر بدر کی کتابوں، اعزازات اور فرائض کی ایک طویل فہرست درج کی ہے۔

تیسرے باب میں جدید غزل کا فنی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور ان نئی لفظیات اور نئے نئے موضوعات کو سامنے لایا گیا ہے جو غزل کے نئے پن اور جدت کا ثبوت ہیں۔ باب چہارم میں یہ بتایا گیا ہے کہ جدید اردو غزل نے ہندی غزل کو کس قدر متاثر کیا ہے اور ہندی کے کویوں کے ساتھ ساتھ غزل کے گلوکاروں نے اس کو مقبول عام بنانے میں کتنا اہم رول ادا کیا ہے۔ باب پنجم میں جدید اردو غزل کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور آخر میں کتاب کی تیاری میں جن مآخذ و مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کی مصنفہ نے اس کتاب کی تیاری میں کتنی محنت اور لگن سے کام لیا ہے۔ کتاب کے سب سے آخری صفحے پر مصنفہ نے اپنا سوانحی خاکہ پیش کیا ہے جس سے ان کی شخصیت سے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہے۔ کتاب میں کچھ خامیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔ جیسے کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے جگہ جگہ تسلسل و روانی کی کمی کھٹکتی ہے۔ ساتھ ہی پروف کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں امید کی جاتی ہے کہ اگلے ایڈیشن میں یہ کمیاں دور کر دی جائیں گی۔ یہ کتاب اردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے اور علمی اعتبار سے اس بلند اور گراں قدر کتاب کی اشاعت پر ڈاکٹر راحت بدر قابل مبارکباد ہیں۔ توقع ہے کہ مصنفہ کی اس کوشش کو علمی اور ادبی حلقوں میں بنظر تحسین دیکھا جائے گا۔

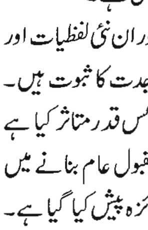

بہار رعنا

مصنفہ: رحیمہ رعنا بخشی ایم اے

صفحات: 134، قیمت: 150 روپے

ناشر: ڈاکٹر جاوید رفاعی، صمد خانہ پوری

مبصر: ارشد گوڑ A/D-2-121، ڈی ڈی اے فلیٹس میور وہار، فیز 3، دہلی

کتاب کے سرورق تو کیا نام سے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ یہ کوئی شعری مجموعہ ہے۔ کتاب کے ماتھے پر اگر موٹا موٹا 'مجموعۂ مضامین' نہ لکھا ہوتا یا باریک حرفوں میں یا کم از کم کسی ایسے خط یا ڈیزائن میں لکھا ہوتا کہ پہلی نظر میں صحیح پڑھنا مشکل ہوتا تو کاروباری اعتبار سے کتاب کی کشش بڑھ جاتی۔

اصل کتاب سے پہلے کے 6 مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کو پڑھ کر ہی پتہ چلتا ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی مصنفہ نے استفادہ کیا ہے اور مختلف اخبارات و رسائل میں بھی ان کے بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں کہیں بھی اس بات کا اشارہ نہیں ملتا کہ یہ پہلے کہیں شائع ہوئے ہیں یا نہیں۔

میرے خیال میں کسی کو اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا کہ کتاب کے اشتہار اور تبصرے میں واضح فرق ہونا چاہیے۔ اگر تبصرے میں بھی کتاب کی صرف اچھائیاں ہی بیان کی جائیں گی تو پھر بھلا کتابوں کے اشتہارات کی کیا ضرورت رہ جائے گی۔ تبصرے میں غیر جانبداری اس خدشے کے پیش نظر بھی ضروری ہے کہ اگر کسی نے تبصرہ پڑھنے کے بعد وہ کتاب بھی پڑھ ڈالی تو کیا ہوگا۔ اسی وجہ سے کتاب کی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیاں بھی بیان کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

کتاب میں اچھائیاں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہیں۔ مختلف مضامین میں نیکی کی تلقین اور نیک خواہشات کا اظہار ملتا ہے۔ عورت بھی کتاب کے مضامین میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ عورت کے مسائل، اس کی قربانیوں، جدوجہد اور کامیابیوں کا تذکرہ کرنے میں مصنفہ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ شعروں کے معاملے میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ کتاب کے مختلف مضامین میں اشعار کو بھی کافی جگہ دی گئی ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ ایک سے زیادہ بحروں والے اشعار کے ساتھ کتاب میں ایسی مشکل بحروں کے شعر بھی نقل کیے گئے ہیں جن کی بحر کو پکڑ پانا عام قاری کے بس کی بات نہیں۔ علامہ اقبال سے مصنفہ کی عقیدت کا کیا کہنا۔ کئی کئی مقامات پر ان کے اشعار نظر آتے ہیں۔

اپنے مضامین کو جہاں انھوں نے اشعار سے خوبصورت بنایا ہے وہیں اپنے پیغام کو واضح کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ عظیم شخصیات کے بھاری بھرکم نام مضمون میں توازن پیدا کرتے ہیں۔ مصنفہ یہ گر جانتی ہیں لیکن کہیں کہیں وزن انھوں نے اتنا بڑھا دیا ہے کہ پورا مضمون ہی ڈانواڈول ہو گیا ہے۔'' بچے کی شخصیت کی تعمیر میں 'اساتذہ کا کردار' کے عنوان سے اپنے مضمون میں مصنفہ نے لکھا ہے ''استاد کی بدولت ایک شاگرد دنیا میں نیا عزم و حوصلہ حاصل کرتا ہے۔ کبھی فرہاد بن کر چٹانوں سے ٹکراتا ہے تو کبھی آتش نمرود میں گلزار کھلاتا ہے۔''

کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ تقریباً سارے ہی مضامین قاری کی سہولت کو دھیان میں رکھتے ہوئے مختصر لکھے گئے ہیں تا کہ قاری کو جلد سانس لینے اور ستانے کا موقع مل جائے۔ اس اختصار سے دوسرا فائدہ یہ ہوا ہے کہ چھوٹی سی کتاب میں 30 مضامین اس خوبی کے ساتھ ایڈجسٹ ہو گئے ہیں کہ کسی کو بھی جگہ کی تنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

رحیمہ صاحبہ نے اپنے مضامین کے ذریعے قاری کے ذہن میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ عام طور پر اچھا سوچنے والے اور 'مائکس ٹو گو بغور آئی سلیپ' کے اصول پر کاربند لوگ ہی دنیا کی دوڑ میں آگے بڑھتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ کتاب میں کہیں کہیں املے اور جملے کی غلطیاں در آئی ہیں۔

کتاب کے آخر میں مصنفہ کی مختلف مواقع کی 12 تصاویر شائع کی گئی ہیں۔ کتاب میں زندگی سے متعلق مختلف مسائل، بچوں سے متعلق مختلف امور اور تعلیم و تربیت پر مبنی مضامین شامل ہیں۔ آخر میں صرف اتنا کتاب کی قیمت 150 روپے نہ صرف بہت زیادہ ہیں بلکہ یہ اردو کے غریب قارئین پر ظلم بھی ہے۔ ■

ٹیلی ایڈیشن

اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ای ٹی وی اردو چینل کے پروگرام اردو دنیا کی نشریات کا آغاز ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ پروگرام کے دوران ناظرین کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ جنوری 2011 سے اب تک کل 56 ایپی سوڈ پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں کونسل کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کونسل کے اردو عربی مراکز کی سرگرمیوں کو بھی ملک و بیرون ملک کے اردو ناظرین کے لیے نشر کیا جاتا ہے۔ کونسل کی کتابوں پر تبصرے، اردو کی اہم اور مقتدر شخصیات اور ادبا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی تفصیلی جائزے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کا پہلا اردو ٹی وی چینل ای ٹی وی اردو گزشتہ دس برسوں سے ٹیلی ویژن نشریات کی خدمات دیتا رہا ہے اور جنوری 2011 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی ادبی و ثقافتی سرگرمیاں بھی ٹیلی ویژن نشریات کا اہم حصہ بن گئی ہیں۔ ہفتہ وار اردو دنیا سنیچر کی شام آٹھ بجے اور اتوار کی صبح ساڑھے دس بجے نشر کیا جاتا ہے۔ ملک میں اردو کے تئیں بیداری اور حکومت کی پالیسیوں کو اردو عوام تک پہنچانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ٹیلی ایڈیشن کا آغاز کیا جس کے مثبت نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن' پروگرام کا آغاز ہر ہفتے قومی اردو کونسل سے متعلق خبرنامے سے ہوتا ہے۔ 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن' کے ناظرین کی دلچسپی کے لیے ہر ایپی سوڈ میں اردو ادب اور فلموں کے تعلق سے ایک سوال بھی کیا جاتا ہے اور اس کا صحیح جواب دینے والوں کا نام اگلے ایپی سوڈ میں دکھایا جاتا ہے۔ صحیح جواب دینے والے کسی ایک شخص کو قرعے کے ذریعے سال بھر تک 'اردو دنیا' کا شمارہ مفت بھیجا جائے گا۔ اسی طرح 'اردو دنیا' کے ہر ایپی سوڈ میں جہاں اردو زبان و ادب میں گراں قدر خدمات انجام دینے والی کسی ایک اہم شخصیت کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی سفر پر تفصیلی رپورٹ پیش کی جاتی ہے وہیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے زیراہتمام شائع ہونے والی اہم کتابوں کا جائزہ بھی اردو ناظرین کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ ناظرین اپنے تاثرات بھیجنے کے لیے ان ای میل آئی ڈیز کا بھی استعمال کرسکتے ہیں: urducouncil@gmail.com, urduduniya@etv.co.in

اکتوبر 2012 کی نشریات

6 اکتوبر 2012 بروز ہفتہ

اکتوبر کے پہلے ہفتے کو رات ساڑھے آٹھ بجے اردو دنیا میں پیش کیے جانے والے پروگراموں میں صوبہ بہار کے ضلع کٹیہار میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے توحید انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی کے زیراہتمام چلنے والے کمپیوٹر سنٹر کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس پروگرام میں معروف صحافی اور راجیہ سبھا کے سابق رکن اور سابق سفارت کار م افضل کی شخصیت پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ م افضل نے اپنا صحافتی سفر ہفتہ وار نئی دنیا سے شروع کیا تھا اور بعد میں اپنا ہفتہ وار اخبار 'اخبارِ نو' کا آغاز کیا۔

م افضل

13 اکتوبر 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے ایپی سوڈ میں صوبہ جموں و کشمیر کے باندی پور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے سٹی زن انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل ٹریننگ کے زیراہتمام چلنے والے اردو کیلی گرافی سینٹر کی کارکردگی پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس ایپی سوڈ میں صوبہ جھارکھنڈ، ضلع رانچی کے ممتاز ادیب پروفیسر احمد سجاد کے فن و شخصیت پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ پروفیسر احمد سجاد نے اردو ادب کے مختلف موضوعات پر جو تحقیقی کام کیا ہے وہ اردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر احمد سجاد

20 اکتوبر 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے ایپی سوڈ میں صوبہ اترپردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے شبلی نیشنل کالج میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے چلنے والے کمپیوٹر سنٹر کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس رات کے ایپی سوڈ میں حیدرآباد کے ممتاز ادیب پروفیسر مجید بیدار کے فکروفن پر رپورٹ بھی ناظرین دیکھ سکیں گے۔ پروفیسر مجید بیدار کا تعلق درس و تدریس سے رہا ہے۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں اپنی تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر مجید بیدار عثمانیہ یونیورسٹی شعبہ اردو کے صدر بھی رہے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی 17 کتابیں شائع ہوکر منظرعام پر آچکی ہیں۔

پروفیسر مجید بیدار

27 اکتوبر 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے ایپی سوڈ میں صوبہ اتراکھنڈ کے ضلع ادھم سنگھ نگر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے پریورتن وکاس سنستھان کے زیراہتمام چلنے والے کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس رات کے ایپی سوڈ میں ہی ممتاز ادیب اور کرناٹک اردو اکادمی کے چیئرمین امجد حسین حافظ کرناٹکی کے فکروفن پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ امجد حسین حافظ کرناٹکی کا شمار ادب اطفال کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ادب اطفال کے مختلف موضوعات پر امجد حسین کی اب تک دو درجن کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں۔

امجد حسین حافظ کرناٹکی

رحمٰن عباس کے ناول پر کناڈا میں مذاکرہ

کناڈا کے مشہور اردو ٹی وی چینل ’راول ٹی وی‘ پر ان کے حالیہ مطبوعہ ناول ’ خدا کے سائے میں آنکھ مچولی‘ پر 8 اگست کو ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا جس میں ناول کے موضوع، تکنیک، کردار نگاری اور ناول کے پس منظر میں اردو معاشرے میں جاری اخلاقیات کی شکست خوردگی پر تفصیل سے گفتگو کی گئی۔ پاکستانی افسانہ نگار بلند اقبال نے ناول سے چند اقتباسات پڑھ کر سنائے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ رحمٰن عباس نے اپنے موضوع کو انتہائی بے رحمی سے برتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار عبدالسلام فکر و آگہی کا سمبل ہے۔ رحمٰن عباس کا اسلوب باغیانہ ہے۔ یہ ناول اپنی ذات کو اندر اور باہر سے دیکھنے کا ایک علامتی اظہار بھی ہے۔ اس مختصر ناول کو آپ ایک گھنٹے میں پڑھ لیں گے لیکن پھر کئی گھنٹوں تک اس پر سوچتے رہیں گے۔ معروف شاعر اور آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ نعمان شوق نے کہا میرے نزدیک یہ ایک outstanding ناول ہے۔ اس طرح کے ناول بہت کم لکھے گئے ہیں۔ یہ بالکل الگ طرح کا ناول ہے۔ یہ ناول انسان، خدا اور مذہب کی عمومی صورت حال کو پیش کرتا ہے۔ مشہور ادیب مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ رحمٰن عباس کا یہ ناول مشکل ہے اور کئی قرات کا مطالبہ کرتا ہے۔ اگر آپ نے واسکر وائلڈ کے ناول پڑھے ہیں تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ اس ناول میں بھی واسکر وائلڈ کے ناولوں کی طرح قدم قدم پر اسراریت کے ساتھ فلسفے کی دھند شامل ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے البتہ ناول کے مرکزی کردار کی موت کو افسوس ناک قرار دیا اور کہا رحمٰن عباس اگر اپنے کردار کو ناول میں نہیں مارتے تو یہ اس عہد کا سب سے بڑا ناول ہوتا۔ اس کے باوجود یہ بڑا ناول ہے۔ اس مذاکرے میں رحمٰن عباس نے اپنے ادبی سفر پر بھی اظہارِ خیال کیا۔

پریس نوٹ، رحمٰن عباس، ممبئی 3 ستمبر 2012

شکاگو

شکاگو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کا بین الاقوامی مشاعرہ

شکاگو کے ہالیڈے ان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی المنائی ایسوسی ایشن (شکاگو) نے ایک بین الاقوامی مشاعرے کا اہتمام کیا۔ یہ مشاعرہ ہالیڈے ان، اسکوکی کے ایک وسیع ہال میں منعقد ہوا۔ اس شعری محفل میں شرکت کے لیے ہندوستان اور پاکستان سے ایسے شعرا نے شرکت کی جن کا اردو دنیا میں اعلیٰ مقام ہے۔ اردو کے اِن دونوں بڑے ملکوں سے اس مشاعرے میں وسیم بریلوی، شاہدہ حسن، حسن کاظمی، راشد آذر، سنیل کمار تنگ اور میر ہاشم علی نے شرکت کی۔ شکاگو سے ڈاکٹر عابد اللہ غازی، حامد امروہوی، ڈاکٹر صادق نقوی، ڈاکٹر سید لطیف سیف، حشمت سہیل، شاہ نعیم الدین نعیمی، خالد انور (انڈیانا)، مجاہد غازی، ذرہ حیدر آبادی اور نسرین خان نے اس محفلِ غزل گوئی میں حصہ لے کر رنگ پیدا کیا۔ شہر میں مشاعرے کا کافی چرچا تھا اور شوق کا عالم یہ تھا کہ سامعین کے لیے موجود کرسیوں کی کمی ہو جانے کی وجہ سے انتظامیہ کو مزید نشستوں کا بندوبست کرنا پڑا۔ اتنا مجمع ہو جانے کے باوجود یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سامعین نے نہایت دل جمعی، اطمنان وسکون سے مشاعرہ سنا۔ اشعار پر برجستہ جملوں میں ایک شائستگی اور سلیقگی کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ اچھے اشعار کو بھر پور داد سے نوازہ گیا، پسندیدہ اشعار کو بار بار سنا گیا اور ہر گوش بر آواز سامع نے اپنے مکمل صاحبِ ذوق ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ ڈاکٹر عابد اللہ غازی نے صدارت اور امین حیدر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اے ایم یو المنائی ایسوی ایشن آف گریٹر شکاگو کے صدر ڈاکٹر مغیث احمد نے اپنے خطاب میں بتایا کہ ایسوسی ایشن نے ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے ہیں اور اس بات کے لیے

پیہم کوشاں ہے کہ مزید اس کو آگے بڑھایا جائے۔ ایسوسی ایشن کی مختلف زاویوں اور کاوشوں سے محصولہ رقوم کو اسکولوں کے قیام کا مقصد پورا کرنے میں صرف کیا جاتا ہے۔ سامعین میں شکاگو کی کہنہ مشق شاعرہ محترمہ مخفی امروہوی بھی شامل تھیں اور امین حیدر نے مشاعرہ کی کارروائی کی باضابطہ ابتدا ان کے قطعہ سے کی۔

پریس ریلیز، پرویز جعفری، شکاگو 12 ستمبر 2012

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

قومی اردو کونسل کی گرانٹ ان ایڈ اسکیم کے تحت ڈیڑھ کروڑ کی مالی معاونت کو منظوری: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دهلی: قومی اردو کونسل کی اسکیم برائے مالی تعاون (Grant in Aid) کے ذریعے اردو کی ادبی سرگرمیوں کو جلا ملتی ہے اور علاقائی سطح پر بھی اردو زبان و ادب کے فروغ کی راہیں بھی ہموار ہو رہی ہیں۔

رواں مالی سال 13-2012 کی گرانٹ ان ایڈ اسکیم کی پہلی میٹنگ کے انعقاد پر کونسل کے چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کونسل کے ممبران کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ادب کے بہت سے ایسے گوشے ہیں جن کی بازیافت ضروری ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ نئے عنوانات کو تلاش کرنا چاہیے تاکہ ان سے متعلق پروجیکٹ، سمینار اور مشاعروں سے اردو والوں کو فائدہ پہنچے۔

ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ ضروری نہیں کہ ادب کے صرف مشہور و مقبول تخلیق کاروں پر ہی سمینار کیے جائیں۔ ضروری یہ ہے کہ ادب کے ہر گوشے پر اس طرح روشنی ڈالی جائے کہ زیادہ سے زیادہ اردو داں طبقے کو کونسل کی مالی تعاون اسکیم کے تحت فائدہ پہنچایا جا سکے اور علاقائی اردو کے معیار کے تعین کے لیے ہر ریاست ضلع اور گاؤں سے تجاویز آنی چاہئیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل کی گرانٹ ان ایڈ اسکیم کے تحت آئے سمینار، مشاعروں، نیز اردو، عربی اور فارسی کے مسودات سے متعلق ہر تین مہینے میں اس کمیٹی کی میٹنگ ہوگی۔ رواں مالی سال 13-2012 میں گرانٹ ان ایڈ اسکیم کمیٹی نے تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے کی مالی معاونت کو منظوری دی۔ اس اہم فیصلے کے تحت منظور ہونے والے 84 سمیناروں کو تقریباً 4745000 لاکھ، 25 لیکچر سیریز کو تقریباً 6,25000، اکہتر 71 اردو مسودات کو تقریباً 25,25935 روپے اور عربی اور فارسی مسودات کو 500401 روپے کی منظوری ملی۔

اس میٹنگ میں تقریباً 16 ریاستوں سے سمینار، کانفرنس، ورکشاپ اور مشاعروں سے متعلق 90 موصول شدہ تجاویز کی جانچ کے بعد گرانٹ ان ایڈ کمیٹی نے انھیں مالی تعاون فراہم کرنے کا فیصلہ لیا۔ جن ریاستوں سے پروپوزل موصول ہوئے ان میں آندھرا پردیش، اتر پردیش، آسام، بہار، چھتیس گڑھ، دہلی، گجرات، جموں و کشمیر، جھارکھنڈ، کرناٹک، کیرالہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، راجستھان، تمل ناڈو اور مغربی بنگال شامل ہیں۔

کونسل کی گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کے ممبر جناب علیم الدین اسعدی نے کہا کہ جن اداروں کو گرانٹ دی جا رہی ہے ان کے پروگراموں میں کونسل کے نمائندے کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان کی کارکردگی پر نظر رکھی جا سکے۔ سماجی کارکن اور کونسل کے ممبر جناب

قومی اردو کونسل کی گرانٹ ان ایڈ اسکیم کی میٹنگ کا منظر

فرید احمد نے کہا کہ کونسل کی گرانٹ ان ایڈ اسکیم ایک ایسی اسکیم ہے جس میں کسی بھی تخلیق کار کو نظر انداز نہیں کیا جاتا اگر کمیٹی نے کسی عنوان کو نامنظور کر بھی دیا تو دوبارہ اس ادارے کو نئے عنوان پر کام کرنے کی تجویز کونسل کی جانب سے پیش کی جاتی ہے۔

اس میٹنگ میں جناب فرید احمد، حافظ مطلوب کریم، شیخ علیم الدین اسعدی، ڈاکٹر علی جاوید، پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن، قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد، ریسرچ آفیسر محترمہ مسرت جہاں، ڈاکٹر توقیر راہی اور جناب مجیب احمد نے شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 اگست 2012

منٹو صدی

فروغ اردو بھون میں سعادت حسن منٹو کی بیٹیوں کا شاندار استقبال

ادب سرحدوں کی بندشوں سے آزاد ہے: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دهلی: قومی اردو کونسل نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں جو کاوشیں کی ہیں وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی پاسداری کی امین ہیں۔ کونسل نے اردو زبان کو سرحدوں کی بندش سے آزاد کر دیا اور یہ کوششیں صرف کاغذی نہیں ہیں بلکہ ہند پاک کے درمیاں موجود ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی روایتوں کو مزید تقویت فراہم کرنے کے لیے واگھا بارڈر پر کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ جب بھی اردو کے حوالے سے دو ملکوں کے آپسی تال میل کی بات ہوگی تو لازمی طور پر کونسل اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود رہے گی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے پاکستان سے ہندوستان تشریف لانے والے 9 رکنی وفد کا استقبال کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ اس وفد کے اعزاز میں کونسل کے صدر دفتر میں ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس محفل کا مرکز عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی تینوں صاحبزادیاں محترمہ نگہت پٹیل (لاہور)، محترمہ نزہت ارشد، محترمہ نصرت جلال اور محترمہ طاہرہ (فیصلہ آباد)، پروفیسر اقبال، پروفیسر رابعہ سرفراز، جناب حامد بیگ اور ارشد فاروقی نے بھی شرکت کی۔ اس وقت جبکہ ساری دنیا منٹو صدی منا رہی ہے۔ مئی 2012 کو منٹو کا 100 واں یوم پیدائش تھا جس کے پیش نظر صد سالہ تقریبات کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ اس خصوصی محفل کا مقصد کونسل

کی جانب سے سعادت حسن منٹو کو ان کے لواحقین یعنی ان کی تینوں بیٹیوں کی موجودگی میں خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔ محفل کا آغاز کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے ان الفاظ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل بحیثیت وزارت ترقی انسانی وسائل کی نوڈل ایجنسی، مہمان اردو اور کونسل کے ممبران اور اس محفل میں موجود ہندی اور انگریزی میڈیا کے صحافی، پاکستان سے آئے اس 9 رکنی وفد کا استقبال کرتی ہے اور یہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس محفل میں ہم سعادت حسن منٹو کی بیٹیوں کی زبانی، منٹو کو جاننے کی ایک نئی کوشش کررہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ اس پوری کاوش میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل نے اپنی ذاتی دلچسپی اور اردو سے محبت کا ثبوت دیتے ہوئے اس دورے کو بہت آسان کر دیا۔ وہ ایک سیاست داں کم اور اردو داں زیادہ لگتے ہیں۔ ان کے تعاون کے بغیر اردو کے فروغ سے متعلق کاموں کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ منٹو کے مقدمات جناب کپل سبل کے والد جناب ہیرالال سبل نے ہی لڑے تھے اور سمرالا کے پروگرام میں جناب کپل سبل کے بھائی جناب وجیندر سبل بھی موجود تھے۔

فروغ اردو بھون میں سعادت حسن منٹو کی بیٹیوں کے اعزاز میں منعقدہ تقریب

قومی اردو کونسل کے سہ ماہی رسالے 'فکر و تحقیق' کے منٹو نمبر کا اجرا کرتے ہوئے ڈائرکٹر نے کہا کہ ہم ہندوستان کے لوگ ادب کو ادب کے حوالے سے دیکھتے ہیں، سرحدوں میں نہیں بانٹتے۔ اس خاص موقعے پر موجود ادبی حلقے کی نمایاں ہستیوں نے منٹو کی افسانہ نگاری اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

ان کی سب سے بڑی صاحبزادی نگہت پٹیل نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم کونسل کے اس استقبال سے بہت متاثر ہوئے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم منٹو کی بیٹیاں ہیں۔ دوسری بیٹی محترمہ نزہت ارشد نے کہا کہ اللہ نے ہمیں ان کی بیٹیاں بنا کر جو عزت دی ہے اس کے لیے ہم تینوں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ منٹو کی چھوٹی بیٹی محترمہ نصرت جلال نے کہا کہ ہم نے کبھی اپنے والد کے نام کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔

پروفیسر رابعہ سرفراز نے کہا کہ ہم تمام ہندوستانیوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان کی مہمان نوازی کی قدر کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں منٹو کے افسانوں کی مختلف جہتوں پر کام کرنا ہوگا۔

پروفیسر طاہرہ اقبال نے کہا کہ منٹو کے لیے کسی کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے وہ خود اپنے لیے بہت کچھ کر گئے ہیں۔ جناب مرزا حامد بیگ نے کہا کہ منٹو نے جو بہترین لکھا ہے وہ پنجاب اور ممبئی کے لیے لکھا ہے۔ فکشن کے اسالیب پر بات کرنا بہت آسان ہے، لیکن اس پر کام کرنا بہت مشکل ہے۔ منٹو کی تمام تر تحریروں کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ تبھی ہم منٹو کے صحیح مقام کا تعین کر پائیں گے۔

جناب م افضل نے کہا کہ ہندوستان کی بارڈر سیکورٹی فورسیز، وزارت داخلہ، وزارت خارجہ، وزارت ترقی انسانی وسائل نے اردو کے اس تاریخی پروگرام کو کامیاب بنانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اس لیے ہم حکومت ہند اور خاص کر وزارت داخلہ کے شکر گزار ہیں۔

تقریب کے آخر میں شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے کہا کہ اس وقت جب کہ ہندو پاک تعلقات کچھ پیچیدہ نظر آتے ہیں ایسے میں سرحد کے اس پار کے لوگ جب اس پار آتے ہیں تو یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں کون ہندوستانی ہے اور کون پاکستانی۔ اس لیے نہ صرف اردو کو بلکہ ہر زبان میں اس طرح کے باہمی رشتے استوار کرنے کے لیے یہ ادبی محفلیں ضروری ہیں۔ جناب پروفیسر عزیز احمد صدیقی، جناب شیخ علیم الدین اسعدی، جناب حافظ مطلوب کریم، جناب فرید احمد، جناب ایم فاروق انجینئر، پروفیسر قدوس جاوید، م افضل، شاہینہ تبسم، جناب فاروق ارگلی، جناب سید پرویز، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، جناب اے رحمٰن، محترمہ نگہت پٹیل لاہور (پاکستان)، محترمہ نزہت ارشد لاہور (پاکستان)، محترمہ نصرت جلال لاہور (پاکستان)، پروفیسر طاہرہ اقبال فیصل آباد (پاکستان)، پروفیسر رابعہ سرفراز فیصل آباد (پاکستان)، راولپنڈی (پاکستان) جناب مرزا حامد بیگ لاہور (پاکستان) کے علاوہ قومی اردو کونسل کی محترمہ مسرت جہاں، محترمہ شمع کوثر یزدانی، جناب کلیم اللہ، جناب عبدالحی، جناب مجیب احمد، محترمہ آبگینہ عارف او دیگر

اسٹاف نے شرکت کی۔

اس موقع پر جناب فرید احمد، شیخ علیم الدین اسعدی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر صادق، فیروز بخت احمد، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر قدوس جاوید، جناب صدیق الرحمٰن قدوائی اور عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین جناب اے رحمٰن نے بھی اظہار خیال کیا۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 ستمبر 2012

منٹو صدی

منٹو صدی پر سیمینار

جموں: سنٹر برائے پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو، نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے آپسی اشتراک سے منعقدہ 'سعادت حسن منٹو زندگی و کارنامے' عنوان سے منعقدہ دوروزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اختتامی تقریب کی صدارت کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ریاض پنجابی نے فرمائی جب کہ پروفیسر شہاب عنایت ملک ڈائریکٹر سنٹر برائے پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو اور کشتواڑ کیمپس کے علاوہ علی جاوید بھی پریذیڈیم پر رونق افروز تھے۔ اس تقریب کے مقررین نے سیمینار کو کامیاب ترین قرار دیا۔ اس موقعے پر صدر ریاض پنجابی نے اس بات پر زور دیا کہ آنے والے دنوں میں منٹو پر اور کام ہونا چاہیے۔ انھوں نے منٹو کو منفرد افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے سنٹر برائے پروفیشنل اسٹڈیز کو پچھلے دو ماہ کے دوران کامیاب سیمینار منعقد کرانے کے لیے مبارکباد پیش کی۔ علی جاوید نے سعادت حسن منٹو کے فن پر مفصل روشنی ڈالتے ہوئے امید ظاہر کی کہ منٹو کے بارے میں جتنے بھی مقالے وغیرہ پڑھے گئے انھیں ایک کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ دریں اثنا تقریب میں ڈاکٹر خواجہ اکرام ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ڈاکٹر غلام نبی خیال، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر عقیل احمد شیخ، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر مجید مضمر، پروفیسر ریتا جتیندر، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر فرحت رضوی نے منٹو کے مختلف پہلوؤں پر اپنے پیپر پیش کیے۔ ڈائریکٹر سنٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو پروفیسر شہاب عنایت ملک نے سیمینار میں شامل ہوئے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ جموں و کشمیر میں 'اردو زبان کے مسائل اور ان کا حل' کے موضوع پر جموں یونیورسٹی کے کشتواڑ کیمپس میں 11 نومبر 2012 کو ایک روزہ قومی سیمینار منعقد کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں این سی پی یو ایل نے ایک لاکھ روپے مالی تعاون فراہم کرنے کا بھی وعدہ کیا ہے۔ پروفیسر ایم پی سنگھ ایرنے مزید کہا کہ جموں یونیورسٹی نے منٹو صدی تقریبات کے سلسلے میں تین قومی سطح کے سیمیناروں کا انعقاد کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈائریکٹر سنٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو اور ڈائریکٹر کشتواڑ کیمپس پروفیسر شہاب عنایت ملک نے وائس چانسلر جموں یونیورسٹی کا سیمینار کے انعقاد میں بھرپور تعاون فراہم کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ وائس چانسلر نے بذات خود منٹو سیمینار کی تیاریوں کی نگرانی کی جس کے لیے ہم ان کے مشکور ہیں۔ تقریب کے مہمانِ ذی وقار ڈاکٹر خواجہ اکرام نے خطاب کرتے ہوئے 'سعادت حسن منٹو' کے حیات اور کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ منٹو زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے 'ٹھنڈا گوشت'، 'موذیل'، 'بو'، 'اوپر نیچے' اور 'درمیان'، 'نیلی رگیں' وغیرہ شاندار افسانے تحریر کیے۔ ڈائریکٹر این سی پی یو ایل نے کہا کہ منٹو نے اردو ادب کی ترویج کے لے قابل ستائش خدمات انجام دی ہیں جنھیں ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جموں یونیورسٹی نے منٹو صدی تقریبات سے متعلق مقالات کو 'منٹو کی ادبی جہات' عنوان کے تحت کتابی شکل میں بھی محفوظ کر کے اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ خواجہ اکرام نے مزید جانکاری فراہم کرتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی نے حال ہی میں مجلّہ 'فکر و تحقیق' کا خصوصی منٹو نمبر شائع کیا ہے۔ ڈائریکٹر این سی پی یو ایل نے کہا کہ کونسل ایسی تقریبات کے انعقاد کے لیے بھرپور تعاون فراہم کرتی رہے گی۔

روزنامہ 'اڑان' جموں 27,28 اگست 2012

واگھہ پر منٹو تقریبات

واگھہ: یہاں برصغیر کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی یاد میں اہم اور خوبصورت پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں پاکستان سے آئے ہوئے 7 رکنی وفد کے علاوہ دلی اور پنجاب کے کئی شہروں کی اہم شخصیات نے بھی شرکت کی۔ پروگرام سے پہلے واگھہ سرحد پر منٹو کی تینوں بیٹیوں سمیت 7 رکنی پاکستانی وفد کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ منٹو تقریبات کے تحت واگھہ سرحد پر منعقد کیا جانے والا یہ پروگرام اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اردو اور منٹو جیسے افسانہ نگار کے حوالے سے یہ پہلا پروگرام تھا جس میں بی ایس ایف اور حکومت ہند نے بھی مثبت رول ادا کیا۔ سرحد پر پاکستانی وفد کا استقبال کرنے والوں میں عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمٰن کے علاوہ این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر خواجہ اکرام، سابق ہندوستانی سفیر و ممبر پارلیمنٹ م افضل، پروفیسر صادق، پروفیسر خالد اشرف، ثریا ہاشمی، شاہینہ تبسم، شکتی سدھو، محمد سلیمان (قطر)، فاروق ارگلی، اھینو امروز کے مدیر ڈاکٹر ملک راج کمار، منٹو کے آبائی گاؤں سمرالا کی تنظیم لیکھک منچ کے صدر گرجیت شاہی و دیگر لوگوں کے علاوہ پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کے نمائندوں کی بڑی تعداد بھی مدعو تھی۔ صبح ساڑھے 10 بجے ہندوستانی وفد واگھہ سرحد پر پہنچ گیا تھا۔ لیکھک منچ کے بینر تلے سکھ نوجوانوں اور قلمکاروں کا ایک وفد بھی ہاتھوں میں ہار اور استقبالیہ بینر لیے منٹو کی بیٹیوں اور دیگر لوگوں کا منتظر تھا۔ بالآخر تقریباً 12 بجے اس وفد نے جیسے ہی سرحد کو عبور کیا، فضا میں 'ہند-پاک دوستی زندہ باد' اور 'سعادت حسن منٹو زندہ باد' کے نعرے لگے۔ منٹو کی بیٹیوں سمیت تمام ممبران کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ منٹو کی بیٹیوں نے روزنامہ راشٹریہ سہارا سے گفتگو میں امید ظاہر کی کہ یہ پروگرام نہ صرف منٹو کے سلسلے میں اہم ثابت ہوگا بلکہ ہند-پاک رشتوں کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کرے گا۔ اس مختصر گفتگو کے بعد تمام لوگ ہندوستانی گیٹ کے قریب بنے بڑے پنڈال میں پہنچے جہاں وفد کے استقبال اور منٹو پروگرام کا اہتمام عالمی اردو ٹرسٹ، این سی پی یو ایل اور بی ایس ایف کی مشترکہ

کوششوں سے کام کیا گیا تھا۔ بیس ایس ایف کے جوان پروگرام کے دوران کافی سرگرم اور مہمان نوازی کرتے نظر آئے۔ پروگرام کا آغاز عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمٰن کے استقبالیہ کلمات سے ہوا جس میں انھوں نے بی ایس ایف اور مرکزی حکومت کا شکریہ ادا کیا اور منٹو کو غیر منقسم ہندوستان کا عظیم ترین افسانہ نگار بتاتے ہوئے کہا کہ انھیں ہندی، پنجابی اور اردو میں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر خواجہ اکرام نے اردو کے حوالے سے اسے سرحد پر منعقد ہونے والا پہلا اہم پروگرام قرار دیا اور کہا کہ اس کا مقصد عالمی سطح پر منٹو کے تعلق سے پیغام دینا ہے۔ خواجہ اکرام نے منٹو کے افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کو دنیا کے ادب میں اپنی نوعیت کا واحد افسانہ قرار دیا۔ سابق راجیہ سبھا رکن م۔ افضل نے اس پروگرام کے انعقاد کے لیے بی ایس ایف اور مرکزی حکومت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے منٹو کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے پنجاب کے حوالے سے منٹو کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ منٹو انسانیت کے لیے جیے اور انسانیت کے لیے مرے۔ انھوں نے کہا کہ منٹو کا سیاسی وژن ہر طرح کی سرحد کے خلاف تھا اور انھوں نے ہندو مسلم سیاست کی نفی کی ہے۔ منٹو پر کافی تحقیقی کام کر چکے پروفیسر صادق نے انھیں اپنے دور کی دو اہم شخصیات میں سے ایک بتاتے ہوئے کہا کہ نظم میں اقبال اور افسانہ میں سعادت حسن منٹو کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ پروفیسر صادق نے بتایا کہ منٹو کی ذہنی وراثت 24 زبانوں میں پہنچ چکی ہے۔ اس کے علاوہ سمرالا کے دلجیت شاہی، منٹو کی تینوں بیٹیاں نگہت پٹیل، نصرت جلال، نزہت اور پروفیسر رابعہ سرفراز نے بھی مختصر الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ پاکستان کے سرکردہ نقاد مرزا حامد بیگ نے منٹو کے خاکوں کو بہترین قرار دیتے ہوئے 'جدن بائی'، 'اشوک'، 'نرگس'، اور 'نسیم' پر لکھے گئے خاکوں کی تعریف کی اور کہا کہ آج منٹو کا حکم چل رہا ہے اور یہ چلتے رہنا چاہیے۔ پاکستان سے ہی آئیں پروفیسر طاہرہ اقبال نے اپنی کتاب 'منٹو کا اسلوب' کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ منٹو نہ کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور نہ انھوں نے کسی تنظیم کے لیے لکھا بلکہ ہمیشہ انسانیت کے لکھتے رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 ستمبر 2012

پنجاب میں منٹو کی بیٹیوں کا خیر مقدم

لدھیانہ پیروڈی : اردو کے معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے گاؤں پپروڈی میں پاکستان سے پہلی مرتبہ تشریف لائیں دختران منٹو کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے اشتراک سے لیکھک سنگھ اور منٹو فاؤنڈیشن سمرالہ پنجاب کے زیر اہتمام پپروڈی میں شاندار استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں دختران منٹو نکہت پٹیل، نزہت ارشاد اور نصرت جلال کو منٹو کی یادگار تصویریں، شال، گلدستہ، مومنٹو وغیرہ پیش کر کے ان کے گاؤں آنے پر اظہار تشکر کیا گیا۔ پاکستانی اور ہندوستانی ادیبوں اور دانشوروں کا وفد لدھیانہ سے چل کر سب سے پہلے سمرالہ پہنچا جہاں مہمانوں پر پھول نچھاور کر کے پنجاب کے روایتی ڈانس بھانگڑے کے ساتھ شاہانہ انداز میں استقبال کیا گیا۔ مقامی رکن اسمبلی امریک سنگھ ڈھلوں نے گلدستوں سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ پھر یہ پورا قافلہ منٹو کے گاؤں پپروڈی پہنچا جہاں آتش بازی اور پھولوں کی بارش سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ پورے گاؤں میں گشت کرنے کے بعد یہ جلوس منٹو کے آبائی گھر پہنچا۔ پورے جلوس میں مائیک کے ذریعہ منٹو کی تعریف کی جارہی تھی۔ 'منٹو امر رہیں گے' کے نعرے لگائے جارہے تھے۔ پاکستانی وفد میں شامل مہمانوں کا کہنا تھا کہ ایسا استقبال میں نے پہلی بار دیکھا ہے کہ کسی قلم کار کی بیٹیوں کی آمد پر اس قدر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔ آج منٹو کی وجہ سے ہمارا بھی ایسا استقبال ہوا ہے جیسے ہم کوئی الیکشن جیت کر آئے ہوں۔ پاکستانی وفد نے کہا کہ ہمیں منٹو پر اور ان کے گاؤں کے لوگوں پر فخر ہے۔ دختران منٹو نے اپنے آبائی گھر پہنچ کر فخر محسوس کیا اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے موجودہ مکان مالک سریندر کور سے کہا کہ ''آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ ہمارے ابا کے گھر میں قیام پذیر ہیں۔'' سریندر کور نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کو گلے سے لگایا اور دختران منٹو کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔

دختران منٹو نے اس کمرے میں تھوڑی دیر قیام کیا کہ جہاں پر منٹو پیدا ہوئے تھے اور جس کمرے میں رہتے تھے۔ گاؤں میں موجود 100 سالہ خاتون پرسنی دیوی سے دختران منٹو نے ملاقات کی اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ واضح رہے کہ اس گاؤں میں یہ واحد خاتون ہیں جنھوں نے منٹو کو دیکھا ہے اور ان کے اہل خانہ اور ان سے واقف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ منٹو کا پورا گھرانہ کشمیری مسلمان کے نام سے مشہور تھا۔ عید کے موقع پر بطور خاص ہم منٹو کے گھر جاتے تھے، سب سے ملاقات کرتے تھے اور سوئیاں کھاتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ منٹو بہت شرارتی تھے، لکھنے پڑھنے میں ان کا من نہیں لگتا تھا، اس لیے ان کے گھر والے ان سے کافی ناراض رہتے تھے لیکن بعد میں انھوں نے نام روشن کیا۔ دختران منٹو اپنے گھر سے نکل کر جلسے گاہ شاہی اسکول پہنچیں جہاں پر سیکڑوں کی تعداد میں موجود لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ ان کے پہنچتے ہی ہندوستان پاکستان زندہ باد، انڈو پاک دوستی زندہ باد اور سعادت حسن منٹو امر رہے کے نعرے لگائے گئے۔ لیکھک سنگھ سمرالہ کے صدر دلجیت شاہی نے آئے ہوئے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور منٹو کی حیات اور ان کے کارنامے پر روشنی ڈالی گئی۔ اس تقریب میں پاکستان سے دختران منٹو کے علاوہ پروفیسر طاہرہ اقبال، پروفیسر رشید امجد، پروفیسر مرزا حامد بیگ، پروفیسر رابعہ سرفراز، طاہر تونسوی اور ارشد فاروق نے شرکت کی جب کہ ہندوسان سے مرکزی وزیر کپل سبل کے بڑے بھائی ولی کے سبل، پروفیسر صادق، فاروق ارگلی، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر شاہینہ تبسم، ڈاکٹر ملک راج کمار، دور درشن کی سابق سینئر ڈائریکٹر ثریا ہاشمی، سلیمان دہلوی، شکتی سدھو، منیشا نے وغیرہ نے بطور خاص شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 ستمبر 2012

منٹو زندگی سے زندگی تک

نئی دھلی: ہندوستان میں اگر سچی جمہوریت ہے تو اردو اس کا مرکزی کردار ہے، اردو ہی ملک کی تہذیبی روایت کی ضامن ہے۔ اردو کے روزمرہ الفاظ اور محاوروں پر جو عبور سعادت حسن منٹو کو حاصل ہے وہ سکہ بند اردو والوں کو بھی نہیں۔ منٹو ایشیا کا سب سے بڑا المیہ کا کردار ہے۔ منٹو کے ساتھ ابھی تک انصاف نہیں کیا گیا اور نہ ہی منٹو کو پوری طرح سمجھا گیا جس دن منٹو کو پوری طرح سمجھ لیا گیا اسی دن سے منٹو کی ایکائی زندگی کا آغاز ہوجائے گا۔ ان خیالات کا اظہار سعادت حسن منٹو کی صدی تقریبات کے سلسلے میں 7 ستمبر کو ایوانِ غالب میں عالمی اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام 'سعادت حسن منٹو: زندگی سے زندگی تک' کے عنوان سے منعقد ایک بین الاقوامی سیمینار میں پدم بھوشن و ستارۂ امتیاز سے سرفراز پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔ اس بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے اشتراک اور تعاون سے کیا گیا تھا۔ اس میں مہمان خصوصی کے طور پر پاکستان سے آئی ہوئیں منٹو کی تینوں بیٹیوں نگہت پٹیل، نزہت ارشد اور نصرت جلال نے شرکت کی، جبکہ مہمان ذی وقار غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور منٹو کے افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' پر بنائی گئی فلم کی پروڈیوسر محترمہ شکتی سدھو تھیں۔ اس موقعے پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ منٹو بلاشبہ برصغیر دونوں ملکوں کے مایہ ناز مصنف تھے اور عالمی شہرت کے حامل تھے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ منٹو کی کہانیاں صرف کہانیاں ہی نہیں، بلکہ اقدار کی علامتوں کی نظیر ہیں۔ پروفیسر صادق نے بتایا کہ منٹو نے بے شمار ریڈیو ڈرامے لکھے اور ایک فلم مرزا غالب بھی لکھی جسے 1954 میں بہترین فلم کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ منٹو اردو کہانیوں کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ انھوں نے منٹو کی کہانیوں کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا کہ منٹو زندگی کے ان حقائق کو سامنے لائے جنھیں اکثر لوگ چھپاتے ہیں یا ان سے نظریں چراتے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے اردو اکادمی کا اس سال کا ڈرامہ فیسٹول منٹو کے ڈراموں سے منسوب کرنے کا اعلان کیا۔ این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ منٹو کے افسانوں و کہانیوں کے سامنے دنیا کی ہر زبان کی کوئی بھی تخلیق بے اثر نظر آتی ہے۔ ثقافتی، تہذیبی و ادبی اعتبار سے وہ ایک تاریخی خصوصیت کے حامل ہیں۔ اس موقعے پر منٹو کی بیٹیوں نگہت پٹیل اور نزہت ارشد نے ہندوستان خصوصاً پنجاب میں ان کے والہانہ استقبال پر حیرت و خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستانی عوام کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ ہم منٹو کی بیٹیاں ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں سعادت حسن منٹو کے یہاں پیدا کیا۔ انھوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ جلد ہی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستانہ و خوشگوار تعلقات کی بحالی ہوگی۔ دونوں ممالک کے عوام کے درمیان قریبی تعلقات کے قیام کے لیے انھوں نے دونوں ممالک کی حکومتوں سے ویزا کو سہل بنانے کی اپیل کی۔ مرزا حامد بیگ نے ہندوستان میں منٹو پر اتنے بڑے پیمانے پر صدی تقریبات کے انعقاد پر خوشی و حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں رہتے ہوئے یہ سوچا نہیں جاسکتا کہ ہندوستان میں منٹو پر اس طرح کی تقریبات کا انعقاد ممکن ہے۔ لدھیانہ کے سمرالہ علاقہ جو کہ منٹو کا آبائی وطن ہے، کے ایڈووکیٹ دلجیت سنگھ شاہی نے منٹو کے گاؤں میں پنچایت کی زمین پر منٹو میموریل قائم کرنے کا اعلان کیا اور عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمٰن نے اس کے لیے 3 کروڑ روپے کی امداد کا وعدہ کیا۔ اے رحمٰن نے سیمینار کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے حکومت ہند کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر امرتسر کے ایڈووکیٹ سدرشن کپور، معروف اسٹیج آرٹسٹ عزیز قریشی، اشوک بھٹ نے بھی اظہار خیال کیا، جب کہ ہندی کے معروف رسالہ 'بھیمنو افروز' کے ایڈیٹر دیویندر بہل نے اپنے رسالہ کا اگلا شمارہ منٹو نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا۔ بعد ازاں سیمینار میں اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد علوی نے منٹو کو فنکار سے زیادہ دماغی طور سے تیز، دوراندیش اور ذہین شخص قرار دیا اور کہا کہ منٹو نے نفسیاتی الجھنوں کو قلم کی مدد سے تخلیقات کی شکل دے دی۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے کہا کہ منٹو کے یہاں موضوعات کی کوئی کمی نہیں وہ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی تخلیقات میں زیادہ فضا شہری ہے۔ ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے 'بابو گوپی ناتھ: منٹو کا ایک بے مثال کردار' کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ وقت نے فیصلہ کردیا ہے کہ منشی پریم چند کے بعد منٹو جیسا حقیقت پسند افسانہ نگار کوئی اور نہیں۔ پاکستان سے آئے ہوئے مرزا حامد بیگ نے اپنے مقالہ میں منٹو کی زبان اور طرز بیان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ منٹو طویل جملے لکھنے کے قائل نہیں تھے اور پنجابی میں سوچتے تھے اور اردو میں لکھتے تھے۔ پروفیسر رابعہ سرفراز (پاکستان) نے 'سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں بچوں کے کردار' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ پاکستان کی پروفیسر طاہرہ اقبال نے 'منٹو کے اسلوب کے تشکیلی عناصر' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا اور ان کے اسلوب بیان، ذخیرہ الفاظ، شائستگی و روانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ کسی بھی لفظ کو کمتر یا غیر معیار تصور نہیں کرتے تھے۔ اس موقعے پر اروند گوڑ (ڈرامہ ڈائریکٹر) شاہد ماہلی، فیاض رفعت، نذیر فتح پوری، نارنگ ساقی، پروفیسر سید منظور احمد، نرمل سنگھ نرمل، شیخ علیم الدین اسعدی، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی اور سلطان الدین چودھری سمت بڑی تعداد میں علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والی شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 ستمبر 2012

سیمینار کے دوران اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کے پروفیسر مرزا حامد بیگ، اسٹیج پر بیٹھے ہوئے اے رحمٰن، پروفیسر صادق، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ اکرام الدین، پاکستان سے آئیں منٹو کی بیٹیاں نگہت پٹیل، نزہت ارشد اور نصرت جلال

دختران منٹو کا استقبال

نئی دھلی: مشترکہ ہندو پاک کے نامور ادیب سعادت حسن منٹو کے نامِ نامی سے اردو کا کون شخص واقف نہیں۔ ہم ہندوستان میں اردو کے اس بڑے فکشن نگار کی تینوں بیٹیوں کا استقبال کرتے ہیں۔ دخترانِ سعادت حسن منٹو محترمہ نگہت پٹیل، محترمہ نزہت ارشد اور محترمہ نصرت جلال کے استقبالیہ پروگرام میں اردو اکادمی، دہلی نے ایک نہایت باوقار مجلس آراستہ کی تھی۔ اس موقعے پر

دائیں سے اے۔ رحمٰن، نزہت ارشد، نگہت پٹیل، نصرت جلال، سید محمد اشرف، صغرا مہدی، پروفیسر اختر الواسع اور ڈائس پر انیس اعظمی

وائس چیئرمین اردو اکادمی، دہلی نے تمام مہمانوں کے ساتھ دخترانِ منٹو کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی کا احساس ہو رہا ہے کہ اس بار اردو اکادمی، دہلی کا چوبیسواں اردو ڈراما فیسٹول منٹو پر منسوب ہوگا جو 8 تا 12 اکتوبر کو سری رام سینٹر میں منعقد کیا جائے گا۔ بعدازاں پروفیسر اختر الواسع نے اسٹیج پر موجود صدرِ مجلس مشہور فکشن نگار سید محمد اشرف کا تعارف کرانے کے ساتھ دیگر مہمانوں کا بھی تعارف کرایا۔ اس سے قبل پروگرام کے آغاز میں اکادمی کی روایت کے مطابق معزز مہمانوں کا پھولوں کے گلدستے سے استقبال کیا گیا۔ اس موقع پر عالمی اردو ٹرسٹ کے بانی جناب اے رحمٰن نے اپنی تقریر میں دخترانِ منٹو کو پاکستان سے ہندوستان بلانے اور پھر واگھہ بارڈر پر ایک تاریخی پروگرام کے انعقاد نیز دہلی کے مختلف اداروں میں ان کے سلسلہ میں تقاریب کے اہتمام کی روداد سنائی۔ بعدازاں منٹو کی صاحبزادی محترمہ نگہت پٹیل، محترمہ نزہت ارشد اور محترمہ نصرت جلال نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستان میں منٹو کے چاہنے والوں کی والہانہ عقیدت کو سلام کیا اور اس سفر کو نہایت کارآمد اور اپنی زندگی کا بیش قیمتی اثاثہ قرار دیا۔ جلسے کی مہمانِ خصوصی پروفیسر صغرا مہدی نے بھی اس جلسے میں باجود اپنی علالت کے شرکت کی اور نہایت جذباتی انداز میں منٹو کی تحریروں سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا۔ بعدازاں صدرِ جلسہ مشہور فکشن نگار سید محمد اشرف نے اپنی دلچسپ صدارتی تقریر میں تمام شرکا، اکادمی اور بطورِ خاص پروفیسر اختر الواسع کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ ہندوستان کی سب سے فعال اردو اکادمی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کے ادیبوں کے خاندان سے بھی انھیں ویسی ہی محبت ہے جیسی زندہ ادیبوں سے۔ انھوں نے فرمایا کہ یہاں موجود صاحبزادیاں ایک ایسے باپ کی بیٹی ہیں جنھوں نے بڑے بڑے جگادریوں کو اپنے قلم سے خاموش کردیا تھا۔ منٹو اپنی بیٹیوں سے محبت کرنے والے باپ تھے اور اگر ہم ان کی بیٹیوں سے محبت کررہے ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ ان کی روح خوش ہو رہی ہوگی۔ انھوں نے پاکستان کے تمام شہریوں نیز حکومت کو منٹو کی بیٹیوں کے ذریعے یہ پیغام دیا کہ ہم ہندوستان کے تمام لوگ پاکستان کے ادیبوں سے محبت کرتے ہیں، وہاں کے مشائخ سے محبت کرتے ہیں، وہاں کے موسیقاروں سے محبت کرتے ہیں۔ بعدازاں سکریٹری اردو اکادمی انیس اعظمی نے مہمانوں نیز شرکائے جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام کی نظامت شعیب رضا فاطمی نے کی۔

پریس ریلیز، اردو اکادمی، دہلی، 10 ستمبر 2012

منٹو ایک صدی بعد

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تین روزہ انٹرنیشنل سیمینار 'سعادت حسن منٹو ایک صدی بعد' کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ منٹو بہت ہی ذہین اور قابل انسان تھے۔ انھوں نے بھوک، بٹوارہ اور فساد پر بھی مضمون لکھے ہیں اور جنگ کے خلاف بھی ان کے مضامین ہیں۔ وائس چانسلر نے کہا کہ منٹو 1935 میں علی گڑھ کے طالب علم رہے مگر اپنی بیماری کی وجہ سے علی گڑھ میں تعلیم مکمل نہیں کرسکے۔ انھوں نے کہا کہ منٹو نے ہندوستانی فلم 28 روز میں بھی کام کیا تھا۔ منٹو کی نواسی عائشہ جلال نے ان پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں ان کی نشہ خوری کا ذکر کیا ہے۔ اس موقعے پر وائس چانسلر نے تین کتابوں کا بھی اجرا کیا۔ اردو کے ممتاز دانشور پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے کلیدی مقالے میں کہا کہ منٹو کے زمان و مکان کا ایک مخصوص دائرہ تو ہے مگر منٹو اس دائرہ کا قیدی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ تقسیم ملک کے پس منظر میں ہمارے یہاں جو فکشن سامنے آیا اس کا سب سے قیمتی اور لازوال حصہ منٹو کے افسانے ہیں۔ انھوں نے انیسویں صدی کو اردو ادب میں غالب کی صدی اور بیسویں صدی کو منٹو کی صدی قرار دیا۔ اردو کے ممتاز دانشور پروفیسر قاضی افضال حسین نے کہا کہ منٹو کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ علی سردار جعفری نے اپنے طالب علمی کے دور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب وہ علی گڑھ کی طلبا یونین سے نکل رہے تھے تو اس وقت منٹو سے تعارف ہوا اور جب وہ ہاسٹل میں ان کے کمرے پر گئے تو وہ ان کی کتابوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور خاص طور پر علی گڑھ میگزین میں ایک انقلابی قلم کار کے طور پر ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ منٹو زندگی کے حقیقی معنی جاننا چاہتا تھا جس کی وجہ سے وہ پاگل خانہ تک چلا گیا۔ منٹو نے 238 افسانے لکھے۔ علی سردار جعفری نے منٹو کو ادبی دہشت گرد قرار دیا۔ اس سے قبل شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر محمد زاہد نے ملک اور بیرونِ ملک سے تشریف فرما مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اسرار الحق مجاز کی صدی کے موقعے پر اس شعبہ نے ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا اور اب منٹو کی صدی پر دوسرے بڑے سیمینار کا اہتمام کیا گیا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ یہ بھی تاریخ ساز ثابت ہوگا اور منٹو کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا۔ افتتاحی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے اردو کے ممتاز افسانہ نگار پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار نے کہا کہ جس وقت منٹو کا انتقال ہوا تھا اس وقت وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر تھے اور پہلی مرتبہ انھوں نے اپنے استاد پروفیسر احتشام حسین سے اختلاف کرتے ہوئے کہا تھا کہ منٹو ایک عظیم افسانہ نگار تھا۔ تین روزہ انٹرنیشنل سیمینار کے کنوینر پروفیسر صغیر افراہیم نے افتتاحیہ جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

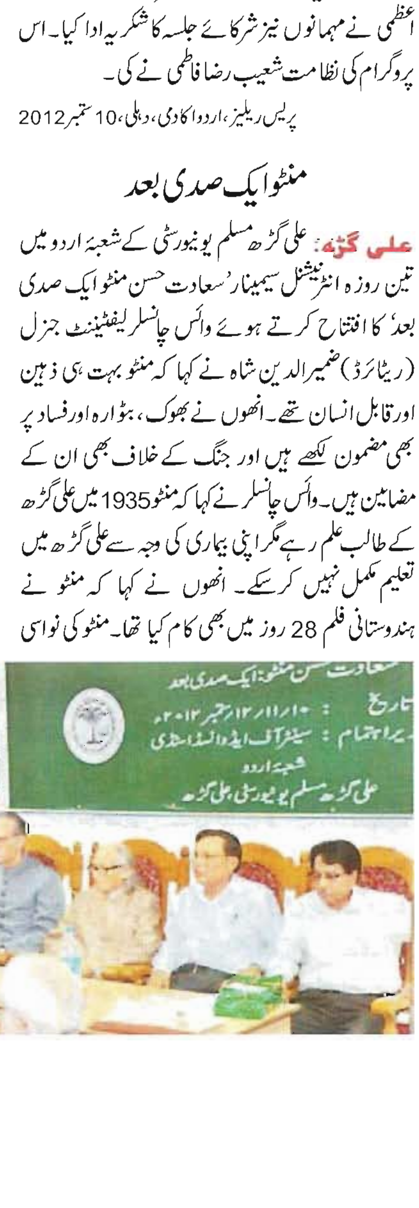

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 ستمبر 2012

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

احتشام حسین کا صد سالہ یوم پیدائش

نئی دھلی: مشہور ترقی پسند نقاد پروفیسر احتشام حسین 1912 میں پیدا ہوئے تھے، ان کی پیدائش کے سو سال پورے ہونے پر غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر غالب اکیڈمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر احتشام حسین اردو ہی نہیں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب سے واقفیت رکھتے تھے عالمی ادب اور

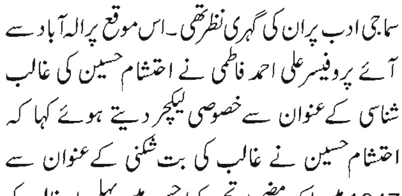

دائیں سے شاہد ماہلی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر شمیم، پروفیسر علی احمد فاطمی اور ڈاکٹر عقیل احمد

سماجی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس موقع پر الٰہ آباد سے آئے پروفیسر علی احمد فاطمی نے احتشام حسین کی غالب شناسی کے عنوان سے خصوصی لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ احتشام حسین نے غالب کی بت شکنی کے عنوان سے 1947 میں ایک مضمون تحریر کیا جس میں پہلی بار غالب کو سماجی تناظر میں دیکھا گیا۔ دوسرا مضمون انھوں نے غالب کا تفکر کے عنوان سے لکھا جس میں انھوں نے کہا کہ محض یہ دیکھنا کہ شاعر کس طبقے میں پیدا ہوا یا سماج کے کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے کافی نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے زندگی کی کشمکش سمجھنے میں اپنے ذہن اور شعور کی توسیع کس طرح کی اور عصری مسائل کے سمجھنے کے سلسلے میں ان کا کیا رویہ رہا۔ اس موقعے پر پروفیسر عتیق اللہ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر احتشام حسین کی حیثیت ایک استاد کی تھی ایک ترقی پسند نقاد کی تھی وہ صاحب علوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی موقعے پر متین امروہوی نے احتشام حسین کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ جلسے کے آخر میں ڈاکٹر عقیل احمد نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ احتشام حسین کی تحریریں آج بھی طلبا اساتذہ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کی کتاب اردو کی کہانی اور اردو ادب کی تنقیدی تاریخ کا مطالعہ اردو زبان وادب کے طالب علم کے لیے ناگزیر ہے۔

پریس ریلیز، عقیل احمد، دہلی، 10 ستمبر 2012

مدرسہ تعلیم اور اردو

علی گڑھ: جامعہ اردو علی گڑھ کے زیر اہتمام مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال آڈیٹوریم میں 'مدرسہ تعلیم اور اردو کو روزگار سے جوڑنے کے امکانات' موضوع پر ایک روزہ قومی سمینار کے مہمانِ خصوصی بہار قانون ساز کونسل کے چیئرمین سلیم پرویز نے کہا کہ جس کام کو خلوصِ نیت، ایمانداری، نیک نیتی اور اللہ کی رضا کے لیے انجام دیا جائے اس میں کامیابی یقینی ہے اور جامعہ اردو علی گڑھ اردو کے فروغ کے لیے نیک نیتی، ایمانداری سے سرگرم عمل ہے اور یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن جامعہ اردو کا جائز حق مل کر رہے گا۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین مسٹر صفدر حسین خاں نے کہا کہ حکومت اردو کو روزگار سے جوڑنے کے مسئلے پر سنجیدہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی میں مدارس کی تعداد تقریباً 200 ہے جن میں تکنیکی تعلیم کا بھی نظم ہے اور دہلی حکومت نے اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے CTET کی شرط کو بھی ختم کر دیا ہے۔ انٹیگرل یونیورسٹی لکھنؤ کے وائس چانسلر پروفیسر سید وسیم اختر نے کہا کہ مدارس اور اردو کے تعلیمی نظام کو زمینی حقیقتوں سے جوڑنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ انھوں نے مدارس میں سائنسی تجربہ گاہوں کے قیام اور تعلیم نظام کے معیار میں اضافہ پر بھی زور دیا۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو کے چیف آف بیورو اسد رضا نے کہا کہ جب ملک میں اوپن یونیورسٹی کا تصور بھی نہیں تھا تب سے جامعہ اردو اوپن یونیورسٹی کی حیثیت سے دنیا بھر میں ہندوستان کی نمائندگی اور اردو کے فروغ کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں جامعہ اردو مشاورتی کونسل کے چیئرمین پروفیسر رضا اللہ خاں نے کہا کہ آج کا سیمینار اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کے امکانات وضع کرنے کے ساتھ ہی جامعہ اردو علی گڑھ کی اسناد کو سرکاری سطح پر شرفِ قبولیت اور مساوی حیثیت دلانے میں اہم رول ادا کرے گا۔ اس سے قبل جامعہ اردو کی رجسٹرار صبا خاں نے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے جامعہ اردو کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بابائے قوم مہاتما گاندھی خود جامعہ اردو علی گڑھ کے فروغ میں دلچسپی رکھتے تھے مگر افسوس کہ حکومت نے اس ادارہ کے ساتھ ہمیشہ سوتیلا رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے

آج 73 سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود جامعہ اردو علی گڑھ اپنے استحکام کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس موقعے پر ممتاز فلم اداکار یوسف خاں عرف دلیپ کمار، دہلی کی وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دیکشت، سماجوادی پارٹی کے قومی صدر مسٹر ملائم سنگھ یادو، ممتاز فلم ڈائرکٹر اور شاعر سمپورن سنگ کالرا 'گلزار' کو ان کی غیر موجودگی میں اور روزنامہ راشٹریہ سہارا کے چیف آف بیورو اسد رضا کو ان کی موجودگی میں دکتورِ ادب (D.Litt)، سے سرفراز کیا گیا۔ نظامت کے فرائض جناب زبیر شاداب نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 31 اگست، 2012

فراق کے یومِ پیدائش پر یادگاری جلسہ

الہ آباد: فراق کی یوم پیدائش کے موقعے پر مہاتما گاندھی انٹرنیشنل ہندی یونیورسٹی، وردھا کی الہ آباد شاخ کے زیر اہتمام ستیہ پرکاش مشرا سبھاگار میں ایک یادگاری ادبی جلسے کا انعقاد کیا گیا، جس میں اردو اور ہندی کے ادب دوستوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ 'فراق اور ہندوستانی تہذیب' موضوع پر منعقدہ جلسے کی صدارت بزرگ ترقی پسند ناقد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر سنتوش بھدوریہ نے انجام دیے۔ پروفیسر عقیل رضوی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ فراق صاحب کا میں بھی شاگرد رہا ہوں۔ فراق صاحب کی شخصیت مختلف الجہات ہے۔ جسے سمجھنے کے لیے خاصے وقت کی ضرورت ہے۔ فراق صاحب کو اپنی بات کہنے کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ وہ کلاس میں ایک خاص موڈ سے پڑھاتے تھے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ فراق صاحب کی الہ آباد یونیورسٹی

میں وہ قدر نہیں ہوئی جس کے وہ متحمل تھے۔ فراق صاحب یقیناً اردو کے بڑے شاعر تھے۔ جلسے کے مقررِ خاص پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنی عالمانہ تقریر میں کہا کہ فراق پر انگریزی کی رومانی شاعری کا خاص اثر تھا۔ میر کے تو وہ عاشق تھے۔ مقامیت کس طرح آفاقیت میں بدل جاتی ہے، اس کا اندازہ ہمیں فراق کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے ہوتا ہے۔ فراق کے یہاں ہندوستانی تہذیب کو اپنی شاعری میں برتنے کا عمل بڑا دلچسپ ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حوالے کے طور پر فراق کی کچھ رباعیاں، نظموں اور غزلوں کے شعر بھی پیش کیے۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی حال ہی میں 'فراق اور الہ آباد' منظر عام پر آئی ہے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر او پی مالویہ نے اپنے طالب علمی کے زمانے کی یاد تازہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک بار امریکی دانشور سیموئلس الہ آباد یونیورسٹی میں تشریف لائے، انھوں نے فراق صاحب کی انگریزی کی رومانی شاعری سے متعلق 90 منٹ کی تقریر سننے کے بعد کہا کہ اتنا عمدہ لکچر تو امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں بھی نہیں سننے کو ملا۔ فراق گورکھپوری سے متعلق اپنی دلچسپ گفتگو میں انھوں نے کہا کہ فراق صاحب کے اندر انسان سے ہمدردی کا جذبہ زبردست تھا۔ بعض اوقات انھوں نے اپنے دشمنوں کی مدد کرنے سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ مہمانِ اعزازی رمیش چند دویدی نے جنھیں فراق کے ساتھ طویل عرصہ گزارنے کا شرف حاصل ہوا، اپنی تقریر میں کہا کہ فراق کو سمجھنا بہت مشکل ہے لیکن فراق کو غلط سمجھ لینا بہت آسان ہے۔ فراق کے جیسا ذہن شخص ہم نے اب تک نہیں دیکھا ہے۔ فراق ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ فراق صاحب کسی سے دب کر زندگی جینے والے انسان نہیں تھے۔ وہ تلفظ کی غلطی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے فراق صاحب سے متعلق کئی دلچسپ واقعے سنائے اور ایک خاص انداز سے ان کے اشعار بھی پیش کیے۔ جلسے کے آخر میں مشہور ڈراما نگار اور فلمی اداکار راے کے ہنگل کے انتقال پر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر حسین جیلانی، الہ آباد، 28 اگست 2012

مولانا حالی کے 175ویں یوم پیدائش پر ورکشاپ

نئی دھلی: میوات ڈیولپمنٹ ٹرسٹ کے سلور جوبلی سیلی بریشن کے موقعے پر 'ہریانہ، حالی و بچی' کے موضوع پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ایک ورکشاپ منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر پلاننگ کمیشن کی ممبر سیدین حامد، ممبر پلاننگ کمیشن کی سرپرستی میں تین سیشن منعقد کیے گئے جن میں محترمہ سیدین حامد نے مولانا الطاف حسین حالی کی بیش قیمتی تصانیف پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا حالی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ انھوں نے بالخصوص ہریانہ اور دیگر ریاستوں میں لڑکیوں کی گھٹتی جنسی شرح پر حیرت جتائی اور لڑکیوں کی کم ہوتی جنسی شرح میں اضافہ کے لیے نئی حکمت عملی تیار کرنے کی مختلف تجاویز ورکشاپ میں بیان کیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی علمی بصیرت کو دیکھتے ہوئے آپ کی شخصیت کو 19 ویں صدی میں شمس العلما کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اس موقعے پر دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر ایچ خان نے ورکشاپ میں بطور مہمان اعزازی مولانا حالی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا نے بحیثیت قلم کار ملک کی ممتاز شخصیات کی سوانح عمری لکھی جس میں سرسید احمد خان، بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سوانح عمری ایک بڑا کام ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 ستمبر 2012

این ٹی ایس آئی ورکشاپ میں اردو کی وکالت

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے نیشنل ٹیسٹنگ سروس انڈیا، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز میسور کے

علاقائی مرکز کے اشتراک سے منعقد پانچ روزہ ورکشاپ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ وہ انگریزی کے قائل ہیں لیکن اردو ان کی بھی مادری زبان ہے اور وہ ہمیشہ اس کی وکالت کرتے ہیں کہ اردو کی ہر طرح سے فروغ ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اگر اردو والے حقیقی معنوں میں اس زبان کا فروغ چاہتے ہیں تو اسے آسان بنائے رکھیں۔ جنرل شاہ پروگرام کے صدر کی حیثیت سے خطاب کررہے تھے۔ مہمان خصوصی پروفیسر اے آر قدوائی نے نیشنل ٹیسٹنگ سروس انڈیا کی خدمات کا فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ اردو کو ادبی زبان کے علاوہ علمی زبان کی حیثیت سے فروغ دلانے میں اہم کردار ادا کررہا ہے۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں نصاب، درسی مواد، درسی طریقۂ کار اور امتحانات کی جدید نوعیت پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ نیشنل ٹیسٹنگ سروس انڈیا عالمی سطح کے تعلیمی نظام کی قائل ہے اور اس کے نزدیک تعلیمی معیار کا مطلب تعلیمی کیفیت و کمیت اور مساوات کے ذریعہ طالب علم کی شخصیت کی ہمہ جہت ترقی تعلیمی منزل مقصود کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے قبل اپنے استقبالیہ خطبہ میں پروگرام کوآرڈی نیٹر پروفیسر اے آر فتیحی نے نیشنل ٹیسٹنگ سروس انڈیا کے منصوبوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ تدریس میں پیمائش، جائزہ اور تعین قدر کے امور کو منطقی انداز سے نافذ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ پروفیسر امتیاز حسنین نے آزمائش و تعین قدر سے متعلق دنیا بھر کی تنظیموں اور ان کی منصوبہ بندی کا جائزہ لیا۔ پروفیسر غضنفر علی نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اردو کو جدید طرز تدریس سے جوڑنے پر زور دیا۔ پروفیسر خطیب سید مصطفےٰ، صدر، شعبۂ لسانیات نے تمام جامعات کے تعلیمی معیار کو یکساں بنانے کے لائحہ عمل پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کی نظامت کے کوآرڈی نیٹر نیشنل ٹیسٹنگ سروس انڈیا ڈاکٹر زبیر شاداب نے کی۔ انھوں نے اپنی تمہیدی گفتگو میں داخلے کے لیے میلان آزمائش، سند کے لیے تحصیل آزمائش اور ملازمت کے لیے استعداد و روانی آزمائش کے نکات پر روشنی ڈالی۔ نیشنل ٹیسٹنگ سروس انڈیا کے جی ایم سالک نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مسٹر راگھون نے نیشنل ٹیسٹنگ سروس انڈیا اور سی آئی آئی ایل کے تکنیکی پہلوؤں پر دستاویزی فلم کے ذریعہ روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 اگست 2012

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں توسیعی خطبہ

نئی دھلی: "مغربی دنیا میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان افہام وتفہیم کے عمل میں امید افزا پیش رفت ہورہی ہے۔ اگرچہ مختلف مغربی ملکوں کے عیسائی عوام میں اسلام سے متعلق غلط فہمیاں اور شکوک وشبہات برقرار ہیں مگر علمی اور عوامی دونوں سطحوں پر ان دونوں مذہبی روایتوں کے درمیان مفاہمت اور بقائے باہم کو فروغ دینے کی مشترکہ کوششیں بھی جاری ہیں جن کے موثر نتائج سامنے آرہے ہیں۔" ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ڈاکٹر عطاء اللہ صدیقی نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ ڈاکٹر صدیقی برطانیہ کی گلاؤ سیسٹر شائر یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر اور مارک فیلڈ انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ایجوکیشن، برطانیہ کے سابق ڈائرکٹر ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی نے گزشتہ چار دہائیوں کے دوران اسلام سے متعلق کئی اہم عیسائی مفکروں اور مصنفوں کے خیالات کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے افکار

سے عیسائی علمی حلقوں میں اسلام کے بارے میں سابقہ معاندانہ رویے کے برعکس خاصا ہمدردانہ اور مفاہمانہ رجحان نمایاں ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں میں ایسے افراد کی حددرجہ کمی ہے جو مغربی لوگوں کو ان کے مخصوص ذہن و مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلام سے متعارف کراسکیں۔ اس سے پہلے ذاکرحسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر اخترالواسع نے فاضل مقرر کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صدیقی جن کا تعلق الہ آباد سے ہے، تقریبا تین دہائیوں سے برطانیہ اور دیگر مغربی ملکوں میں اسلام کے تعارف اور اسلام اور مسیحیت کے درمیان بین مذہبی مکالمے کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ تقریب کی صدارت فادر تھامس کونکل نے کی جو کیتھولک عیسائیوں کے زیراہتمام اسلامک اسٹڈیز ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے اسلام کی مثبت عیسائی تفہیم کو فروغ دینے میں سرگرم ہیں۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر صدیقی کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کو فروغ دینے اور غلط فہمیوں کی خلیج پاٹنے کی کوششوں کو مزید تقویت دینے پر زور دیا۔ اس توسیعی خطبے کے سامعین میں اسلام۔ عیسائی مکالمے سے علمی اور عملی دلچسپی رکھنے والے کئی ممتاز اسکالر اور دانش ور شامل تھے۔ ان کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ، ریسرچ اسکالروں اور طلبہ سمیت کئی ممتاز دانش وروں نے بھی تقریب میں شرکت کی۔

پریس ریلیز، ذہین اختر ندوی، دہلی، 27اگست 2012

ایران کی افسانہ نگاروں کے ساتھ تبادلۂ خیال

علی گڑھ: ایران میں اسلامی انقلاب کے 35 سال بعد فارسی ادب کے منظرنامے میں جو تبدیلی ہوئی اس کا سبب بڑی حد تک خواتین افسانہ نگاروں کی متنوع تحریر ہیں، خواتین افسانہ نگاروں نے ایرانی معاشرے کے مختلف مسائل کو اپنی تحریر میں جگہ دی اور عورتوں کی آزادی، جنگ، ہجرت وغیرہ موضوعات پر عوامی سطح پر اپنی موجودگی درج کرائی۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اور ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی کے اشتراک سے 'جدید ایران کی خواتین افسانہ نگاروں کے ساتھ تبادلہ خیال' کے عنوان سے منعقدہ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے اے ایم یو کے وائس چانسلر کی اہلیہ محترمہ صبیحہ سیمیں شاہ نے کیا۔ پروگرام میں مہمان خصوصی صبیحہ سیمیں شاہ کے علاوہ مہمان اعزازی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کی تعلیم نسواں سے متعلق کمیٹی کی صدر پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی، جنوادی لیکھک سنگھ کی صدر ڈاکٹر نیمات سنگھ اور ایرانی کلچر ہاؤس، نئی دہلی کے مرکز تحقیقات کے ڈائریکٹر ڈاکٹر علی رضا قزوہ بھی موجود تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے مہمانوں کا خیر مقدم اور پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ایران میں انقلاب اسلامی کے بعد مختصر افسانہ نے بڑی ترقی کی اور اس کی پیش رفت میں خواتین افسانہ نگاروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے مختلف خواتین افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ معروف فارسی افسانہ نگار راضیہ تجار نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا یہ انقلاب اسلامی کے بعد شاعری سے زیادہ نثر کو ترقی ہوئی اور خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرے کے مسائل کو اجاگر کیا۔ خود ان کے تقریباً 30 افسانوی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی نے کہا کہ شاعر اور نثر نگار ہی معاشرے کی صحیح تصویر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں اور یہ اطمینان کی بات ہے کہ آج کے ایران میں خواتین افسانہ نگار اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ ڈاکٹر نمیتا سنگھ نے اپنے صدارتی خطبہ میں ہندی زبان میں لکھی جانے والی کہانیوں اور بیان کیے جانے والے مسائل کی جانب توجہ دلائی ہندی کے پروفیسر پریم کمار نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایران کے عوام مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی زبان اور کلچر کی حفاظت کی سمت میں گرانقدر کام کیے ہیں۔ شعبۂ ہندی ے ڈاکٹر اجے بساریہ نے بھی خطاب کیا۔ پروگرام کے آخر میں مشاہدہ مرغوب نے حافظ کی غزل پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد احتشام الدین، اسٹنٹ پروفیسر، انسٹی ٹیوٹ آف پرشین ریسرچ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم ستمبر 2012

دھلی:

'اقلیتی ترقی نامہ' اردو میں شائع ہوگا

نئی دھلی: اے اسٹیپ فارورڈ (A stepforward) کتاب جلد ہی اردو زبان میں شائع کی جائے گی۔ یہ اعلان دہلی اقلیتی کمیشن کے ممبر سردار پشپندر سنگھ نے عید کے مبارک موقعے پر اندرلوک کی مکی جامع مسجد (بڑی مسجد) میں ہزاروں فرزندان توحید سے خطاب کرتے ہوئے بعد نماز عیدالفطر کیا۔ اس موقعے پر علاقے کے ممبر اسمبلی راجیش جین اپنے علاقے کے لوگوں کے بیچ پہنچ کر عید کی خوشی میں شامل ہوئے، جب کہ دہلی اقلیتی کمیشن کے ممبر سردار پشپندر سنگھ نے بطور خاص شرکت کی۔ عوام کو خطاب کرتے ہوئے پشپندر سنگھ نے اندرلوک کے مسلمانوں اور دہلی کے تمام لوگوں کو عید کی مبارکباد دی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اے اسٹیپ فار ورڈ (A step forward) کتاب اردو میں ترجمہ کراکر دہلی کے مدارس اور اردو پڑھانے والے تعلیمی اداروں میں مفت تقسیم کی جائے گی اور اس کتاب کا اردو ترجمہ کرانے کے لیے این سی پی یو ایل (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) کی مدد لی جائے گی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22اگست 2012

رفعت سروش کی یاد میں محفل غزل

نئی دھلی: معروف شاعر، براڈ کاسٹر اور ڈرامہ نویس رفعت سروش کی یاد میں معروف ادبی تنظیم 'نشست' اور 'پرواز شاہین رفعت سروش اکادمی' کے زیراہتمام انڈیا ہیبیٹ سینٹر کے گل مہر ہال میں ایک ادبی محفل اور محفل غزل کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام میں اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع، آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل و ہندی کے معروف شاعر لیلا دھر منڈلوئی، کلاسیکل وائلن نگار و براڈ کاسٹر شنو کھورانہ، ارشاد احمد حان اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایسوسی ایٹ پروفیسر و رفعت سروش اکادمی کے نائب صدر ڈاکٹر جی آر سید نے بطور خاص شرکت کی۔ اس ادبی محفل کی نظامت رفت سروش کی بیٹی وانڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن کی ایسوسی ایٹ پروفیسر شاہینہ خان نے کی، جب کہ محفل غزل میں مشہور کمپوزر اور میوزک ڈائریکٹر پنڈت جوالا پرشاد نے رفعت سروش کی غزلیں پیش کیں۔ اس سے قبل رفعت سروش کی آواز میں ریکارڈ کی گئی ان کی مختصر سوانح عمری پر مبنی تقریباً 10 منٹ کی آڈیو ویژول فلم دکھائی گئی۔ پروگرام کے آغاز میں 'نشست' نے اپنے ماہانہ ادبی پروگراموں کا پر پریزنٹیشن کیا۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے شاہینہ خان نے مختصراً اپنے والد رفعت فروش کی حیات و شخصیت، ادبی خدمات، سرگرمیوں، خانگی ماحول، دوران ملازمت ان کے تجربات، کامیابیوں، حصولیابیوں اور ان کی شریک حیات یعنی اپنی والدہ صبیحہ فروش کے ان کی زندگی میں مثبت رول کے بارے میں بتایا جب کہ ادبی تنظیم 'نشست'

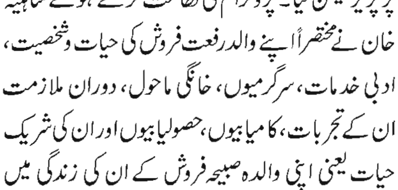

دائیں سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر جی آر سید اور بیٹھے ہوئے ارشاد خان، شنوں کھورانہ، لیلا دھر منڈلوئی، پروفیسر اخترالواسع اور شاہینہ خان

کے ذمہ دار 'کے کے کوہلی' نے تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس اور رفعت سروش کو لازم وملزوم قرار دیتے ہوئے کہا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مرکر بھی زندہ رہتے ہیں۔ رفعت سروش ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔ لیلا دھر منڈلوئی نے رفعت سروش کی براڈ کاسٹنگ، شعری وادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ رفعت سروش نے جس طرح اپنے ترقی پسند تحریک کے مزاج کو قائم رکھا اور نہایت آہستگی، شائستگی اور نرمی سے اپنی بات کہی یہ ان ہی کا خاصہ تھا۔ ڈاکٹر جی آر سید نے 'پرویز شاہین رفعت سروش اکادمی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا اور بحیثیت براڈ کاسٹر رفعت سروش کے کارناموں اور خدمات کا ذکر کیا۔ ارشاد احمد خاں اور شنو کھورانہ نے بھی رفعت سروش کی شخصیت اور فن پر اظہارِ خیال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 24 اگست 2012

جسٹس کاٹجو، عیدملن اور مشاعرہ

نئی دھلی: شاعر عام انسان نہیں ہوتا۔ وہ بہت حساس ہوتا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر معاشرے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز، اچھے برے واقعات و حادثات کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہر شاعر کے کلام کو غور سے سننا چاہیے اور اس کے پیغام کو سمجھنا چاہیے اور اس پر داد دینی چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار نائب صدر جمہوری ہند محمد حامد انصاری نے جسٹس مارکنڈے کاٹجو کی جانب سے ان کی رہائش گاہ پر منعقد پروقار 'گنگا جمنی عیدملن پروگرام و مشاعرہ میں بطور مہمان خصوصی اپنی تقریر میں کیا۔ پروگرام کی صدارت معروف نقاد و فکشن نگار سید محمد اشرف نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔ اس سے قبل جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے خیر مقدمی کلمات میں تمام مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے انھیں عید کی مبارک باد دی اور ہندوستان کی قدیم گنگا جمنی تہذیب، روایات، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، آپسی میل جول ومحبت، بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کا ذکر کرتے ہوئے اردو زبان اور اس کے وجد سے متعلق مختصر تاریخ بیان کی۔ اردو زبان کی چاشنی، اثر اور کشش کے بارے میں بتاتے ہوئے اسے عوامی زبان اور قومی یکجہتی و امن کی علامت قرار دیا۔ جسٹس کاٹجو نے اردو کی موجودہ صورتِ حال پر بھی روشنی ڈالی اور اردو کے فروغ، ترقی و ترویج پر خصوصی دھیان دینے اور سنجیدہ اقدامات کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ سید محمد اشرف نے اپنے صدارتی کلمات میں تمام معزز مہمان کا مختصر تعارف کرایا اور اردو غزل کی تعریف کی۔ انھوں نے اس طرح کی تقریبات کی اہمیت کا بھی ذکر کیا۔ اس موقعے پر جسٹس مارکنڈے کاٹجو کی اردو خدمت اور اردو کی وکالت کرنے پر معروف سماجی و علمی شخصیت آصف اعظمی و دیگر منتظمین کی جانب سے نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری کے ہاتھوں اعزاز کے طور پر ایک مومنٹو پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اگست 2012

تعلیم اور خواتین

نئی دھلی: ''دنیا بھر کے مسلم معاشروں میں خواتین کے تعلق سے پائے جانے والے عمومی منفی رویے کے پیش نظر یہ حقیقت حددرجہ توجہ طلب ہے کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک خواتین کو کس قدر احترام اور وقار حاصل تھا۔ اس زمانے میں خواتین تعلیم اور درس و تدریس کے شعبوں میں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک تھیں اور اسلامی علوم کے فروغ میں ان کا حصہ مردوں سے کسی بھی طرح کم نہیں تھا۔ ان خیالات کا اظہار یہاں آکسفورڈ یونیورسٹی، لندن کے سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز سے وابستہ ڈاکٹر محمد اکرم ندوی نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام توسیعی خطبے میں کیا۔ ڈاکٹر ندوی نے کہا کہ ان کی تحقیق کے مطابق محدثات کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار ہے جنھوں نے اس شعبہ علم میں اپنے علم وفضل کے نمایاں نقش قائم کیے ہیں۔ اس سے پہلے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر اختر الواسع نے مہمان مقرر کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر ندوی نے محدثات کا 53 جلدوں پر مشتمل تذکرہ مرتب کر کے تحقیق کا ایسا اعلا معیار قائم کیا ہے جس کی کوئی مثال فی زمانہ نظر نہیں آتی۔ جناب رضی الاسلام ندوی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ڈاکٹر ندوی نے موجودہ زمانے میں علم حدیث کو فروغ اور ایک نئی پیش رفت دینے کے لیے جو تحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

پریس نوٹ، ذہین اختر ندوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، 3 ستمبر 2012

اردو اکادمی جلد ہی قائم ہوگی

نئی دھلی: فروغ اردو زبان کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے لیے یہ خوش خبری ہے کہ بہت جلد اتراکھنڈ میں اردو اکادمی کا قیام کیا جائے گا۔ اس اکادمی کے قیام سے یقیناً اردو کے فروغ میں کافی مدد ملے گی۔ گزشتہ روز اردو پریس کلب (انٹرنیشنل) کے جنرل سکریٹری طارق فیضی نے اتراکھنڈ کے گورنر عزیز قریشی سے خصوصی ملاقات کی اور اردو کی ترقی اور اشاعت کے سلسلے میں تبادلہ خیال کیا۔ انقلاب کے نمائندہ سے بات کرتے ہوئے طارق فیضی نے بتایا کہ عزیز قریشی نے یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ بہت جلد اتراکھنڈ اردو اکادمی کا قیام عمل میں لائیں گے۔ مسٹر فیضی نے کہا کہ اس کے لیے انھوں نے کاغذی کارروائی بھی شروع کردی ہے۔ انھوں نے کہا کہ عزیز قریشی وہی ہیں جن کی کوششوں سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا قیام عمل میں لایا جاسکا تھا اور یہ اس کے بانیوں میں سے ہیں۔ طارق فیضی نے کہا کہ اسی طرح مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا قیام بھی عزیز قریشی کی کوششوں سے ہی عمل میں لایا جاسکا۔ انھوں نے کہا کہ عزیز قریشی نے اپنی گفتگو کے دوران کہا کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں دو کام کیے ہیں یا تو سیاست کی ہے یا پھر فروغ اردو کے لیے لڑائی لڑی ہے۔ طارق فیضی نے کہا کہ اردو پریس کلب کی گزارش پر عزیز قریشی نے راج بھون اتراکھنڈ میں اردو پریس کلب کے اشتراک سے اردو میلہ لگانے کی منظوری دے دی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اگست 2012

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام پر ڈاک ٹکٹ

نئی دھلی: آج اسٹین آڈیٹوریم انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر نئی دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام منعقد ایک تقریب میں وزیر مواصلات کپل سبل کے ہاتھوں ایک قومی نظریہ کے بانی اور مشترکہ قومیت کے علم بردار، دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث، جمعیۃ علماء ہند کے معمار شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام پر ڈاک ٹکٹ کی رسم اجرا عمل میں آئی، اس موقعے پر کپل سبل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمود مدنی نے کہا کہ یہ ہمارا دیرینہ مطالبہ رہا ہے کہ اکابر آزادی کی تاریخ کو زندہ کیا جائے اور اس کو داخل نصاب کر کے نئی نسل کو واقف کرایا جائے، اس سلسلے میں وعدے بھی ہوئے، لیکن یہ سعادت کپل سبل صاحب کو حاصل ہوئی، ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں اور شکریہ بھی ادا کرتے ہیں، انھوں نے کہا کہ جس فکر کو لے کر شیخ الہند مولانا محمود حسن 'دیوبند کے شاگرد مولانا حسین احمد مدنیؒ کھڑے ہوئے اہل علم اور تاریخ دانوں کو معلوم ہے کہ انھوں نے کن حالات میں قرآن وحدیث کی روشنی میں دو قومی نظریہ کی مخالفت کی۔

روزنامہ 'اردو ایکشن' بھوپال، 30 اگست 2012

اتر پردیش:

حقوقِ نسواں اور اردو زبان کی جاذبیت

خیرآباد: زبان ہمارے خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔اس لیے ہمیں اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لیے علم سیکھنا چاہیے۔ان خیالات کا اظہار قصبہ میں روشنی سیوا گرام ادیوگ سنستھان کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار بعنوان حقوق نسواں

اور اردو زبان کی افادیت سے خطاب کرتے ہوئے سی ڈی او شاہد منظر عباس رضوی نے کیا۔انھوں نے کہا کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے کائنات کو انسانیت کی تعلیم دی۔سیمینار سے مرکزی خواتین کمیشن کی رکن ثمینہ شفیق نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ اردو تعلیم کی بات کرتے ہیں مگر مسلم معاشرہ سے اردو تعلیم برائے نام ہوتی جارہی ہے۔مسلم معاشرہ اپنے بچوں کو مدارس میں پڑھانے کے بجائے دیگر اداروں میں اپنے بچوں کو پڑھا رہے ہیں۔آج حکومت ایسی ایسی اسکیمیں چلا رہی ہے جس کی جانکاری لوگ نہیں رکھتے۔اقلیتی کمیشن کی جانب سے کئی اسکیمیں ایسی چل رہی ہیں جن سے مسلمان کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔مولانا عاصم اقبال نے کہا کہ تعلیم سے انسانیت کی تعمیر ہوتی ہے جس کسی نے تعلیم کو مضبوط کیا اس نے اپنی کامیابی کو پالیا۔قرآن پاک ایسی کتاب ہے جسے تمام کتابوں پر افضلیت حاصل ہے۔قرآن پاک جب نازل ہوا تو سب سے پہلے تعلیم کی بات کہی۔لیکچرار کمال اختر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ ادب کی زبان ہے۔تہذیب کی زبان ہے۔مدارس اسلامیہ اردو زبان کے گہوارہ رہے ہیں۔سیمینار میں محمد عاصم حسین صدیقی، مفتی بہاؤالدین قاسمی، راشد علی، مولانا انیس قاسمی، حاجی محمد حنیف انصاری چیئرمین نگر پالیکا خیرآباد، ماسٹر فروز عالم، محمد رضوان، قاری محمد اعظم، زین العابدین انصاری وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔سیمینار کی صدارت مست حفیظ رحمانی نے جب کہ نظامت مولانا محمد اطہر قاسمی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' 16 جولائی 2012

شیلا دیکشت کو جامعہ اردو کا ایوارڈ

نئی دھلی: دہلی سکریٹریٹ میں دہلی کی وزیراعلیٰ محترمہ شیلا دکشت کو دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر ایچ خان نے جامعہ اردو علی گڑھ کی جانب سے سپاس نامہ اور مومنٹو دہلی کی سکریٹریٹ میں ان کے دفتر میں پیش کیا۔قابل ذکر ہے کہ جامعہ اردو علی گڑھ کی جانب سے باوقار 'ڈکتور ادب' 2012 ڈی لٹ (D.Litt.) ایوارڈ سے وزیراعلیٰ محترمہ شیلا دکشت کو اقلیتوں کی مسیحا اور اردو زبان کی بہی خواہ ہونے کے اعتراف میں انھیں نوازا گیا ہے۔واضح ہو کہ گزشتہ ہفتہ جامعہ اردو علی گڑھ میں 'مدرسہ تعلیم اور اردو کو روزگار سے جوڑنے کے امکانات' کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں وزیراعلیٰ کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا لیکن ان کی طبیعت ناساز ہونے کے سبب وہ اس سیمینار میں شرکت نہیں کرسکی تھی۔سیمینار میں صفدر ایچ خان نے بطور مہمان اعزازی شرکت کرتے ہوئے وزیراعلیٰ دہلی کی نمائندگی کی تھی۔اس موقعے پر وزیراعلیٰ محترمہ شیلا دکشت کو صفدر ایچ خان نے جب جامعہ اردو علی گڑھ کی جانب سے پیش کردہ سپاس نامہ پیش کیا تو انھوں نے اردو میں تحریر کردہ سپاس نامہ کی تحریر کو پڑھ کر سنائے جانے کی خواہش کی اور بعد ازاں خوشی کا اظہار کیا اور مبارکباد پیش کی۔سپاس نامہ میں محترمہ شیلا دکشت کی جانب سے دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے اور بیشتر اداروں اور دفاتر کے دروازوں پر اردو زبان میں ناموں کی تختیاں آویزاں کیے جانے کی کوششوں کو قابل ستائش بتایا گیا ہے۔اس موقعے پر دہلی اقلیتی کمیشن کے اردو افسر ذیشان احمد اور دہلی سرکار کے وزیر خوراک و رسد توانائی ہارون یوسف، وزیر پی ڈبلیو ڈی، لینڈ اینڈ بلڈنگ، راج کار چوہان، وزیر تعلیم، سماجی فلاح و بہبود، پروفیسر کرن والیا اور وزیر مالیات شہری ترقی اروند سنگھ لولی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 ستمبر 2012

'لوک بیانیہ' کے عنوان پر سیمینار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سینٹر فار کمپریٹو اسٹڈی آف انڈین لینگویجز اینڈ کلچر کے زیر اہتمام 'لوک بیانیہ' کے عنوان سے سہ روزہ نیشنل سیمینار کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ لوک بیانیہ قدیم ہندوستانی تہذیب و شناخت کا اہم حصہ ہے جس کو محفوظ کیے جانے اور نئی نسل کو اس سے واقف کرائے جانے کی سخت ضرورت ہے۔انھوں نے لوک بیانیہ کے موضوع پر سیمینار کے انعقاد کے لیے شعبہ کے سربراہ پروفیسر اے آر فتیحی کی کوشش کو سراہتے ہوئے بچپن میں سنی ہوئی لوک کہانیوں کی یادیں تازہ کیں۔اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ فوک لٹریچر قدیم ہندوستانی تہذیب کا سرمایہ ہے جس میں ہمیں مساوات، انسانی اخوت، مدح اور انسان دوستی کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں اس کے علاوہ شاعری پر بھی فوک لٹریچر کے اثرات ملتے ہیں۔ممتاز افسانہ نگار پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ مادیت اور سائنس کے اس دور میں بے پناہ ترقی کے باوجود روح کی تازگی اور باطن کی پاکیزگی کا فقدان ہے جس کی وجہ اپنے کلچر اور ثقافتی اقدار سے دور ہونا ہے۔انھوں نے لوک ادب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ داستان ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ نئے ادب میں تحلیل ہوگئی ہے اور لوک بیانیہ قدیم روایت ہونے کے ساتھ ساتھ آفاقی پہلو بھی رکھتا ہے۔نورس جاٹ آفریدی نے لوک بیانیہ کی تاریخی اہمیت بیان کی، ڈاکٹر مدیح الرحمٰن نے داستان گوئی کے موجودہ زوال اور اس کے ماضی پر روشنی ڈالی۔ان کی ہدایت میں امجد حسین نے داستان قصہ چہار درویش کے ایک اقتباس کی ڈرامائی پیش کش سے سامعین کے دلوں کو موہ لیا۔پروفیسر اے آر فتیحی نے موضوع کے تعارف کے ساتھ ہی حاضرین کا خیرمقدم کیا۔ڈاکٹر نوید انجم نے اظہارِ تشکر جب کہ نظامت ڈاکٹر ایچ اے زرگر نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 ستمبر 2012

ہندوستانیہ عدلیہ اور سیکولرزم پر سیمینار

علی گڑھ: ہندوستان کے آئین میں لفظ سیکولرزم گو کہ 1976 میں شامل کیا گیا لیکن آئین کی ساخت اور آرٹیکل 25 اور 30 کی موجودگی روز اول سے اس کے سیکولر مزاج کی نہ صرف نشاندہی کررہے تھے بلکہ باضابطہ اعلان بھی کررہے تھے۔ان خیالات کا اظہار ایس ایم اے کاظمی، صدر یونائیٹڈ مسلم آرگنائزیشن (یو ایم او) نے سرسید اوربنیس فورم کے ذریعے منعقدہ سمپوزیم، 'ہندوستانی عدلیہ اور سیکولرزم' موضوع پر بولتے ہوئے عیدملن میں کیا۔انھوں نے کہا کہ عید کا تہوار صحیح معنوں میں اسلامی تہذیب کا آئینہ دار ہے کیونکہ اس مذہب کی بنیاد اخوت اور بھائی چارہ ہے اور یہ تہوار اس کو فروغ دیتا ہے۔انھوں نے یو ایم او کے اغراض و مقاصد پر بھی اظہارِ خیال کیا۔سرسید اوربنیس فورم کے صدر ڈاکٹر شکیل صمدانی نے کہا کہ فورم کا قیام سرسید کی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے کے لیے کیا گیا ہے تاکہ ملک کے عوام سرسید کے افکار و خیالات کو سمجھ سکیں اور انھیں معلوم ہوسکے کہ انیسویں صدی کا عظیم دانشور

اور ماہر تعلیم اکیسویں صدی میں بھی اتنا ہی اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ چیف جسٹس کپاڈیہ کے مشورے کو جج صاحبان کو قبول کرنا چاہیے اور قانون کی کتاب میں جولکھا ہوا ہے صرف اسی کی تشریح کرنا چاہیے۔ انھوں نے موجودہ وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ وہ یونیورسٹی کو صحیح نہج پر لے جارہے ہیں اور سرسید کے تعلیمی خواب کو پورا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج اندر پریت سنگھ جوش نے کہا کہ دو دن قبل ہندوستان کی عدالتوں نے ایسے فیصلے دیے ہیں جو نہ صرف انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں بلکہ سیکولرزم کو بھی مضبوط کرتے ہیں۔ آگرہ سے آئے ہوئے سینئر ایڈوکیٹ شمیم بیگ نے کہا کہ سرسید اویرنیس فورم کے ذریعے سمپوزیم اور عیدملن کا انعقاد اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ فورم اپنے اغراض و مقاصد کو بخوبی انجام دے رہا ہے۔ پروترام کے کنوینر جرار رضوی نے کہا کہ سیکولرزم سے بہتر کوئی بھی سیاسی نظریہ ہندوستان کے لیے موضوع نہیں ہے اور اس نظریہ کو سیاسی سطح پر جتنا فروغ دیا جائے گا ملک کے لیے وہ اتنا ہی فائدہ مند ثابت ہوگا۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے حاجی ضمیراللہ خاں ایم ایل اے نے کہا کہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ہمیں مختلف مذاہب کے ماننے والے گورنر، وزیراعلیٰ، وزیراعظم اور صدور ملتے رہے ہیں کہ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ملک میں سیکولرزم کی جڑیں کافی مضبوط ہوچکی ہیں۔ اس موقعے پر احسان حسین اے سی جے ایم نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ صمدانی نے نعت اور سارا صمدانی نے انگریزی میں اسٹوری پیش کی۔ فورم کے سکریٹری منصور الٰہی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں ملی اور سماجی شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 5 ستمبر 2012

گوشۂ شرون کمار ورما

میرٹھ: آج یہاں چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی حفیظ میرٹھی میموریل لائبریری میں 'گوشۂ شرون کمار ورما' کا افتتاح عمل میں آیا۔ واضح ہو کہ معروف افسانہ نگار جناب شرون کمار ورما نے اپنی ذاتی لائبریری سے شعبۂ اردو کو تقریباً 500 بیش قیمتی کتب پیش کی ہیں۔ محترم شرون کمار ورما کی علالت کے سبب ان کے عزیز دوست محترم سدرشن کپور (سینئر وکیل، امرتسر) مہمان خصوصی اور پروفیسر جے کے پنڈیر (پرووائس چانسلر، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) نے 'گوشۂ شرون کمار ورما

کا' فیتہ کاٹ کر افتتاح فرمایا۔ پروگرام کی صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، نظامت ڈاکٹر آصف علی، استقبالیہ ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریے کی رسم سمیع اللہ علائی نے انجام دی۔ بعد ازاں معزز مہمانان نے مل کر شمع روشن کی۔ محترم سلیم سیفی، محترم ذیشان خان اور ڈاکٹر نشاں زیدی نے مہمانوں کو گل پیش کیے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی محترم سدرشن کپور نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ میرے عزیز ترین دوست جناب شرون کمار ورما صاحب جو خود ایک نامور افسانہ نگار ہیں ان کی کتابیں صحیح مقام پر پہنچ گئی ہیں۔ ان کا نام زندہ رہے۔ پروفیسر جے کے پنڈیر نے یونیورسٹی کی جانب سے محترم شرون کمار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ تحفہ شعبہ اور یونیورسٹی دونوں کے لیے بیش قیمت تحفہ ہے اور کتابیں ہی انسان کی سچی دوست ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے محترم شرون کمار اور سدرشن کپور کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ شرون کمار ورما نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا تھا اور ان کی غزلیں معروف رسائل وجرائد میں عرصے تک شائع بھی ہوتی رہیں لیکن انھیں شہرت ان کے افسانوں نے بخشی اس موقعے پر پٹنہ سے تشریف لائے محترم شاہد جمال نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 ستمبر 2012

ٹی سی ایس کا اردو خواندگی سافٹ ویئر

لکھنؤ: بین الاقوامی یوم خواندگی کے موقعے پر ٹاٹا کنسلٹنسی سروسیز (ٹی سی ایس) نے جمعہ کو یہاں ایک اردو خواندگی کی کمپیوٹر سافٹ ویئر لانچ کیا، جس کی مدد سے 40 گھنٹے میں اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھا جاسکتا ہے۔ یہ سافٹ ویئر تعلیم بالغاں کے لیے تیار کیا گیا ہے، جسے کمپیوٹر پر آسانی سے چلایا جاسکتا ہے اور اردو سیکھنے کے خواہش مند افراد کو قلیل مدت میں اردو سکھائی جاسکتی ہے۔ یہ سافٹ ویئر کمپنی کے سماجی ذمے داری منصوبہ کے تحت تعلیم بالغاں کا کورس چلانے والوں کو مفت میں فراہم کیا جارہا ہے اور اس کو چلانے کی ٹریننگ بھی مفت فراہم کی جائے گی۔ ٹی سی ایس کے علاقائی سربراہ اور پرنسپل کنسلٹنٹ جینت کرشنا اور ادارہ کے کارپوریٹ سوشل رسپانسبلیٹی شعبہ کی سربراہ ڈاکٹر جوائے دیشکھ نے بتایا کہ کمپیوٹر پر مبنی فنکشنل لٹریسی کا سافٹ ویئر (سی بی ایف ایل) اردو سمیت 9 ہندوستانی زبانوں میں دستیاب ہے۔ اس سافٹ ویئر کو چلانے کے لیے پہلے سے کمپیوٹر کا علم ہونا ضروری نہیں ہے اور نہ کمپیوٹر میں اس سافٹ ویئر کو چلانے کے لیے کسی دوسرے سافٹ ویئر کی ضرورت ہے۔ ایک دن کی ٹریننگ سے اردو سافٹ ویئر کو چلایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ سی بی ایف ایل کا اردو سافٹ ویئر آندھراپردیش اور جھارکھنڈ میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جارہا ہے جسے اب اتر پردیش میں لانچ کیا گیا ہے۔ سافٹ ویئر کے سلسلے میں معلومات دیتے ہوئے انس خاں نے بتایا کہ طالب علم کو گرافکس، اینی میشن اور آڈیو کے ذریعے اردو کے تمام حروف اور پھر انھیں جوڑنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ابتدائی حساب بھی سکھایا جاتا ہے۔ ایک مدرس سافٹ ویئر کو استعمال کرکے غیر اردو داں یا ناخواندہ افراد کے لیے زبان سیکھنے کے عمل کو آسان بنا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ روایتی طریقہ سے اردو سیکھنے میں 200 سے 300 گھنٹے لگتے ہیں۔ ٹی سی ایس کے ذمہ داروں نے بتایا کہ ہندوستانی زبانوں کے بعد اب عربی اور اسپینی کے لیے بھی سافٹ ویئر تیار کیا جارہا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 ستمبر 2012

اترا کھنڈ:

فروغِ اردو کے لیے پیش قدمی

دھرہ دون: اترا کھنڈ حکومت نے عید کے موقعے پر ریاست میں اقلیتوں کے مفاد کے لیے اقلیتی ترقیاتی فنڈ کی تشکیل، یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم کا انتظام، مدارس میں 'سروشکشا ابھیان' کے تحت سہولیات فراہم کرانے کے ساتھ ہی دیگر کئی اہم اقدامات کیے ہیں۔ اترکھنڈ کے وزیراعلیٰ وجے بہوگنا نے اقلیتوں کے لیے کئی رعایتوں کا اعلان کیا جس میں کلیر شریف کی ترقی، غریب کنبوں کی 12 ویں پاس لڑکیوں کے لیے رعایتیں، بے روزگاروں کے لیے سبسڈی، اردو کی ترقی اور اقلیتی ترقیاتی فنڈ کا قیام شامل ہے۔ عید کے موقعے پر ریاست کے لوگوں کو مبارکباد دیتے ہوئے مسٹر بہوگنا نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ اس تہوار کی روح کے مدنظر جس میں محروم لوگوں کے تئیں فراخ دلی برتی جاتی ہے ان کی حکومت نے اقلیتی فرقے کے لوگوں میں تعلیم اور روزگار کو فروغ دینے کے اقدام کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ ان کی مجموعی ترقی ہو۔ وزیراعلیٰ نے کہا کہ ضلع روڑکی، کلیر میں حج ہاؤس کی تعمیر

کے لیے 4 کروڑ روپے منظور کیے گئے ہیں اور کلیئر کی درگاہ کی اجمیر شریف کی طرز پر ترقی دی جائے گی۔ اقلیتوں خاص کر دور دراز میں رہنے والے اقلیتوں کے مفادات کے لیے 25 کروڑ روپے سے اقلیتی ترقیاتی فنڈ کی تشکیل کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتوں کے لیے جلد ہی سیلف امپلائمنٹ منصوبہ شروع کیا جائے گا جس کے تحت انھیں 2.25 فیصد سبسڈی دی جائے گی، اس کے ساتھ چھٹے کلاس کے لیے اردو ٹیچروں کی تقرری کی جائے گی اور ڈگری کالجوں میں اردو کو فروغ دینے کا نظم کیا جائے گا۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی 19 اگست 2012

اردو اکادمی کے لیے اعلیٰ سطحی کمیٹی

نئی دهلی: اتراکھنڈ کے وزیر اعلیٰ وجے بہوگنا نے ریاست میں اردو اکادمی قائم کرنے کی سمت میں اہم فیصلہ کرتے ہوئے دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع کی صدارت میں ایک اعلیٰ سطح کی 8 رکنی کمیٹی قائم کی ہے۔ چیف کمشنر ایس کے بھٹ اس کمیٹی کے کنوینر ہوں گے۔ یہ کمیٹی دو مہینے میں وزیر اعلیٰ کو اردو اکادمی کا خاکہ اور دیگر بنیادی ضروریات سے متعلق اپنی تجویز پیش کرے گی۔ یہ کمیٹی دہلی اور اتر پردیش سمیت کئی اہم اردو اکادمیوں کا جائزہ بھی لے گی۔ ممبر اسمبلی فرقان احمد، سربت کریم انصاری، بہاء اللہ خان، سینئر وکیل محمد رؤف رب، رضی بیگ اور ماہر اردو ڈاکٹر فاروق کو کمیٹی کے اراکین میں شامل کیا گیا۔ مسٹر بہوگنا نے کہا کہ سرکار اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے عہد بند ہے اور اردو اکادمی قائم کرنا اس سمت میں ایک مضبوط قدم ہوگا۔ پروفیسر اختر الواسع نے اتراکھنڈ میں اردو اکادمی قائم کرنے کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اس سے دیو بھومی کی گنگا جمنی تہذیب مزید مضبوط ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اتر پردیش میں اردو اکادمی کا قیام بھی مسٹر بہوگنا کے والد اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ ہیموتی نندن کی کوششوں سے ممکن ہوسکا تھا۔

روز نامہ 'خبر جدید' دہلی، 2 ستمبر 2012

بهار:

سبھی پرائمری اسکولوں میں ہوگی اردو کی پڑھائی

پٹنه: ریاست میں تعلیم کے فروغ پر حکومت 20 ہزار کروڑ روپے خرچ کرے گی جو ریاست کے منصوبہ کا 22 سے 23 فیصد ہوگا۔ بہار کو 2020 تک ترقی یافتہ ریاست بنانے کی سمت میں اہم کوشش ہوگی۔ سبھی پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کو یقینی بنایا جائے گا۔ ریاست کے تمام اسکولوں میں اردو اساتذہ کے تقرر کو یقینی بنایا جارہا ہے اور 23 ہزار اردو اساتذہ کے عہدے کی تشکیل کی گئی ہے۔ حکومت نے تعلیم کو سب سے زیادہ اولیت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے محکمہ تعلیم کی جانب سے منعقد یوم اساتذہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں۔ وزیر اعلیٰ نے اس سے قبل 6 اساتذہ کو سرکاری اعزاز سے نوازا۔ ان میں پہلی مسلم لیڈی ٹیچر شگفتہ یاسمین شامل ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ حکومت مرحلہ وار طریقے سے ہر سال پنچایت سطح پر ایک ہزار اسکول کھولے گی۔ فی الحال ریاست میں 3 ہزار کے آس پاس اسکول ہیں۔ ان اسکولوں کے کھل جانے کے بعد حکومت کو سالانہ 3 ہزار کروڑ روپے اسکول چلانے اور اساتذہ کی تنخواہ پر خرچ کرنے ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے تمام اردو سبجیکٹ سے ٹی ای ٹی پاس امیدواروں کا تقرر یقینی بنانے کی ہدایت دی ہے۔ ضرورت پڑنے پر خصوصی لیاقت امتحان منعقد کرنے کو بھی کہا ہے جس سے ہر پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر کا تقرر ہوا۔ اس موقعے پر نائب وزیر اعلیٰ سشیل کمار مودی نے ہمہ جہت تعلیم مہم اور ثانوی تعلیمی مہم کے لیے مرکز سے مزید رقم بڑھائے جانے کی مانگ کی۔ انھوں نے کہا ہے مرکزی حکومت نے اتنے بڑے ملک میں ہمہ جہت تعلیم مہم میں 25 ہزار کروڑ روپے کے خرچ کی تجویز رکھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پرائمری تعلیم پر تقریباً 9 ہزار کروڑ روپے، ثانوی تعلیم پر 3 ہزار کروڑ اور اعلیٰ تعلیم پر تقریباً ڈھائی ہزار کروڑ روپے خرچ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہار پہلی ایسی اکلوتی ریاست ہے جس نے گزشتہ کچھ برسوں میں تقریباً ڈھائی لاکھ اساتذہ کو بحال کرکے ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' 7 ستمبر 2012

گجرات:

بڑودہ یونیورسٹی میں لکچر کا انعقاد

بڑوده: بڑودہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی، عربی و اردو کے زیر اہتمام 4 ستمبر 2012 کو مسلم ایجوکیشن سوسائٹی، بڑودہ کے صدر جناب سید واجد حسین صاحب کے زیر صدارت ایک اہم لکچر کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے اسپیکر کی حیثیت سے درج ذیل موضوع پر لکچر دیا 'عربی اور فارسی کے اثرات اردو ادب پر' مذکورہ لکچر کی تقریب کا آغاز پروفیسر وجیہ الدین، پروفیسر آف پرشین، کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ بعد ازاں، پروفیسر مقصود احمد، پروفیسر آف عربک، وصدر شعبۂ فارسی، عربی و اردو، نے پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا تعارف کرایا۔ پھر لکچر کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کے اختتام پر جناب یاسین شیخ، صدر یتیم خانہ، بڑودہ اور جناب منظور سالیری، صدر انجمن اسلام، بڑودہ نے اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد، مہمان شرف، جناب محمود خاں پٹھان اور مہمانِ خصوصی پروفیسر رتن ویاس، ڈین، فیکلٹی آف آرٹس، بڑودہ یونیورسٹی نے خطاب فرمایا۔ آخر میں جناب سید واجد حسین صاحب نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر وجیہ الدین نے اور کلماتِ تشکر ڈاکٹر انور ظہیر، ایسوسی ایٹ پروفیسر آف اردو نے پیش کیے۔

بذریعہ ڈاک، پروفیسر مقصود احمد، بڑودہ، 7 ستمبر 2012

مهاراشٹر:

شفیع دہلوی کا دورۂ مہاراشٹر

مالیگانوں: مسلمانوں کو مرکزی حکومت کی تعلیمی پالیسیوں سے استفادہ کرنے کے لیے بیدار ہوجانا چاہیے۔ چونکہ اس وقت کانگریس کی قیادت میں یو پی اے سرکار کے وزیر تعلیم کپل سبل کی نگرانی میں وزارت

تعلیم نے اقلیتوں کی تعلیمی خود کفالت و ترقی کے لیے متعدد انقلابی اقدامات کیے ہیں۔ ان کی جانکاری ہونی چاہیے اور دوسروں تک پہنچانی چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار وزارتِ فروغِ انسانی وسائل میں تعلیمی کمیٹی کے قومی نگران اور خصوصی میپنگ کمیٹی کے رکن شفیع دہلوی نے اپنے دورۂ مہاراشٹر کے دوران یہاں مالیگاؤں پہنچنے پر مالیگاؤں کے اقلیتی تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کے ذمہ داروں کی پُرہجوم میٹنگ میں کیا۔ انجمن معین الطلبا کے چیئرمین محمد اسحاق زری والا کی صدارت میں منعقد اس میٹنگ میں شفیع دہلوی نے تفصیل کے ساتھ مرکزی حکومت کی ہر اسکیم پر روشنی ڈالی اور کہا کہ مرکز سے ان اسکیموں کے تحت ہزار ہا کروڑ روپیہ جاری ہورہے ہیں۔ لیکن ہماری محرومی ہے کہ عدم جانکاری کے باعث ہم اس سے استفادہ نہیں کرپاتے۔ انھوں نے اس موقعے پر امید ہائی اسکول کے پرنسپل شیخ عبدالوہاب کو ضلع ناسک میں اپنا نمائندہ مقرر کیا اور کہا کہ آپ لوگ ان کے ذریعہ اپنی معلومات اور اپنے مشورے مجھ تک پہنچا سکتے ہیں تاکہ ہمیں اقلیتوں کی تعلیمی

ضروریات کی نشان دہی کرنے میں آسانی ہو سکے۔ انھوں نے ملک کے دیگر اضلاع میں اسی طرح اپنے نمائندے مقرر کرنے کا اعلان کیا تا کہ وہاں کی زمینی سچائی سے واقف ہو کر صحیح تجزیہ کرسکیں۔ شفیع دہلوی نے مالیگاؤں میں مدرسہ تجوید القرآن، مالیگاؤں ہائی اسکول، امید ہائی اسکول، سولس ہائی اسکول، تہذیب اردو ہائی اسکول، شیدا ہائی اسکول، کریسنٹ ہائی اسکول، علی میاں ندوی لائبریری اینڈ فاؤنڈیشن اور قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے تحت چل رہے اقلیتی تعلیمی اداروں کا دورہ کیا اور وہاں طلبا و اساتذہ سے تبادلہ خیال کیا۔ انھوں نے تہذیب ہائی اسکول میں خواتین و اساتذہ کے حق تعلیم کے موضوع پر منعقد ورکشاپ اور امید ہائی اسکول میں اسی موضوع پر منعقد ایک سیمینار کو خطاب کیا۔

پریس نوٹ، دہلی، شفیع دہلوی 4 ستمبر 2012

اعزاز و اکرام:

مناظر عاشق ہرگانوی

کولکاتہ: 147 کتابوں کے مصنف و مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (شعبۂ اردو، ٹی این پی یونیورسٹی، بھاگلپور) کو بچوں کے لیے ان کی کہانیوں کی کتاب 'جیسے کو تیسا' پر ساہتیہ اکادمی دہلی نے اپنے ادب اطفال ایوارڈ 2012 دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ ایوارڈ 50 ہزار روپے، میمنٹو، شال اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ بچوں کے لیے ڈاکٹر ہرگانوی کی ابھی تک 24 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں 12 ناول اور 8 کہانیوں کے مجموعے شامل ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے ادب اطفال کا یہ تیسرا ایوارڈ ہے جو ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو ملا ہے جسے آنے والے دنوں میں ایک پروقار تقریب میں نوازا جائے گا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' کولکاتہ، 31 اگست 2012

رسم اجرا:

'ساگوان کی چھاؤں میں'

بھساول: بزم سخن کے زیر اہتمام احمد کلیم فیض پوری کے اوّلین افسانوی مجموعہ 'ساگوان کی چھاؤں میں' کا اجرا عمل میں آیا۔ صدارت برصغیر کے معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق نے کی۔ ممتاز فکشن نگار شموئل احمد نے کتاب کا اجرا کیا۔ جب کہ زیڈ ہائی اسکول کی سابق پرنسپل ڈاکٹر زیب النسا شیخ نے شمع فروزی کی رسم انجام دی اس موقعے پر روزنامہ انقلاب (ممبئی) کے مدیر شاہد لطیف نے خصوصی طور پر شرکت کی۔ شموئل نے کہا احمد کلیم فیض پوری نے علامتوں کو اپنے افسانوں میں اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کی کہانی قافلہ سالار قوم کی موجودہ زبوں حالی کی سچی تصویر ہے۔ انھوں نے اسلوب نگارش کو سراہتے ہوئے احمد کلیم کے افسانوں سے کئی مثالیں پیش کیں۔ اس موقعے پر احسان رموپوری، رشید قاسمی، کریم سالار، مقامی رکن اسمبلی نیز صدر بلدیہ نے بھی اپنے خیالات سے نوازا۔ صدارتی خطبہ میں سلام بن رزاق نے کہا احمد کلیم کے افسانوں کی زبان بہت خوبصورت ہے۔ آرام گھر کو بہترین کہانی قرار دیتے ہوئے انتہا مت جاؤ اور کانچ کی دیوار جیسی عمدہ کہانیوں کا پرمغز تجزیہ پیش کیا۔ واضح رہے کہ افسانوں کا یہ مجموعہ شموئل احمد کے نام معنون کیا گیا ہے۔ حاجی انصار کے اظہار تشکر کے بعد یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

بذریعہ ڈاک، احمد کلیم فیض پوری، الٰہی پورہ، بھساول، 9 اگست 2012

ابن صفی پر تعارفی فولڈر

نئی دہلی: دفتر اردو بک ریویو میں منعقدہ ایک سادہ تقریب میں عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے اردو دنیا کے عظیم ادیب اور جاسوسی ناول نگار ابن صفی مرحوم کی شخصیت اور ادبی خدمات پر اردو بک ریویو کے زیر اہتمام 500 صفحات پر مشتمل ایک خاص نمبر کی عنقریب اشاعت سے قبل ابن صفی پر ایک تعارفی فولڈر جاری کیا۔ انھوں نے ایڈیٹر اردو بک ریویو کی کاوشوں کی ستائش کی اور کہا کہ اردو زبان و ادب سے محبت رکھنے والوں کے لیے ابن صفی کے مکمل حالات اور ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے ان کے تمام ناولوں کی جمع و تدوین کر کے منظر عام پر لانے کا جو کارنامہ محمد عارف اقبال نے انجام دیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے اردو داں عوام کی توجہ مرکوز کراتے ہوئے اردو بک ریویو کے ساتھ خصوصی تعاون کی اپیل کی ہے۔ ابن صفی پر تعارفی فولڈر کے اجرا کے موقع پر محمد ارشد سراج الدین مکی (نائب مدیر)، اعزاز حسن، ندیم عارف اور محمد عمران وغیرہ موجود تھے۔ اس موقع پر اردو بک ریویو کے مدیر محمد عارف اقبال نے ابن صفی مرحوم کے ادبی کارنامے کا مختصر تعارف کراتے ہوئے ان کی شخصیت اور ادبی خدمات پر عنقریب شائع ہونے والے خاص شمارے کا تعارف کرایا۔

پریس ریلیز، محمد عمران، نئی دہلی، 1 ستمبر 2012

خواب پتھر ہو گئے

لکھنؤ: "منیش شکلا کی شاعری ہماری زندگی کی بے سمتی کے گرد و پیش میں بکھری ہوئی ناہمواریوں کی شاعری ہے۔ ان خیالات کا اظہار اتر پردیش اردو اکادمی کے سابق صدر اور مشہور شاعر و ادیب پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے جدید شاعر منیش شکلا کے شعری مجموعے 'خواب پتھر ہو گئے' کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے کیا۔ سنگیت ناٹک اکادمی گومتی نگر میں 'لوح و قلم' کی جانب سے منعقدہ تقریب میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر اور ممتاز ترقی پسند نقاد پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ منیش شکلا غزل کے بہت اچھے شاعر ہیں ان کی شاعری میں ایک نئی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر فضل امام رضوی نے کہا کہ ہر دور میں غزل 'بت ہزار شیوا' بنی رہی ہے آج بھی غزل کا جادو جاگ رہا ہے۔ گوپال چترویدی نے کہا کہ ہندی غزل نے دشینت کمار کے بعد کافی ترقی کی ہے اور اس کی ایک مثال منیش شکلا کا نیا غزل کا مجموعہ 'خواب پتھر ہو گئے' ہے۔ افسانہ نگار و صحافی احمد ابراہیم علوی، شاعر و افسانہ نگار فیاض رفعت، دور درشن کے سابق ڈاکٹر ولایت جعفری، ماہنامہ نیا دور کے سابق ایڈیٹر اور شاہنواز قریشی، کھن کھن جی گرلز پی جی کالج کے شعبۂ اردو کی صدر ڈاکٹر ریشماں پروین، حسین آباد گورنمنٹ کالج کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے بھی منیش شکلا کے کلام کی ستائش کی۔ چندولی کے ڈی، ایم اور ہندی کے ادیب پون کمار (IAS) نے کہا کہ شاعری کی دنیا میں منیش کی آمد چونکا دینے والی ہے ان کی شاعری روایتی اور جدید موضوعات کا خوبصورت سنگم ہے۔ اس پروقار ادبی تقریب کے اختتام پر منیش شکلا نے سامعین کی فرمائش پر اپنا کلام سنایا اور زبردست داد حاصل کی۔ لوح و قلم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 4 ستمبر 2012

ٹھنڈی ہوا

نئی دہلی: چھند سمراٹ گولڈ میڈلسٹ اردو اکادمی سے ایوارڈ یافتہ پروفیسر گرونرائن سنگھ 'غافل دہلوی' کے یوم پیدائش پر ادبی سنگم انٹرنیشنل کے زیر اہتمام پدم نگر سرائے روہیلہ میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر غافل دہلوی کا شعری مجموعہ 'ٹھنڈی ہوا' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس کے بعد درد دہلوی، منور سرحدی، نور العین قیصر قاسمی نے بھی مقالات پیش کیے۔ تبصرہ کرتے ہوئے درد دہلوی نے کہا کہ پروفیسر گرونرائن سنگھ غافل دہلوی کی کاوش 'ٹھنڈی ہوا' اگرچہ دیوناگری رسم الخط میں ہے لیکن اردو الفاظ کو جس طرح استعمال کیا ہے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہندی رسم الخط میں ہے۔ انھوں نے یہ پیغام دیا کہ آپ کی شخصیت تہذیبی

وراثت کا آئینہ دار ہے۔ بعد ازاں مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس کی صدارت پروفیسر نرائن سنگھ نے کی جب کہ نظامت کے فرائض راغب لکرالوی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 4 ستمبر 2012

بکھرے رنگوں کی خوشبو

نئی دهلی: انور نزہت کا سوانحی ناول 'بکھرے رنگوں کی خوشبو' آزادی سے قبل کے سماجی احوال، خصوصاً مسلم معاشرے کے مسائل کا بھی عکاس ہے اور آزاد ہندوستان کی خواتین کی زندگی کی نفسیات اور ان پیچیدگیوں سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی اسے پڑھ کر امریکہ اور دیگر ملکوں میں تارکین وطن کی پریشانیوں کے بارے میں بھی واقفیت ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر مظفر حنفی نے 'بکھرے رنگوں کی خوشبو' کی رونمائی کے لیے منعقد جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کیا جس کا انعقاد بزم ہم قلم کی جانب سے کیا گیا تھا۔ معروف افسانہ نگار انور نزہت کی مذکورہ سرگزشت کا اجرا پروفیسر مظفر حنفی اور پروفیسر اختر الواسع نے مشترکہ طور پر کیا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے انور نزہت کے سوانحی ناول کو ایک معصوم شخصیت اور بے چین روح کی آپ بیتی قرار دیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ 'بکھرے رنگوں کی خوشبو' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس نے پہلے خواب دیکھے، خوابوں کو بکھرتے دیکھا اور پھر ان کی کرچیوں کو پلکوں پر سجایا۔ اس موقعے پر پروفیسر صغریٰ مہدی، پروفیسر خالد محمود، نگار عظیم، شمع افروز زیدی، نعیمہ جعفری، کے پاشا اور ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے بھی انور نزہت کی ناول نگاری پر گفتگو کی۔ جبکہ معین شاداب نے شکریے کی رسم انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 ستمبر 2012

ڈاکٹر محبوب راہی کی چار کتابیں

بلڈانہ: سحر غزل اکادمی (بلڈانہ)، ہندو مسلم ایکتا منچ (بلڈانہ)، سیلانی ٹرسٹ (بلڈانہ اور شاہد انجمن اردو ادب اکولہ ان چاروں ادبی و ثقافتی انجمنوں کے زیر اہتمام حال ہی میں شہر بلڈانہ میں کثیر التصانیف قلم کار ڈاکٹر محبوب راہی صاحب کی حال ہی میں اشاعت پذیر بیک وقت چار کتابوں (1) آرائش جمال (2) اردو کا سفر-دیر سے حرم تک (3) تاویلات وتمثیلات اور (4) ترجیحات و توجیحات کے اجرا کے سلسلے میں ایک دوپہر ڈاکٹر محبوب راہی کے ساتھ عنوان کے تحت ایک عظیم الشان مشاعرہ کا

انعقاد عمل میں آیا۔ ڈاکٹر گنیش گائیکواڑ (آغاز بلڈانوی) کی زیر سرپرستی ان کے والد آنجہانی جیارام گائیکواڑ کے نام سے منسوب ثقافتی ہل میں سیلانی ٹرسٹ کے صدر عالی جناب عبدالصمد صاحب کے زیر صدارت یہ پروگرام منعقد کیا گیا۔ ڈاکٹر عظیم راہی (اورنگ آباد)، ڈاکٹر محمد ذاکر نعمانی (اکولہ)، ڈاکٹر مدھوسدن ساوڑے، ہارون سر اور آصف بھائی کارپوریٹر بحیثیت مہمان خصوصی شریک رہے۔ کتابوں کا اجرا بالترتیب عبدالصمد صاحب، ڈاکٹر عظیم راہی، جمشید سیٹھ صاحب اور ساجد محشر کے ہاتھوں عمل میں آیا اولاً ڈاکٹر محبوب راہی کی چاروں کتابوں کی روشنی میں ان کے وسیع تر تخلیقی کارناموں پر ڈاکٹر عظیم راہی، ڈاکٹر محمد ذاکر نعمانی اور ڈاکٹر گنیش گائیکواڑ نے اظہار خیال فرمایا۔ تینوں حضرات نے بالخصوص راہی صاحب کے گزشتہ دنوں قلب وچشم کے شدید عوارض میں مبتلا ہونے نیز موصوف کی دائیں آنکھ کی بینائی سے محروم ہوجانے کے باوجود ان چاروں کتابوں کی اشاعت کو ان کے ایک تاریخ ساز کارنامے سے تعبیر کیا۔

بذریعہ ڈاک، ذاکر نعمانی، اکولہ، مدھیہ پردیش ستمبر 2012

علم جنین اور آیات قرآنی

علی گڑھ: امریکہ کے ممتاز سرجن ڈاکٹر احمد مطیع صدیقی کی کتاب 'علم جنین اور آیات قرآنی' کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے اجرا کرتے ہوئے کہا کہ قرآن کریم کی مبارک آیات اور علم جنین سے متعلق یہ کتاب اردو داں طبقہ کی توجہ کا مرکز بنے گی اور قارئین کے لیے باعث دلچسپی ثابت ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ وہ ملٹری سائنس کے طالب علم رہے ہیں مگر رحم مادر میں پلنے والے بچے سے متعلق قرآن میں جو تشریح کی گئی ہے اس کو ایک ممتاز طبی سائنس داں نے اپنے وسیع تجربے کی بنیاد پر موضوع بنایا ہے جس کے لیے فاضل مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں اور وہ دل کی گہرائیوں سے ڈاکٹر صدیقی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اکیڈمک اسٹاف کالج میں منعقدہ رسم اجرا کی اس تقریب میں فاضل مصنف کے بڑے بھائی اور شعبۂ کیمیا کے سابق سربراہ پروفیسر فصیح احمد صدیقی نے کتاب کی پہلی جلد وائس چانسلر کو پیش کی۔ علم جنین اور آیات قرآنی پر ڈاکٹر احمد مطیع صدیقی کی یہ کتاب ان کے میڈیکل سائنس کے 30 سالہ تجربہ کا نتیجہ اور اس موضوع سے ان کی دلچسپی کا ثمرہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے انسان کی تخلیق کے سلسلے میں ان قرآنی آیات کی سائنس اور موجودہ انکشافات دریافت سے تائید پیش کی ہے جن میں رحم مادر میں انسانی جنین کی نشو ونما کے مراحل بیان کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی موضوع کے مختلف پہلوؤں کی باتصویر تشریح اور وضاحت بھی کی گئی ہے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد کے بانی وائس چانسلر اور ممتاز سائنس داں پروفیسر شمیم جے راجپوری نے کہا کہ موضوع کے اعتبار سے یہ ایک اہم کتاب ہے اور ڈاکٹر صدیقی نے اردو میں یہ کتاب لکھ کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

روزنامہ 'نادیہ ٹائمز'، 6 ستمبر 2012

میخانہ اردو کا پیر مغاں: نارنگ ساقی

نئی دهلی: ساہتیہ اکادمی کے رابندر بھون میں 5 ستمبر کی شام عالمی سطح کے معروف و ہر دل عزیز ادیب کرشن لال نارنگ ساقی کی کتاب 'میخانہ اردو کا پیر مغاں: نارنگ ساقی' کا اجرا عمل میں آیا۔ حلقہ ارباب ذوق وایم آر پبلی کیشنز کی جانب سے منعقدہ ایک پروقار تقریب میں معروف ادیب نذیر فتح پوری (پونے) کی مرتب کردہ اس کتاب کا اجرا عالمی شہرت یافتہ ادیب، نقاد ومحقق پروفیسر گوپی چند نارنگ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی، معروف ادیب نند کشور وکرم، معروف افسانہ نگار رتن سنگھ اور چندر بھان خیال نے کیا۔ اس موقعے پر مشہور شاعر متین امروہوی نے رنگیلا ساقی کے عنوان سے نظم پیش کر کے نارنگ ساقی کو منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا جب کہ چندر بھان خیال نے بھی نارنگ ساقی کی ادبی خدمات اور خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت میکش امروہوی نے کی۔ اس موقعے پر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ ادب ایک طرح کی دیوانگی ہے۔ آرٹ، ادب وشاعری کی دنیا میں سب سے پہلی اور بنیادی چیز خلوص ہے اور اگر یہ خلوص نہیں تو کسی بھی تحریر میں تاثیر نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے کہا یہی خلوص نارنگ ساقی میں پایا جاتا ہے جنھوں نے بے لوث، بے غرض اور بے نیاز ہو کر ادبا وشعرا کی مہمان نوازی کی ان کی صحبت اختیار کی اور خود کو ہمیشہ حاشیہ پر رکھا اور اسی خلوص سے ادبا و شعرا کے لطیفے اکٹھا کر کے ایک بڑا کام انجام دیا اور خود ادیبوں کی فہرست میں شامل ہوگئے۔ اس موقعے پر نند کشور

وکرم، شاہد ماہلی، نذیر فتح پوری اور ڈاکٹر مشتاق صدف نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ آخر میں کتاب کے مصنف کرشن لال نارنگ ساقی نے تمام مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر انجم عثمانی، پروفیسر سید منظور احمد، پروفیسر عظیم اختر، نرمل سنگھ نرمل، ڈاکٹر عقیل احمد، ضیاء الرحمٰن غوثی، اقبال انصاری، معروف شاعر وقار مانوی، ظفر مرادآبادی اور ڈاکٹر رضا حیدر سمیت بڑی تعداد میں ادبی و شعری شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 6 ستمبر 2012

دو کتابوں کا اجرا

بھوپال: کوثر چاند پوری کلچرل فورم کے زیرِ اہتمام اقبال لائبریری کے ہال میں سینئر ادیب و شاعر عزیز اندوری کی زیرِ صدارت منعقدہ تقریب میں دو کتابوں کا اجرا ہوا اور مدعو نظم گو شعرا نے اپنی تخلیقات پیش کیں، تقریب میں اردو کے معتبر ادیب و ناقد پروفیسر عتیق اللہ اور آکاشوانی اندور کے سابق ڈائرکٹر عزیز انصاری نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ سید انور حسین انور کی تحریر کتاب 'اقبال اور انور شیخ' کی رونمائی کے بعد مصنف کا تعارف کراتے ہوئے اقبال مسعود نے بتایا کہ علامہ اقبال کے بارے میں انور شیخ کی ذہنی پراگندگی جو مضامین کی صورت میں منظرِ عام پر آئی اس کے جواب میں یہ کتاب انور حسین انور نے تحریر کی اور حق گوئی کے اظہار میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیا، ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے اس کتاب کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا انور حسین نے یہ بڑا کام کیا ہے جو فرضِ کفایہ کے ذیل میں آتا ہے اور اس کے لیے محبانِ اقبال نے ان کے شکرگزار ہیں، اس موقعے پر انور حسین انور نے بھی اپنی کتاب کے محرکات و مراحل پر روشنی ڈالی دوسری کتاب ساحر اندوری کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جس کی رسم اجرا انجام پائی اور اس پر رشید انجم نے پرمغز پرچہ پڑھا جس میں صاحبِ کتاب کی شخصیت اور تخلیقات پر بھرپور نظر ڈالی گئی جب کہ ساحر اندرونی نے اپنی فکر و فن کا احاطہ کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی بیشتر کہانیوں ہم عصر بزرگوں کے سچے واقعات پر مبنی ہیں۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 28 اگست 2012

وفیات:

شہزاد احمد

لاہور: 35 کتب کے مصنف اردو دنیا کے معروف شاعر یکم اگست کو عارضۂ قلب کے سبب 80 سال کی عمر میں راہی عدم ہوگئے۔ بلاشبہ ان کا انتقال اردو کی ادبی دنیا کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ وہ اردو کے صاحبِ اسلوب تھے۔

انھوں نے شاعری میں نئے رجحانات کو متعارف کرایا۔ وہ 1932 میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ 35 کتب دنیائے ادب کو دے چکے ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ صدف جو غزلوں پر مشتمل تھا، 1958 میں شائع ہوا۔ احمد ندیم قاسمی کے بعد مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر تعینات رہے۔ آدمی جی ایوارڈ، اقبال ایوارڈ اور تمغہ حسن کارکردگی سے نوازے گئے۔

اردو سخن ڈاٹ کام

ہاجرہ مسرور

کراچی، لاہور: اردو کی ممتاز افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس ہاجرہ مسرور ہفتہ کو کراچی میں انتقال کرگئیں۔ ہاجرہ مسرور کو نماز جنازہ کے بعد کراچی ڈیفنس سوسائٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا ان کی عمر 82 برس تھی۔ وہ 17 جنوری 1930 میں لکھنؤ بھارت میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز بچپن سے ہی کر دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہاجرہ مسرور اور ان کی بہن نامور افسانہ نگار خدیجہ مستور نے پاکستان ہجرت کی اور لاہور میں رہائش اختیار کرلی۔ 1973 میں ہاجرہ مسرور کی شادی ممتاز صحافی احمد علی خان سے ہوئی جو 'ڈان' کے مدیر رہے۔ انھوں نے لواحقین میں 2 صاحبزادیاں سوگوار چھوڑی ہیں۔ ان کے شوہر احمد علی خان کا انتقال 27 مارچ 2007 کو ہوا۔ وہ 'نوائے وقت' کے کالم نگار خالد احمد کی ہمشیرہ تھیں۔ انھوں نے احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ادبی میگزین فنون میں بھی ادارت کی۔ ہاجرہ مسرور کے افسانوی مجموعے میں چاند کے دوسرے طرف، تیسری منزل، اندھیرے اجالے، چوری چھپے، ہائے اللہ، چرکے، وہ لوگ، شامل ہیں۔ وہ 7 افسانوی مجموعوں کی خالق تھیں۔ ہاجرہ مسرور کو ان کی بہترین افسانہ نگاری پر 1995 میں پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ دیا گیا جبکہ ان کی ڈرامہ نگاری پر انھیں نگار ایوارڈ دیا گیا۔ ہاجرہ مسرور کو عالمی فروغ اردو ادب تنظیم کی جانب سے عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ 2005 میں پیش کیا گیا۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں نسوانی حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ ہاجرہ مسرور کے انتقال پر ادبی حلقوں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'نوائے وقت' 7 ستمبر 2012

سید مصطفیٰ سراج

کولکاتہ: ممتاز بنگالی ادیب اور مشہور ناول نگار سید مصطفیٰ سراج کا طویل علالت کے بعد 4 ستمبر کو یہاں ایک پراؤیٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 82 برس کے تھے۔ ہر عہد کے قاریوں میں انتہائی مقبول مصطفیٰ سراج کو گردے کا دیرینہ عارضہ لاحق تھا۔ حالت بگڑنے پر انھیں پچھلے مہینے کی 30 تاریخ کو جنوبی کولکاتہ کے ایک اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ مرحوم کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کا کیریئر زائد از پانچ دہائیوں پر محیط ہے۔ 200 کتابوں کے مصنف مصطفیٰ سراج کی 'الیک مانش' جیسی تصنیفات کی مختلف اشاعتوں کے ساتھ دس ہزار سے زیادہ نسخے قارئین تک پہنچے۔ مصطفیٰ سراج کی موت کی خبر عام ہوتے ہی ادبی، ثقافتی اور تہذیبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ سید مصطفیٰ سراج کی پیدائش مرشد آباد ضلع کے خوش باس پور میں 1930 میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے شروعاتی دنوں میں ایک ڈرامہ گروپ 'آلکاپ' سے منسلک ہوگئے اور اس کے ساتھ مرشد آباد، مالدہ، بردوان، بیربھومی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا، انھوں نے کولکاتہ میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ اس دور میں وہ ساری رات اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے اور دن میں سوتے تھے۔ وہ فوک ڈانس اور ڈرامہ کے ٹیچر بھی تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 ستمبر 2012

عشرت امیر

ایٹہ: روزنامہ انقلاب ایٹہ کے نمائندے عشرت امیر کا 2 ستمبر 2012 کی صبح انتقال ہوگیا۔ وہ علی گڑھ میں زیر علاج تھے، ان کی تدفین ایٹہ میں عمل میں آئی۔ وہ 70 برس کے تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں اور بیوہ ہیں۔ ادارہ انقلاب ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ انتقال کی خبر ایٹہ میں پھیلتے ہی لوگ کافی تعداد میں ان کی رہائش پر جمع ہونے لگے اور بعد نماز عصر ان کو غمگین آنکھوں سے سپرد خاک کردیا۔ عشرت امیر کافی عرصہ سے صحافت کے پیشہ سے جڑے ہوئے تھے اور انقلاب اخبار نوئیڈا سے شروع ہونے سے قبل وہ فری لانس جرنلسٹ تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 ستمبر 2012

خراج عقیدت:

جگر مرادآبادی

مرادآباد: شہنشاہِ تغزل علی سکندر جگر مرادآبادی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ یہ مرادآباد کی خوش قسمتی ہے کہ

اس سرزمین پر اس عظیم شخصیت کا جنم ہوا۔ ان خیالات کا اظہار یہاں ڈیریا پر واقع راحت کدہ میں جگر مرادآبادی کی برسی کے سلسلے میں منعقدہ ایک جلسے میں کیا گیا جس کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر گوہر زادہ منظور عثمانی نے کی اور نظامت کے فرائض مشہور سیاسی رہنما اسد مولائی نے انجام دیے۔ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے عالمی شہرت شاعر گوہر زادہ منظور عثمانی نے کہا کہ جگر مرادآبادی کی علمی و ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں جس کے لیے ان کا نام رہتی دنیا تک سنہری حرف سے لکھا جائے گا۔ انھوں نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ مرادآباد سے گونڈہ تک جگر کے نام پر ٹرین چلائی جائے اس کے علاوہ انھوں نے کہا کہ ہماری برسوں پرانی مانگ ہے کہ مرادآباد جگر آڈیٹوریم تعمیر ہونا چاہیے مشہور سیاسی رہنما اسد مولائی نے اپنے والد راحت مولائی اور جگر مرادآبادی کے روابط کا ذکر کرتے ہوئے جگر کے نام سے ایک انٹر کالج یا ڈگری کھولنے کی مانگ کی۔ اس موقعے پر مسلم ڈگری کالج کالج کے نائب منیجر انور احمد لطیفی، ماہر تعلیم جے پال سنگھ ویست، ڈاکٹر محمد آصف وغیرہ نے بھی جگر کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 11 ستمبر 2012

پروفیسر ایم این فاروقی

علی گڑھ: علی مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ کی صدارت میں منعقدہ ایک تعزیتی میٹنگ میں یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ایم این فاروقی کے انتقال پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے ان کے لیے دعا کی گئی۔ وائس چانسلر جنرل شاہ نے کہا کہ پروفیسر ایم این فاروقی

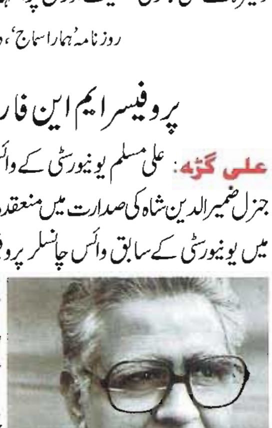

نے اس ادارے کو جدید تعلیم کا مرکز بنانے کے لیے پوری لگن سے کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مولانا آزاد لائبریری کے نایاب مخطوطوں کو محفوظ کرایا اور بڑی تعداد میں سلیکشن کمیٹیوں کے ذریعے اساتذہ کی ترقی کے لیے راستہ ہموار کیا۔ جنرل شاہ نے کہا کہ ان کے چھوٹے بھائی کھڑگ پور میں واقع آئی آئی ٹی میں پروفیسر فاروقی کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ پروفیسر فاروقی کو انتظامی امور کا گہرا تجربہ تھا۔ یونیورسٹی رجسٹرار گروپ کیپٹن شاہ رخ شمشاد نے تعزیتی قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر فاروقی کے دور میں اس ادارے کو ہر پہلو سے فروغ حاصل ہوا۔ وہ 15 اکتوبر 1990 سے 15 دسمبر 1994 تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ میکینکل انجینیرنگ شعبہ کے سربراہ اور سابق کنٹرولر پروفیسر ایس مہدی عباس رضوی نے پروفیسر فاروقی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے انتقال سے ہم نے ایک قابل تکنیکی ماہر اور ایک اچھے دوست کو کھودیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 اگست 2012

شفیق فاطمہ شعریٰ

(1)

پٹنہ: اردو کی معروف و مقبول شاعرہ شفیق فاطمہ شعریٰ کے انتقال پہ شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی میں ایک تعزیتی نشست زیر صدارت پروفیسر اشرف جہاں، صدر شعبۂ اردو منعقد ہوئی، جس میں اساتذہ، طلبہ اور حاضرین نے بلااتفاق فاطمہ شعریٰ کے انتقال کو معاصر اردو ادب کا ایک بڑا نقصان قرار دیا۔ پروفیسر اشرف جہاں نے کہا کہ اردو ادب پہ ان دنوں برا وقت آیا ہوا ہے کہ لگاتار اردو کے اہم شاعر اور ادیب ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ صلاح الدین پرویز، مظہر امام، شہریار، مغنی تبسم، ساجد رشید اور وہاب اشرفی جیسے لوگوں کے جانے کا غم ابھی تازہ تھا کہ شفیق فاطمہ شعریٰ بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ اردو کی ہم عصر شاعری میں ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید جلد پر نہ ہو سکے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ شفیق فاطمہ شعریٰ اپنے طرز کی واحد شاعرہ تھیں، جنھوں نے اردو شاعرات کے درمیان اپنے طرز اور اپنے رجحان کی وجہ سے شناخت قائم کی۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے شفیق فاطمہ شعریٰ کا تعارف پیش کرتے ہوئے سامعین کو بتایا کہ ان کی پیدائش 1930 میں ناگپور میں ہوئی تھی، اور وہ ایم اے اردو ڈگری یافتہ تھیں، مگر انھیں فارسی زبان پہ بھی دسترس حاصل تھی۔ 22 برس کی عمر سے انھوں نے شاعری شروع کردی تھی، ان کی پہلی نظم فصیل اورنگ آباد میں شائع ہوئی اور دو مجموعے بالترتیب آفاق نوا اور گلِ صفورہ کے نام سے 1988 اور 1990 میں شائع ہوئے۔ استعارہ سازی اور پیکر تراشی ان کے یہاں کثرت سے پائی جاتی ہے، مگر کلام میں کہیں کہیں ابہام بھی ملتا ہے۔ ان کی طویل نظم 'حضارۃ جدید' موضوع بحث رہی، بقول وہاب اشرفی حضارۃ جدید ہمیں ایک ایسی منزل پر لے جاتی ہے جو روحانیات کی منزل کہی جاسکتی ہے اور جس میں کشف و کرامات کی پرچھائیاں جہاں تہاں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر ایم عظیم اللہ نے بتایا کہ شفیق فاطمہ اگرچہ حیدرآباد میں رہ رہی تھیں، مگر صوبہ بہار سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے۔ ڈاکٹر قاسم خورشید نے کہا کہ شفیق شعریٰ ممتاز شاعرہ تھیں اور صبا، سوغات، شب خون، شاعر اور شعر و حکمت جیسے رسائل میں کثرت سے چھپتی تھیں۔ ان کے انتقال سے اردو کی نسائی شاعری کو بڑا نقصان ہوا ہے۔

پریس ریلیز، شہاب ظفر اعظمی، پٹنہ، 14 اگست 2012

(2)

حیدرآباد: معاشرہ میں ادبی سرگرمیوں کے فروغ و ترقی کے لیے اجتماعی جدوجہد کی اشد ضرورت ہے۔ اردو ادب کی خدمت کا جذبہ ہمارے اندر ختم ہوتا جارہا ہے۔ محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ نے بے لوث ادبی خدمات انجام دی جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان خیالات کا اظہار مہمان مقرر برصغیر کے شاعر و نقاد پروفیسر شمیم حنفی (دہلی) نے اپنے خطاب کے دوران کیا جس کا اہتمام حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) اور شاہین ویمنس ریسورس اینڈ ویلفیئر ایسوسی ایشن نے اردو ہال حمایت نگر میں کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر انور معظم (سابق صدر اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی) نے کہا کہ محترمہ شفیق فاطمہ عربی و فارسی عروس کی ماہر تھیں، ان کا سماجی و تاریخی شعور بہت بلند تھا۔ پدم شری جیلانی بانو نے کہا کہ محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ نے عشق و محبت کے ساتھ ساتھ آس پاس کے ماحول پر بھی بڑی گہری نظر رکھی۔ اس تعزیتی جلسے میں مضطر مجاز، مصحف اقبال توصیفی، پروفیسر بیگ احساس، جمیلہ نشاط، علی ظہیر اور شفیق فاطمہ کی ہمشیرہ ڈاکٹر ذکیہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، یکم ستمبر 2012

ڈاکٹر انجم جمالی

میرٹھ: مشہور شاعر ادیب اور صحافی انجم جمالی کے یوم وفات کے موقعے پر یہاں وکاس پوری میں واقع جمالی اکادمی میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس کا آغاز آصف کی نعت پاک سے ہوا۔ ڈاکٹر رچنا نے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر جمالی نے تمام زندگی اردو کی خدمت کی اور میرٹھ میں خاص کر شعری محفلوں کے ذریعے اردو کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ مہمان خصوصی اور ڈاکٹر اگروال نے ڈاکٹر جمالی کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے کنوینر انجینئر رفعت جمالی نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ پروگرام میں نازش جمالی، دانش، محترمہ کامنی، سید عبدالاحد، ڈاکٹر ارشد اور اے جے اکادمی کی پرنسپل وغیرہ خاص طور پر موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اگست 2012